فہرست مضامین مجولی بابتہ ماہ شہریور ۱۳۴۰ف مطابق جولائی ۱۹۳۱ء

جلد (۱)	ترتیب: سیدہ بیگم خویشگی - فتح میدان حیدرآباد دکن	نمبر (۱)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آغاز

لیجئے! آج آپ کا "ہجولی" بھی آگیا جس کا آپ کو کئی ماہ سے سخت انتظار تھا اُمید ہے کہ اسے غور اور توجہ سے پڑھا جائے گا۔ ہماری کوشش اور محنت کا چونکہ یہ نقش اوّلین ہے نیز اس کے صفحات کی وسعت بھی محدود ہے لہٰذا اس پہلے ہی نمبر میں تفصیل سے یہ بتانا مشکل ہے کہ ہمیں اس ماہ نامے کو کن لائنوں پر چلانا مقصود ہے اور آیندہ اس میں آپ کی دلچسپیوں کے لئے کیا کیا اضافے کئے جانے والے ہیں۔

بعض حضرات کا یہ فرمانا کہ موجودہ رسائل کی روش سے ہٹ کر ہمیں اس پرچے کو چلانا چاہئے ایک حد تک درست کہا جا سکتا ہے اور یہ امر ممکن بھی ہے مگر سردست یہ بنیادی تبدیلی یک لخت مطلوب نہیں شاید یہ ان طبایع پر بار گذرے جو موجودہ روش کے عادی ہو چکے ہیں اور ہمیں اپنے مشن میں کامیابی نہ ہو۔ البتہ اس کے لئے کچھ مہلت ضروری ہے جوں جوں زمانہ گذرے گا اور یکے بعد دیگرے "ہجولی" کے مختلف نمبر آپ کے پیش نظر ہوتے رہینگے ارتقائی نقطۂ نظر سے آپ خود اندازہ فرمائیں گے کہ ہجولی کی یہ تدریجی رفتار کس طرف کو مائل ہے اور اگر اس دوران میں تبادلۂ خیالات کے ذریعے ہمیں آپ کی طبیعت کے رجحان کا اندازہ ہوتا رہا تو آپ کے ذوق اور اپنے مذاق کی آمیزش سے "ہجولی" میں بہ آسانی ایسی تبدیلیاں پیدا کی جا سکیں گی جو عام طور پر خوشگوار کہی جا سکتی ہیں۔

ہجولی کے شائع ہونے کے بعد طبعاً جو سب سے پہلا سوال ہو سکتا ہے

وہ یہ ہوگا کہ:

ہمجولی کیسا رہا؟

اس کا جواب آپ خود دیکھتے ہیں یا رائے عامہ دیگی مگر وہ جو کچھ بھی ہوگا ہمارے لئے یقیناً دلچسپ ہوگا کیونکہ ہمیں اسی کے مطابق اپنے دائرہ عمل کو وسعت دینی منظور ہے بہرحال جواب موافق ہو یا ناموافق ہماری کوششوں میں انشاء اللہ اضمحلال پیدا نہ ہوگا اور جو مقاصد ہمارے پیش نظر ہیں اور جن تعمیری کاموں کی داغ بیل آج ہم ڈال رہے ہیں اگر فضل خدا شامل حال رہا تو انھیں حتی المقدور پورا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ہمجولی رہے یا نہ رہے۔ یہ امر خارج از بحث ہے۔ لیکن اس کی اٹھائی ہوئی بنیادیں ہی اگر قائم رہیں تب بھی ہم اس کو اپنی کامیابی ہی تصور کریں گے کیونکہ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب کہ ان ہی بنیادوں پر قومی ترقی کی عظیم الشان عمارت کھڑی کی جانے والی ہے اور یہی :

ہمجولی کی زندگی کا مقصد

ہے۔ اس کی مزید وضاحت کے لئے غالباً سرورق کی اس تشریحی عبارت کا اعادہ کافی ہوگا کہ یہ ماہ نامہ اپنے نونہالوں اور نوجوانوں کی ہر جہتی فلاح و ترقی کے لئے جاری کیا جا رہا ہے؛ اگرچہ کہ اس وقت اور بھی بہت سے رسالے اس مقصد کے تحت بفضل خدا جاری ہیں جن سے نئی پود بالراست فائدہ اٹھا رہی ہے لیکن ایسا کوئی رسالہ نظر نہیں آتا جس سے بالواسطہ انھیں فائدہ اٹھانے کا کوئی موقعہ ملے چنانچہ اسی ضرورت کے مد نظر ہم نے "ہمجولی" کو ...ری کیا ہے تاکہ جہاں نئی پود خود اس کے مضامین سے فائدہ حاصل کر سکے اس میں بہت سے مضامین ایسے ...ی ہوں گے جو ان کے والدین اور اُستادوں کے لئے مختص ہوں گے جن سے بالواسطہ فائدہ بچوں ہی کو پہنچے گا۔

چنانچہ "چونچال بچے" کے عنوان کے تحت ہماری ایک تحریک اس پرچے میں موجود ہے جو والدین اور استادوں کے لئے مخصوص ہے مگر فائدہ اس سے بچے ہی اٹھائینگے۔ دوسرا ایک نہایت ہی دلچسپ مضمون آپ کو "**لاڈلے پوت**" کے عنوان سے ملے گا جسے مرزا عبدالمجید بیگ صاحب دہلوی نے انتہائی قابلیت سے سپرد قلم فرمایا ہے گو اس کا روئے سخن والدین سے ہے اور بظاہر والدین ہی کے اعمال زیر بحث لاکر ان کی

اصلاح چاہی گئی ہے مگر فائدہ بالواسطہ بچّوں ہی کو پہنچتا ہے۔ مرزا صاحب موصوف نے ایک اور لاجواب مضمون "ہمجولی" کے لئے تحریر فرمایا ہے جو اگلے پرچے میں ملیگا۔ اس میں ان استادوں کا کچا چٹھا بیان کیا گیا ہے جو اپنے شاگردوں کو سنگ و خشت سے بڑھکر وقعت نہیں دیتے اگر اس کی اصلاح ہوگئی تو وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے نظامِ تعلیمی میں ایک ایسا انقلاب پیدا ہو جائے گا جو ہمارے نونہالوں کی زندگی کو پر بہار بنادے گا۔

اسی ضمن میں ہم ان چند انشا پردازوں کے مضامین کا بھی کچھ ذکر کردینا چاہتے ہیں جنھوں نے از راہِ تلطف "ہمجولی" کی قلمی اعانت فرماکر ابتدا ہی سے اس کو اپنے ہم چشموں میں ایک ایسی وقیع جگہ دیدی ہے جسے بہر حال ممتاز کہا جاسکتا ہے اُمید ہے کہ ملک کے دیگر انشا پرداز بھی اس طرف توجہ فرمائیں گے اور صرف ایسے مضامین بھیج کر ممنونیت کا موقعہ دینگے جو لفظی ٹیپ ٹاپ یا بے نتیجہ خیال آرائیوں سے پاک و صاف ہوں کیونکہ اس "ادب لطیف" نے ان طبائع کی مٹی پلید کردی ہے جو اپنی سطح سے ابھر کر بہت کچھ جولانیاں دکھا سکتی تھیں۔ یہ وہ وقت ہے جب کہ زندگی کے ہر شعبے میں مادی فواید کی تلاش جاری ہے تو پھر اس رسالہ جاتی زندگی سے کیوں فائدہ حاصل نہ کیا جائے جسے ابتک صرف تفریح طبع کا ذریعہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ ملک نے اگر اس طرف ذرا بھی توجہ کی تو اس سے نہ صرف رسائل کی حالت سنبھل جائیگی بلکہ یہی رسائل اور ماہ نامے ہزاروں ایسی زندگیوں کو بھی سنبھال سکیں گے جو آج جہالت کی تاریکی میں بے یار و مددگار دم توڑ رہی ہیں۔

ملک کی مشہور انشا پرداز خاتون محترمہ امتہ الحمید خانم صاحبہ کا ایک نہایت عمدہ اصلاحی مضمون "ہمجولی" میں درج ہے اُمید ہے کہ سر برآوردہ حضرات قوم کی اس بنیادی اصلاح پر جلد توجہ فرماکر اس کی مستقل اور پائیدار بہتری کے سامان بہم پہنچانے میں پہلو تہی نہ فرمائیں گے۔

کیا لکھیں؟ یہ ایک نہایت ہی مفید اور دلچسپ مضمون ہے جو ملک کے ہونہار اور قابل ادیب ڈاکٹر سید محیّ الدین قادری کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے اس میں آپ نے رُکی ہوئی طبایع کی روانی کے لئے جو سبیلیں پیدا کی ہیں اگر ان سے حسبِ دلخواہ طریقے پر کام لیا جائے تو وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ ہماری ادبی کائنات لہلہا اُٹھیگی اُمید ہے کہ اسے مدیر اور انشا پرداز حضرات نے اگر غور سے پڑھا تو پھر دونوں کو مضامین کی "آمد" کی شکایت باقی نہ رہیگی۔

ملک کے مایۂ ناز انشا پرداز اور ہمارے مکرم مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی کا ایک تازہ مضمون بعنوان "**وہی ایک ہزار روپے والی بات**" درج ہمجولی ہے جس میں آپ نے اپنے مخصوص اور شہرہ آفاق طرز نگارش میں بڑی خوبی سے یہ حقیقت ظاہر کی ہے کہ اگر ہلدی کی گرہ کسی کے ہاتھ لگ جائے تو وہ پنساری نہیں بن سکتا اس شہکار کی سجاوٹ عبدالقیوم صاحب نے اپنے موقلم سے کی ہے جو ملک کے ایک نہایت کامیاب آرٹسٹ ہیں۔

نظموں میں حضرت جلیل مدظلہ العالی کی "**حمد**" اس قدر پاکیزہ وارفع ہے جسے بے اختیار آنکھوں سے لگا لینے کو جی چاہتا ہے۔ حضرت ممدوح کی جو بزرگانہ شفقتیں قدیم سے ہمارے حال پر مبذول رہی ہیں امید ہے کہ اب بقدر حصّہ رسدی "ہمجولی" کو بھی ان سے استفادے کا موقع بخشا جائے گا۔

حضرت جوش ملیح آبادی اور حضرت خنجر لکھنوی کی سبق آموز اور نتیجہ خیز نظمیں بھی ادبی محاسن و کمالات کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

غرض برسبیل تذکرہ اس محدود جگہ میں جن ضروری و اہم مضامین اور نظموں کا حوالہ دیا گیا ہے ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ "ہمجولی" کی ترتیب میں جہاں بچوں کے حسب مطلب مضامین کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے وہاں ان کے والدین یا استادوں کے مفید مطلب مقالات کے اندراج کا بھی ضمنی طور پر التزام ہے تاکہ بیک کرشمہ دو کار کے مصداق ہر گروہ "ہمجولی" کے مطالعے سے بقدر لب و دنداں بہرحال فائدہ حاصل کر سکے۔

وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ

ہمیں اپنی گوناگوں مصروفیات کے سبب تمام موصولہ کتابوں، رسائل، اخبارات، نیز دیگر استعمالی اشیاء پر تنقید کرنے کا تا حال موقع نہ مل سکا جس کا دلی افسوس ہے انشاء اللہ اگلے پرچے سے اس اہم فریضے کی ادائی کا باقاعدہ انتظام رہے گا۔ اس کے ساتھ ہی اپنے مندرجہ ذیل معاصرین کا بھی دلی شکریہ ادا کیا جاتا ہے جنھوں نے ازراہِ تلطف "ہمجولی" کی نشر و اشاعت میں ہماری بیش قیمت امداد کی ہے۔

رہبر دکن (حیدرآباد)۔ انقلاب (لاہور)۔ عالمگیر (لاہور)۔ تازیانہ ریویو و نیرنگ خیال (لاہور)۔ ساقی (دہلی)۔ خیالستان (لاہور)۔ سہیلی (امرتسر)۔ نئی روشنی (دہلی)۔ طبیب روحانی (لاہور)۔ وغیرہ وغیرہ۔ اُمید ہے کہ اگر دیگر معاصرین نے بھی اس کے متعلق کچھ تحریر فرمایا ہو تو اس سے ہمیں مطلع فرمایا جائے گا تاکہ آیندہ ہمیں بھی ان کے متعلق

کچھ لکھنے کا موقع مل سکے۔

میں اپنی عزیز بھانجی خدیجہ بیگم خوشگی کو اس موقع پر نہیں بھول سکتی جن کی پیہم کوششوں اور تقاضوں نے آخر "ہمجولی" کو جاری کرا ہی چھوڑا لیکن انھیں یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ وہ اب اپنے فرائض سے سبکدوش ہو چکیں ان کے کام کے لئے تو حقیقی میدان اب قائم ہوا ہے دیکھیں وہ "ہمجولی" کے لئے کیا کام انجام دیتی ہیں ایسی ہی کچھ امیدیں مجھے اپنی عزیز بہن زاہدہ بیگم سے بھی ہیں خدا کرے کہ وہ جلد پوری ہوں۔ مجھے سب سے زیادہ بیگم فیاض الحسن صاحب کا شکریہ ادا کرنا ہے جن کی انتہائی اور بے لوث کوششوں نے میری ہمتوں کو بلند کر دیا ہے۔ مسز ج۔ نقوی صاحبہ بھی شکریہ کی مستحق ہیں جو "ہمجولی" کو کامیاب بنانے کے لئے ہر طرح کوشاں ہیں۔

میں ان حضرات کے اسمائے گرامی بطور شکریہ اس جگہ درج کرنے میں انتہائی مسرت محسوس کرتی ہوں جنھوں نے ابتدا سے "ہمجولی" کو کامیاب بنانے میں سرگرمی اور ایثار سے کام لیا ہے۔ وَھُوَ ھٰذَا :-

مسٹر خوشگی۔ مسٹر عصمت اللہ بیگ دہلوی۔ مسٹر عزیز احمد بی۔اے۔ مسٹر مختار عابدی بی اے۔ مسٹر مسعود علی بی اے، ایل ایل۔ بی (علیگ)۔ مسٹر حبیب احمد صدیقی بی۔اے (علیگ)۔ نواب علی محمد خاں بہادر ایم اے ایل ایل۔ بی، ایم آر۔اے۔ ایس (لندن)۔ مسٹر محمد مظہر اللہ صدیقی۔ مسٹر وزیر حسن دہلوی۔ مسٹر سلیم بیگ دہلوی۔ صاحبزادہ عبدالستار بیگ تیموری بی اے، ایم۔آر۔اے۔ایس (لندن)۔ مسٹر ابو تمیم فرید آبادی۔ مسٹر عبدالستار ایم اے، ایم۔آر اے۔ ایس (لندن)۔ پروفیسر سید سجاد ایم۔اے (مقیم جرمنی)۔ مسٹر عبدالرزاق سنبھلی۔ مسٹر سمیع احمد۔ مسٹر [illegible] دہلوی۔ مسٹر شبیر حسین قیس۔

ہمارے ملک کے ہر دلعزیز سابق ناظم تعلیمات نواب مسعود جنگ بہادر جو اب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں حال ہی میں حیدرآباد تشریف لائے تھے اور یہاں مختصر قیام فرمانے کے بعد گزشتہ ہفتے واپس تشریف لے گئے ہیں آپ کی آمد پرائیوٹ تھی جس کا مدعا دیرینہ ہمدموں کی ملاقات تھا مگر آپ نے اس قلیل مدت کو صرف ملاقاتوں اور بازدید ملاقاتوں ہی میں بسر نہیں کیا بلکہ مسلم یونیورسٹی کے مالئے میں کئی ہزار روپے کا اضافہ بھی فرما لیا امید ہے کہ اگر اس آمد و رفت کا سلسلہ یوں ہی متواتر جاری رہا تو یہاں سے بہت معقول رقم فراہم ہو جائے گی۔

عہدہ نظامت تعلیمی کی سبکدوشی کے بعد جب نواب صاحب ممدوح یہاں پہلی بار تشریف لائے تھے تو

گو "ہمجولی" موجود نہ تھا مگر اس کی ٹولی میں یہ گرم بحث جاری تھی کہ ہم اپنے عزیز مہمان کی شایانِ شان مدارات کے لئے کیا تدابیر اختیار کریں چنانچہ ہمارے ایک کارکن کی تحریک اور ایک "شیر" خدا کی تائید سے یہ تجویز بغلبہ آرا منظور کرلی گئی کہ ہماری حقیقی میزبانی کی ابتدا ایک کروڑ روپے کی فراہمی سے ہونی چاہئے۔ مرحوم عبدالسلام بھی اس وقت موجود تھے اور اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ دوسرے ہی روز "ورودِ مسعود" کے سلسلے میں ایک کروڑ روپے والی اپیل کا بھی گھر گھر چرچا ہوگیا۔

"وہی ایک کروڑ روپے والی بات" آج بھی سُنی جارہی ہے اور ہم خوش ہیں کہ ہمارے کارکن کی بلند کی ہوئی یہ آواز "صدا الصحرا" ثابت نہ ہوئی اور اب خود نواب مسعود جنگ بہادر بہ نفس نفیس اس مہم کو سر کرنے کی ٹھان چکے ہیں۔ خدا سے دعا ہے کہ یہ تحریک جلد کامیاب ہو تاکہ نواب صاحب ممدوح کو اپنی پیش نظر اصلاحوں کے جاری کرنے کا جلد از جلد موقع مل سکے۔

نواب مسعود جنگ بہادر کی زندگی کا پہلا تابناک دور وہ کہلایا جاسکتا ہے جب کہ آپ نے اُردو کے محسنِ اعظم سر اکبر حیدری نواب حیدر نواز جنگ بہادر کے رفیق کار کی حیثیت سے "دورِ عثمانی" کو تاریخ میں ایک امتیازی جگہ دینے کی ایسی سرگرم کوششیں اور تدابیر عمل میں لائی تھیں جن کے تفصیلی اعادے کی اس مختصر نوٹ میں گنجائش نہیں۔ البتہ آپ کے کارناموں پر ایک سرسری نظر ڈال کر کہا جاسکتا ہے کہ آپ نے ہر علمی اور ادبی کام میں نہایت کشادہ دلی اور خلوص سے حصّہ لیکر یہاں کے تعلیمی شعبوں میں ایک نئی رُوح پھونک دی تھی چنانچہ جامعۂ عثمانیہ، دارالترجمہ، دائرۃ المعارف، انجمن ترقی اُردو نیز دیگر ادارے آپ کی گرانبہا مدد کے ہمیشہ ممنون رہیں گے۔

آپ کی زندگی کا دوسرا درخشندہ اور عہد آفریں دور اُس وقت سے شروع ہوتا ہے جبکہ آپ نے عملی طور پر مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری کی باگیں اپنے ہاتھ میں لے کر اس کی اصلاحات کی ترویج شروع کی۔ یہ وہ نازک وقت تھا جبکہ مسلمانوں کی اس عظیم الشان تعلیمی درسگاہ کا شیرازہ بالکل پراگندہ ہوچکا تھا ہر طرف ابتری پھیلی ہوئی تھی اور خستہ حالی کا دور دورہ تھا مگر آپ کے وہاں پہنچتے ہی ہر طرف تازگی و شادابی چھاگئی۔ آپ نے رحمت اللہ کمیٹی کی سفارشات کو یکے بعد دیگرے عمل میں لانا شروع کردیا۔ ہر روز کی ریشہ دوانیوں اور مضر

عناصر سے یونیورسٹی کو پاک وصاف کیا گیا۔ بین الاقوامی شہرت رکھنے والے پروفیسروں کی خدمات حاصل کی گئیں اور الحمد للہ کہ آج مسلم یونیورسٹی ہر طرح مامون و محفوظ ہو کر اپنے لائق نائب امیر جامعہ کی سرکردگی میں نہایت کامیاب طریقوں پر کام کر رہی ہے۔

ضروریات زمانے کا لحاظ کرتے ہوئے اب نواب مسعود جنگ بہادر نے جس خاص تعلیمی شعبے کی طرف اپنی توجہ مبذول کی ہے وہ شعبۂ سائنس ہے امید ہے کہ آپ کی سب سے زیادہ توجہات صرف اس اہم شعبے کی طرف مائل رہیں گی جو ترقی کی جان کہا جا سکتا ہے۔ اس باب میں تو اب صاحب ممدوح سے ہماری بہت کچھ توقعات وابستہ ہیں اور اگر یہ کماحقہٗ پوری ہوگئیں تو وہ دن دور نہیں جبکہ قوم بہت جلد آپ کو **سرسید ثانی** کے لقب سے یاد کرے گی۔ خدا سے دعا ہے کہ آپ کو اپنے جملہ مقاصد میں کامیابی ہو اور آپ کی زندگی میں بہت سے ایسے تاباں و درخشندہ دور آئیں جن کی بدولت آپ کا نام نامی آئندہ نسلوں میں ہمیشہ شکر گذاری اور احسان مندی کے ساتھ یاد کیا جائے۔

اگلے نمبر میں انشاء اللہ حضرت اقدس و اعلیٰ کی ایک بہت اور بے نظیر سہ رنگی تصویر ہدیۂ ناظرین کی جائے گی جو بصرف زر کثیر ٹائمز آف انڈیا کے مشہور مطبع میں خاص طور پر طبع ہو رہی ہے اور بروقت وصول نہ ہونے کے باعث اس نمبر میں نہ آسکی۔ یہ پورے صفحے کی دلکش تصویر اس سج دھج اور رنگ روپ میں ملک کے سامنے آج تک کبھی پیش نہیں کی گئی اور یہ ہماری اسکیم کی ان مختلف شاندار تصویروں میں سب سے پہلی تصویر ہے جنھیں ہم وقتاً فوقتاً ملک کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ امید ہے کہ اس لاجواب تحفے کا خاص طور پر انتظار کیا جائے گا تاکہ اسے آئینۂ دل میں جگہ دیکر اپنے خلوص اور وفاشعاری کا اظہار کیا جا سکے۔ فقط



استاذ السلطان جلیل القدر جناب نواب فصاحت جنگ بہادر حضرت جلیل مدظلہ

منہ میں گویا ہے زباں حمدِ الٰہی کیلئے
دل سپاسِ کرمِ نامتناہی کیلئے

حق تو یہ ہے کہ دو عالم کا ہے ذرہ ذرہ
وحدت و قدرت و حکمت پہ گواہی کیلئے

در پہ اُس قادرِ بیچوں کے گدا کا سر کیا
وہ بھی جھکتا ہے جو ہے افسرِ شاہی کیلئے

سلطنت اُسکی ہے۔ ملک اُسکا ہے فرماں اُسکا
مختصر یہ کہ خدائی ہے خدا ہی کیلئے

حشر ہنگامہ اُٹھاتا ہے اُٹھائے کیا خوف
رحمتِ حق ہے یہاں پشت پناہی کیلئے

آگ میں زندہ سمندر کو وہی رکھتا ہے
آب میں رزق رساں ہے وہی ماہی کیلئے

مرہمِ زخم وہی خستہ دلوں کے حق میں
مشعلِ راہ وہی رہروِ راہی کیلئے

یادِ حق باعثِ آبادی و شادابی ہے
دل جو غافل ہے وہ مسکن ہے تباہی کیلئے

خرقہ کس کام کا جبتک نہ ہو درویش جلیل
جامۂ حرب تو زیبا ہے سپاہی کیلئے

خدایا!

تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے مجھے دنیا میں بھیجکر دین اسلام کی نعمت سے سرفراز کیا عقل و شعور عطا فرمایا علم و عمل کی توفیق دی۔ محبت اور ہمدردی جیسی صفتیں بخشیں اطاعت و فرماں برداری کے طریقے سکھائے تیری ان لاانتہا عنایتوں اور حد سے بڑھی ہوئی مہربانیوں کا میں صدق دل اور صدق نیت سے شکر ادا کرتی ہوں۔ اس دنیا میں مجھے اب کسی چیز کی خواہش نہیں۔ دولت کی آرزو ہے نہ شہرت کی تمنّا۔ اعزاز کی طالب ہوں نہ رزق کا سوال کرنا چاہتی ہوں۔ ان چیزوں سے تیری قدرت کے خزانے معمور ہیں اور ان کے حصول کے طریقے تو نے بتا دیئے ہیں پھر اب ایسی کونسی چیز ہے جسکی میں تمنا کروں اور تجھ سے مانگوں:

اے کریم! بس اس وقت ایک چیز مانگتی ہوں اور وہ **ہمجولی** کے لئے دعائے کامیابی ہے خدایا! تو اسکی تحریروں میں وہ اثر دے کہ بجھے ہوئے دلوں میں امنگ پیدا ہو جائے اور اس دور نکبت میں اسلامی ہند پر جو سکون و جمود طاری ہے وہ کافور ہو جائے۔ ماضی جس طرح گذرا گذر گیا۔ مستقبل کی شوکت کا اعتبار کیا ہاں اس موجودہ زمانے کو اے میرے پروردگار پسندیدہ بنا دے اس طرح کہ قوم کے نونہالوں کو اپنی موجودہ پسماندگی کا احساس ہو جائے۔ ان ہی کے جوش عمل پر اب آیندہ کی ترقی کا انحصار ہے۔ مستقبل کی درخشانی ان ہی کے دامن سے وابستہ ہے۔ خدایا! ہمجولی کے اجراء سے نئی پود میں جوشش بہار پیدا کر دے۔ اس کے کارپردازوں کو ہمت و استقلال عطا فرما ان کے جذبۂ ایثار کو توانائی بخش اور ہمیں استطاعت دے کہ اس ضروری اور اہم مقصد میں ان کی اعانت کرسکیں۔

از بندہ خضوع و التجا می زیبد — بخشایش بندہ از خدا می زیبد
گر من نہ کنم آں کہ مرا آں زیباست — تو کن ہمہ آں کہ آں ترا می زیبد

بنت ڈاکٹر عبد الرب (گلبرگہ)

رام دین

جناب حسن اصغر صاحب

رام دین میرے باغ کا مالی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ مر چکا مگر نہیں وہ زندہ ہے۔ ممکن ہے دوسروں کے نزدیک وہ مُردہ ہو لیکن میں کیسے یقین مانوں جب میری آنکھیں اسے روزانہ دیکھتی ہیں، میرے کان اُس کی آواز سنتے ہیں، میرا دل اُس کے وجود کو محسوس کرتا ہے اور میری زبان اس سے گفتگو کرتی ہے۔

— ۲ —

سر شام میں اپنے باغ کے حوض کے کنارے جا بیٹھتا ہوں۔ حوض کا صاف شفاف پانی ہلکی ہلکی لہریں لیتا ہے۔ اُس کا فوارہ اپنی گہرپاشیوں میں مشغول رہتا ہے۔ ہوا کے نرم نرم جھونکے اس چادر آبی سے گزر کر مجھ تک اور اس کے بعد میری روح تک پہنچتے ہیں۔ مجھ پر وہ کیفیات طاری ہو جاتی ہیں جن میں انسان خود کو اس عالم سے بالاتر ماحول میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ اُس وقت مجھے رام دین حوض کے کنارے بیٹھا ہوا نظر آتا ہے مگر اس جسم خاکی میں نہیں بلکہ ایک ایسی لطیف شکل میں جس کا محسوس کرنا آسان ہے اور بیان کرنا مشکل۔ کچھ دیر تک وہ یوں ہی خاموش بیٹھا رہتا ہے۔ پھر اُٹھ کر فوارے کے ارد گرد چکر لگا کر رفتہ رفتہ خود کو اس چادر آبی میں تحلیل کر دیتا ہے۔ یکایک فوارے کا زور بڑھ جاتا ہے اور آن کی آن میں حوض چھلکنے لگتا ہے میں بے اختیار چیخ اُٹھتا ہوں "رام دین سچ بتا یہ کیا معمہ ہے، تو نے یہ قدرت کہاں سے پائی؟ فوارے کا زور کیسے بڑھا؟ حوض کیوں لبریز ہوا؟" گہرپاش فوارے کے ترنم میں ایک ہلکی سی آواز پیدا ہوتی ہے۔ میں پہچان لیتا ہوں یہ آواز رام دین کی ہے۔

"فوارے کی زندگی یہ ہے کہ وہ حوض کو لبریز رکھے
تاکہ باغ کے پودے ہرے بھرے رہیں۔ ان میں
ترو تازہ پھول پیدا ہوں۔ اور وہ سونگھنے والوں
کا دماغ معطر کردیں۔"

آواز غائب ہو جاتی ہے۔ مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا میں اس سے مطمئن نہیں ہوتا۔ اس کے سمجھنے کی ناکام کوشش کرتا ہوں۔ آخر دماغ تھک جاتا ہے اور میں اٹھ کر اپنی قیام گاہ واپس آجانا چاہتا ہوں مگر اس اثناء میں چاند نکل آتا ہے۔ اس کی شفاف اور پرسکون چاندنی پورے باغ کو نورانی بنا چکی ہوتی ہے۔ چاند کی چاندنی اور باغ کا سکوت مجھے آگے بڑھنے سے مجبور کر دیتے ہیں اور میں نزدیک ہی کے سبزہ پوش چمن میں لیٹ جاتا ہوں چاند اپنی نقرئی چادر مجھے اڑھا دیتا ہے اور چاندنی رفتہ رفتہ میرے دل میں پیوست ہوتی معلوم ہوتی ہے۔ بیخودی مجھ پر چھا جاتی ہے اور میں چاند میں کھو جاتا ہوں۔ اب مجھے چاند کے قرب و جوار میں چند ننھے فرشتے اڑتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ جن میں سے ایک فرشتہ خاص طور پر چاند کے قریب آجاتا ہے اور اسے اپنے پروں سے اس طرح گھیر لیتا ہے کہ اس کی بکھری ہوئی شعاعیں یکجا جمع ہو جاتی ہیں اور سطح عاکس سے میرے باغ پر نور برسنے لگتا ہے۔ اب ہر طرف اندھیرا نظر آتا ہے۔ مگر میرا باغ بقعۂ نور بن جاتا ہے۔ میں نظرِ تشکر سے اس فرشتے کی طرف دیکھتا ہوں۔ مگر نہ جانے کیوں اچھل پڑتا ہوں۔ یہ رام دین فرشتے کی صورت میں ہوتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس سے گفتگو کروں۔ مگر فطرت کا خاموش اور پر رعب منظر اس کی اجازت نہیں دیتا!

(۳)

صبح اٹھ کر میں روزانہ باغ میں ٹہلتا ہوں اور میری عادت ہے کہ جبتک روش روش نہیں پھر لیتا، پھولوں کے ایک ایک درخت کو دل بھر کر نہیں دیکھ لیتا میری طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ مگر جس درخت کے پاس جاتا ہوں، جس پھول کو چھوتا ہوں اس میں رام دین نظر آتا ہے۔ کلیاں کھلتی ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ رام دین مسکرا رہا ہے۔ پتے ہلتے ہیں تو رام دین کے ہنسنے کی آواز آتی ہے۔ سبزہ پوش چمن میں چلتا ہوں اور جب نرم نرم دوب میرے پیروں سے دبتی ہے تو اس میں ایک ترنم پیدا ہوتا ہے۔ یہ آواز رام دین کی ہوتی ہے اور جب میں تھک کر ایک طرف چمن میں بیٹھ جاتا ہوں تاکہ طیورانِ چمن کی نغمہ سنجیوں سے دل بہلاؤں تو اسوقت بھی ان کے نغموں سے رام دین کے میٹھے میٹھے راگوں کی آواز آتی ہے جو وہ روزانہ صبح کے وقت درختوں کو سینچتے وقت گایا کرتا تھا۔ رام دین کے اس تصرفِ عمیم سے

میں گھبرا اٹھتا ہوں اور جھنجھلا کر پوچھتا ہوں "رام دین آخر تو نے فطرت کی اس خوش نوا اور آزاد مخلوق پر کیسے قبضہ پایا۔ کیونکہ تو باغ کا مالی تھا ممکن ہے اس بے زبان مخلوق نے تجھے قدرت کے کچھ راز بتائے ہوں۔ مگر یہ ممکن نہیں کیونکہ جب میں ان سے کچھ پوچھتا ہوں تو یہ مجھے کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ اب باغ میں نغموں کی ایک ہلکی آواز پیدا ہوتی ہے۔ ایسی آواز جو صرف اس وقت سنائی دیتی ہے جب انسان خود فراموش ہو جاتا ہے۔ میں غور سے سنتا ہوں:۔

"تجھے تعجب ہے کہ میں نے اس آزاد مخلوق کو کیسے مسحور کیا۔ تجھے خواہش ہے کہ تو ان رازوں سے واقف ہو جائے جو میں ان طیور کی زبانی سن چکا ہوں۔ سن اور غور سے سن! میں نے ہی یہ باغ لگایا۔ میں نے ہی یہ روشیں بنائیں۔ یہ چمن بندیاں میری ہی محنت کا نتیجہ ہیں یہ پھولوں کے تختے میرے ہی سجائے ہوئے ہیں۔ اپنی زندگی کے پچاس برس میں نے ان پر قربان کر دیئے۔ نہ دن کو دن جانا اور نہ رات کو رات۔ میری یہی آرزو رہتی تھی کہ اس باغ کو زیادہ سے زیادہ شگفتہ اور شاداب دیکھوں۔ میں نے اس کا پودا پودا خون دل سے سینچا تاکہ ایسے خوشبودار پھول پیدا کروں جو سونگھنے والوں کا دماغ معطر کر دیں۔ تتلیاں ہوا میں کھیلتی ہوئی آئیں ان کا رس چوسیں اور شاد کام ہو کر اڑ جائیں۔ شہد کی مکھیاں ان سے انگبیں حاصل کریں اور وہ دنیا کے کام آئے میری یہی کوشش تھی کہ یہ چھلکتا ہوا فوارہ حوض کو ہمیشہ لبریز رکھے تاکہ میرے لگائے ہوئے پودے مرجھا نہ جائیں اور خوش نوا پرند اپنی پیاس بجھا سکیں میرے شوقِ آرایش کے وفور کی انتہا نہ تھی میں دنیا کی ہر اس چیز کے لئے جس میں میرے باغ کی زیبایش و نمود کی تکمیل ہو بیتاب رہا کرتا تھا۔ چودھویں کا چاند دیکھ کر ہمیشہ میرا دل بے اختیار چاہا کرتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح اسے آسمان سے اٹھا کر اس باغ میں لا رکھوں تاکہ اس سے سرمدی نور حاصل ہو اور میرا باغ ہمیشہ نورانی بنا رہے غرض اس وارفتگی میں میں نے خود کو مٹا کر اس باغ کو زندہ کیا اور آج باغ کا پودا پودا زندہ ہو کر مجسم حیات جاودانی بخش رہا ہے بس یہی زندگی کا راز ہے اور یہی فطرت کا بھید ہے۔

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما"

آواز خاموش ہو جاتی ہے اور وہ باتیں جن کے سمجھنے کیلئے

ہیں گذشتہ رات اس قدر بےچین تھا صبحدم خود بخود آشکار ہو جاتی ہیں اور میری سمجھ میں سب کچھ آجاتا ہے یہی وجہ ہے کہ رام دین مجھے آج بھی زندہ نظر آتا ہے یہی حال آج ان قابل فخر ہستیوں کا ہے جو زمانہ ماضی میں اپنے ایثار اور قربانیوں سے اپنی قوموں کو خلعت زندگی بخش چکی ہیں گو خود زندہ نہیں لیکن ان کی شہرت اور کارنامے بقائے دوام حاصل کر چکے ہیں کاش اس دور نکبت میں ہمارے نونہالوں کو اس پرداخت کا اگر عشر عشیر بھی نصیب ہو جائے تو وہ دن دور نہیں جبکہ ہماری حیات قومی طرب انگیز بن سکتی ہے، اور آنے والی نسلوں کے لئے ایک ایسا فرح بخش مستقبل پیدا کر سکتی ہے جسے ہماری موجودہ فلاکت کا پردہ دار کہا جا سکتا ہے۔ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا۔

رباعیات

حضرت آزاد انصاری

وفادار احباب قسمت سے ملتے ہیں

درمانِ دلِ زار کہاں سے لاؤں
دکھ درد کے غمخوار کہاں سے لاؤں
تقدیر موافق نہ زمانہ دمساز
یارانِ وفادار کہاں سے لاؤں

یادِ احباب

وہ لطف لبِ آب کہاں سے لاؤں
وہ دورِ مے ناب کہاں سے لاؤں
ممکن ہے یہ سامان بہم ہوں لیکن
وہ دوست و احباب کہاں سے لاؤں

شریکِ زندگی سے

از جناب شبیر حسن خاں صاحب جوش ملیح آبادی

اے شریکِ زندگی، اس بات پر روتی ہے تو
کیوں مرا ذوقِ ادب ہے مائلِ جام و سبو!

کس لئے اس پر نہیں روتی کہ اہلِ خانقاہ؟
کر رہے ہیں داڑھیوں کے سایہ میں روحیں سیاہ

کس لئے اس پر نہیں روتی کہ مصنوعی صلوٰۃ؟
خم کئے دیتی ہے اپنی، وزن سے پشتِ حیات!

کس لئے اس پر نہیں روتی کہ اب جینا ہی شاق؟
دیر سے منڈلا رہا ہے چرخ پر ابرِ نفاق!

کیوں نہیں روتی کہ دنیا دام میں آئی ہوئی؟
زر کے پیچھے دوڑتی پھرتی ہے گھبرائی ہوئی!

کس لئے اس پر نہیں روتی کہ سر پر ہے زوال؟
بن رہا ہے انجمن کی ملک عورت کا جمال!

کیوں نہیں اس بات پر روتی کہ حاکم کا عتاب؟
تیری ہمجنسوں کی راہوں میں اُلٹتا ہے نقاب!

کس لئے اس پر نہیں روتی کہ ہے گرمِ فغاں؟
سبحہ و زنار میں جکڑا ہوا ہندوستاں!

کس لئے اس پر نہیں روتی کہ تیرے نونہال؟
بن رہے ہیں مغربی تعلیم سے رنگیں جمال!

کیوں نہیں روتی کہ جن کے رخ پہ تھا رعب وقار؟
آج ان لڑکوں کی سج دھج دیکھ کر آتا ہے پیار!

کس لئے اس پر نہیں روتی کہ ہندی نوجواں؟
کھو چکا ہے تیغِ زن اسلاف کی روحِ تپاں!

کس لئے اس پر نہیں روتی کہ بیٹے کی جبیں؟
باپ کے ماتھے کی سی تابندگی رکھتی نہیں!

چھوڑ کر چہرہ کے دھبے آئینہ دھوتی ہے تو؟
میری دردِ بینانہ میخواری پہ کیوں روتی ہے تو!

دورِ حاضر کی سب سے اہم ضرورت

اکابرانِ ملّت کی توجّہ کے قابل

از محترمہ بیگم صاحبزادہ آبادا حمد خانصاحب پہلی بھیت

زمانے کی حالت ہمیشہ انقلاب پذیر رہتی ہے۔
لیکن آج کل دنیا کے اِس سرے سے اُس سرے تک کچھ اس قدر کشمکش بیچینی ـ ترقی اور انقلاب کی چیخ وپکار ہے کہ اس رفتار کے پیشِ نظر سمجھ میں نہیں آتا کہ کل کیا ہونے والا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ آج جو قومیں بہ ظاہر قعر گمنامی میں پڑی ہوئی ہیں کل کس اوج کمال پر پہنچ جائیں گی۔ اس طوفانی حالت میں ایک غور کرنے والا دماغ جو محض جمود ہی کو اپنی زندگی نہیں قرار دے لیتا۔ سوچتا ہے کہ اگر ہم بھی اس دنیا میں کسی اہمیت کے ساتھ زندہ رہنا چاہتے ہیں تو اس وقت ہماری بہتر توجہ کے قابل کونسی ضرورت ہے؟ میری رائے میں ہر سمجھ دار دماغ کا آخری فیصلہ یہی ہو گا کہ اس وقت ہماری سب سے اہم ضرورت تعلیم اور صنعت پر توجہ ہے۔

یوں کہنے کو تو لڑکوں کی تعلیم پر توجہ کئے ہوئے ایک زمانہ گزرا اور لڑکیوں کی تعلیم بھی اب سوال کی اس منزل سے گزر چکی ہے کہ انھیں تعلیم دیجانی چاہیے یا نہیں۔ غرضیکہ تعلیم کی ضرورت سب کے نزدیک مسلّم ہو چکی ہے۔ مگر عملی میدان میں اتنے ہی لوگ نظر آتے ہیں جنھیں آسانی سے انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔

محکمہ تعلیم کی سرکاری رپورٹوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً عمر میں لڑکوں کی تعلیم کی طرف کافی توجہ ہو چلی ہے۔ اور اسکول میں داخل ہونے والے لڑکوں کی تعداد بہ نسبت سابق بہت کافی بڑھ گئی

ہے۔ مگر جز معاش لوگ عام طور پر تیسری چوتھی جماعت تک پڑھوا کر لڑکوں کو اسکول سے اٹھا کر مزدوری پر لگا دیتے ہیں۔ اور اس طرح بہت کم تعداد ایسے لڑکوں کی رہ جاتی ہے جو اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں۔

محکمہ تعلیم کو بھی شکایت ہے کہ اس طرح اس کا بہت سا روپیہ تقریباً بیکار صرف ہوتا ہے۔ کیونکہ اُن لڑکوں میں بہت کم تعداد ایسی رہ جاتی ہے جو اپنی عمر پر پہنچکر معمولی نوشت و خواند کی قابلیت بھی رکھتی ہو۔

یہ حالت نہایت ہی افسوسناک ہے اکابرانِ قوم کو پوری توجہ اس پر صرف کرنی چاہیے۔ اور غربا کیلئے ایسی سہولتیں بہم پہنچانی چاہئیں جس سے وہ زیادہ عرصے تک تعلیم کا سلسلہ جاری رکھ سکیں۔ اور بڑی عمر کے لوگوں کے لئے "نائٹ اسکول" (رات کی درسگاہیں) ہر شہر میں کھلنی چاہئیں۔

دنیا کی ہر ضرورت کے لئے علم کی خوبی مسلّم ہے حتیٰ کہ بے علم انسان خدا تک کو نہیں پہچان سکتا۔ اور پھر مسلمانانِ ہند کی تعلیمی حالت جو کچھ ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ نہ تعلیم۔ نہ روپیہ۔ آج کل آزاد حکومت کیلئے چیخ و پکار ہو رہی ہے اگر کچھ مل بھی گیا۔ تو نا قابلیت کی وجہ سے وہ اسے رکھ بھی سکیں گے؟

قوم کی تعلیم کے یہی معنی نہیں ہیں کہ چند حیثیت دار گھرانے تعلیم یافتہ ہو گئے اور سمجھ لیا کہ تعلیم کی ضرورت پوری ہو گئی۔ قوم کی اصل تعداد تو غربا اور متوسط الحال دیہاتی اور قصباتی لوگ ہیں جن کے ہاں تعلیم عنقا کا حکم رکھتی ہے۔ اور نہیں جانتے کہ آج دنیا میں کیا ہو رہا ہے اس کے بعد نصاب تعلیم پر توجہ کی ضرورت ہے۔ مثلاً کاشتکار ہیں ان کے بچوں کو تعلیم اسی اصول پر دی جانی چاہیئے جو تعلیم دوسری خوبیوں کے ساتھ ان میں کاشتکاری کو بہتر سے بہتر طریقہ پر چلانے کی قابلیت پیدا کر سکے۔ اسی طرح تجارت پیشہ لوگوں کی تعلیم میں یہ مدنظر رہنا ضروری ہے کہ وہ اپنے پیشے کو زیادہ کامیابی کے ساتھ ترقی دے سکیں۔ اس کے علاوہ ہر درسگاہ میں تعلیم کے ساتھ صنعت کی طرف خاص توجہ کی ضرورت ہے جو تعلیم کے بعد متعلم کو روزی پیدا کرنے کے قابل بنا سکے اور اس کا نصب العین ملازمت ہی نہ ہو اور نہ کسی پیشے کو وہ اپنے لئے ذلت جانے اور غریب والدین بیٹے کو تعلیم دلا کر آخر عمر تک اس کی نازبرداریاں اٹھاتے اٹھاتے اسی حسرت میں دنیا سے نہ چلے جائیں کہ سعادتمند صاحبزادے کی تعلیم پر جتنا روپیہ صرف ہوا وہ اتنا بھی کمانے کے قابل نہ ہو سکا۔

اب رہ گئی لڑکیوں کی تعلیم اسکی حالت اور بھی ناگفتہ بہ ہے۔ اودھ کا حال تو مجھے معلوم ہے جہاں تعلیم کی خوبی کا

تسلیم کرنے کے بعد بھی اکثر حیثیت دار گھرانوں میں لڑکیوں کے لیئے اسکول کی تعلیم کو انتہائی عیب شمار کیا جاتا ہے۔ اگر ان سے سوال کیا جائے۔ مانا کہ آپ اتنی حیثیت رکھتے ہیں کہ زیادہ خرچہ کر کے لڑکیوں کو گھروں پر تعلیم دلاسکیں (اگرچہ وہ تعلیم بھی برائے نام ہی ہوتی ہے جس سے نہ لڑکیوں کے دماغ جلا پاتے ہیں نہ دل روشن ہوتے نہ انھیں یہ معلوم ہوتا کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ جسم ہیں بے رُوح اور بے احساس انھیں تعلیم یافتہ شمار کرنا میں سمجھتی ہوں کہ علم کی توہین ہے) مگر غریب بیچارے جو اصل قوم ہیں، وہ کیا کریں اور کیسے گھروں پر تعلیم کا انتظام کریں؟ ان کی لڑکیوں کی تعلیم کے لیئے تو بہترین جگہ مدرسہ ہی ہوسکتی ہے" تو یہ سب کچھ سن کر مان لیتے ہیں مگر اپنی روش کو بدلنا نہیں چاہتے۔ مولانا حالی مرحوم نے مسدس کے شروع میں جو حکایت لکھی ہے کہ :-

کسی نے یہ بقراط سے جاکے پوچھا　　مرض تیرے نزدیک مہلک ہیں کیا کیا

کہا "دکھ جہاں میں نہیں کوئی ایسا　　کہ جس کی دوا حق نے کی ہو نہ پیدا

مگر وہ مرض جس کو آسان سمجھیں

کہے جو طبیب اسکو ہذیان سمجھیں"

یہی ان شرفا کا دستور عمل ہے! اور مصیبت یہ ہے کہ انھیں اشخاص کے ہاتھوں میں سرکاری اور میونسپلٹی کے اسکولوں کی باگ ڈور ہے۔ جب وہ سرے سے لڑکیوں کو اسکولوں میں تعلیم دلانے ہی کے خلاف ہیں تو اسکولوں کی اصلاح ہو تو کیسے؟ اور ان میں ترقی ہو تو کیونکر؟ اور ان کی حالت پر توجہ کرے تو کون؟ غربا کی قسمت کا فیصلہ قدرت نے اُن بے حس ہاتھوں میں دیدیا ہے۔ غریب ضرورت مند تڑپتے ہیں مگر اسکولوں کی نایابی اور موجودہ اسکولوں کی بد انتظامی سے پریشان ہیں اور ان کی اصلاح کی قدرت نہیں رکھتے۔ اور موجودہ حالت کو اس قابل نہیں پاتے کہ اطمینان سے لڑکیوں کو داخل کیا جاسکے۔ پھر ایسی حالت میں یہ سمجھ لینا کہ تعلیم کی طرف توجہ ہو رہی ہے اور قوم نے اس کی ضرورت کو محسوس کر لیا ہے کس قدر افسوسناک ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ جس قدر نازک ہے اُسیقدر زیادہ توجہ کا محتاج ہے۔ جیسے کہ میں اوپر لکھ آئی ہوں کہ کاشتکار کے بچے کے لیئے بہتر تعلیم وہی ہوگی جس سے وہ اپنے پیشے میں کمال حاصل کر سکے اسی طرح لڑکے اور لڑکی کی تعلیم میں ایک خاص حد تک تفاوت کی ضرورت ہے۔

جس طرح مرد تمام مردانہ خصائل چھوڑنے کے بعد بھی مرد ہی رہے گا اسی طرح لاکھ مردانہ کاموں میں سبقت لیجانے میں کامیاب ہو جائے عورت ہی

رہے گی۔ تقسیم عمل قدرت کا قانون ہے۔ اسے توڑ کر نہ مرد اپنے فرائض بخوبی انجام دیسکتا ہے نہ عورت اپنی نسائیت قائم رکھ سکتی ہے۔

عورت کی زندگی کے اگرچہ یہ معنی نہیں ہیں کہ اب کی دنیا صرف اس کا گھر ہو بلکہ جس طرح مرد کو حق ہے کہ اپنے فرائض منصبی کے ساتھ وہ دنیا کی حالت سے آگاہ رہے اسی طرح عورت بھی حق رکھتی ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو بہ حسن و خوبی انجام دیتے ہوئے دنیا کی حالت سے بے خبر نہ رہے اور جس حد تک اس کی صنف کی ضرورتوں کا تعلق ہے اس میں شامل رہ کر اس کی فلاح و بہبودی میں کوشاں ہو کر اپنے انسان ہونے کا ثبوت دے۔ مگر اپنی حد سے آگے بڑھ کر مرد بننے کی کوشش نظام عالم میں فتور ڈالیگی اور گھروں کی راحت عنقا ہو کر رہ جائے گی۔

پس جس طرح قدرت نے مرد عورت دونوں کے فرائض میں تقسیم کا قانون جاری کر دیا ہے۔ اس کی تعلیم اور نصاب تعلیم میں اس تفاوت کا لحاظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔ ورنہ یہ کس قدر مضحکہ انگیز بات ہے کہ اسکولوں میں لڑکے اور لڑکیوں کا نصاب تعلیم ایک ہی ہو۔ زندگی بھر واسطہ کن چیزوں سے پڑے گا اور سکھا کیا جاتا ہے!!! جبھی تو اسکولوں کی تعلیم یافتہ لڑکیاں اکثر گھر داری میں نا اہل ثابت ہوتی ہیں۔

جس طرح لڑکوں کے نصاب میں ان کی ضروریات کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ اسی طرح ضرورت کے مطابق دوسری شاخوں کے ساتھ لڑکیوں کے نصاب میں گھر داری کی تمام اہم باتیں شامل ہونی چاہئیں۔ مثلاً پکانا ریندھنا سینا پرونا۔ گھر داری کا حساب کتاب۔ گھر کی صفائی اور آرائش کے طریق گھر کی آمدنی میں مناسب اضافے کی صورتیں۔ آداب ملاقات۔ مہمانی اور میزبانی کے فرائض بچوں کی پرورش اور تربیت جو عورت کی زندگی کا مقصود ہے۔ ان کا رکھ رکھاؤ ان کی ابتدائی تعلیم اور تربیت کا سلیقہ اور مناسب حد تک تیمار داری اور طبابت وغیرہ وغیرہ یہ سب کام اس کی زندگی اور اسکی نسائیت کے گوہر ہیں اور ان سب کو اس کے نصاب کا اولین جزو ہونا چاہئیے۔ ابتدائی کلاسوں میں یہ سب کچھ تحریری تعلیم ہو لیکن بڑی درسگاہوں میں عملی تعلیم دیجائے اور اس کے ساتھ ہی حسب ضرورت دوسری چیزیں بھی نصاب میں شامل ہوں۔

یہانتک میں نے جو کچھ لکھا وہ دنیاوی ضرورت کے لئے لکھا اب رہ گئی مذہبی تعلیم اسے میرے نکتہ نگاہ سے سب سے اوّل ہونا چاہئیے۔ اور نصاب میں اس کی طرف کامل توجہ کی ضرورت ہے۔ اگر کہا جائے کہ سرکاری مدارس میں اس کا انتظام نہیں ہوسکتا تو

اسے ماننے کے لئے تیار نہیں۔ جب ہم حکومت سے ہر جائز اور ناجائز بات منوانے میں تامل نہیں کرتے تو کیا وجہ ہے کہ ہم اپنی ایک نہایت معقول اور اہم ضرورت کو نہ منوا سکیں۔

قرآنِ مجید معہ تفسیر اور احادیثِ صحیحہ معہ تاریخ اسلام ضرور داخلِ نصاب ہونا چاہیئے۔ مسلمانوں کی بدقسمتی سے نہ معلوم وہ کونسا دور تھا جس میں علمائے اسلام نے یہ برباد کن فتویٰ دیا تھا کہ "قرآنِ مجید بلا ترجمہ پڑھنا بھی داخلِ ثواب ہے" جس نے مسلمانوں کو تباہی کے غار میں پہنچا دیا اور آج ان کے مذہب کا تعلق ان کے نام سے ہی رہ گیا ہے۔

ضرورت ہے کہ اب یہ طریقِ تعلیم بالکل بدل دیا جائے اور ہر ممکن کوشش سے نصاب میں مذہبی تعلیم معہ ترجمہ اور تفسیر شامل کی جائے۔

پچھلے دور میں جب تعلیم کی طرف توجہ کی ابتداء کی گئی تھی لڑکیوں کی تعلیم کا عام طور پر یہ دستور تھا کہ ان کو گھروں پر ناظرہ قرآنِ مجید اور مسئلے مسائل کی چند کتابیں پڑھا دی جاتی تھیں پھر ہزاروں میں کوئی ایک لڑکی اسکول میں تعلیم کے لئے بھیجی جاتی تھی۔ لیکن اب اگر شروع سے لڑکی کو اسکول میں داخل کیا جائے تو مذہبی تعلیم کا کونسا وقت ہوگا؟ اگر اسکول کی تعلیم کے ساتھ گھر پر اس تعلیم کا سلسلہ بھی قائم رکھا جائے تو لڑکی کے دماغ پر دوہری تعلیم کا بار ہوگا۔ اور پھر اب صرف ناظرہ قرآنِ مجید پڑھانا ہی مقصود نہیں بلکہ قرآنِ مجید معہ ترجمہ و تفسیر اور احادیثِ صحیحہ پڑھانا جزوِ تعلیم ہونا چاہیئے اور ظاہر ہے کہ ایسی تعلیم کا انتظام ہر گھر پر ہونا ناممکن ہے۔ پس اسکول میں اس کا انتظام ہونا چاہیئے۔ اور جیسے بھی ممکن ہو سرکار سے اسے منوانا چاہیئے۔ اسی پر اکابرانِ قوم کی توجہ درکار ہے۔

مذہبی تعلیم صرف لڑکیوں کی تعلیم تک محدود نہ رہنی چاہیئے بلکہ لڑکوں کے لئے ویسے ہی ضروری طور پر نصاب میں شامل ہونی چاہیئے۔ کیونکہ کسی انگریز کے قول کے مطابق کہ "دوسری قوموں نے ترقی جب کی جب اپنے مذہب کو چھوڑا اور مسلمان تنزل کی طرف جب گئے جب انھوں نے اپنے مذہب کو چھوڑا" ہماری ترقی کا واحد علاج احیائے مذہب ہے۔

اگر کہا جائے کہ مخلوط اسکولوں میں مذہبی تعلیم کا انتظام کیسے ممکن ہے؟ تو ایسی صورت میں غیر مسلم طلبا کے لئے اسلامی تعلیم کی حیثیت اختیاری مضمون کی ہونی چاہیئے۔ مگر مسلمان طلباء کیلئے بہر صورت لازمی ہو اگر ایسا ممکن نہ ہو (اول تو ضرور ہو سکتا ہے) تو پھر الگ الگ درسگاہیں قائم کی جائیں۔ غرضکہ

جس طرح ممکن ہو مذہبی تعلیم لازمی ہونی چاہئے۔

اکابرانِ ملّت اگر قوم کی واقعی اور دیرپا کامیابی کے خواہشمند ہیں تو اِن کی پوری توجہ قوم کے بچوں کی تعلیم پر اور نصابِ تعلیم کی اصلاح و تربیت پر اور نئے اسکولوں کے قیام پر صرف ہونی چاہئے۔

تعلیم مادری زبان میں ہو تو بہت ہی بہتر ہے جس کے لئے حکومت نظام کی گراں قدر عنایات غایت درجہ شکریے کی مستحق ہیں۔ اس کے علاوہ ابتدائی درجوں کے بعد انگریزی تعلیم بھی نصاب میں لازمی طور پر شامل ہونی چاہئے۔ کیونکہ اس زبان نے بھی بقول لیڈی سائمن اس قدر عمومیت اختیار کر لی ہے کہ اکثر مواقع پر اس کی ضرورت پڑتی ہے اور ایک انگریزی سے ناواقف شخص ایسے وقت اپنے تئیں بہت معذور پاتا ہے۔ اور پھر مذہبی تعلیم اپنی اصلی زبان میں ہونی چاہئے معہ ترجمہ کے۔ بچوں کے لئے جبری تعلیم کا رواج بھی عام ہونا چاہئے۔ ایسے موقع پر مسلمان اپنی لڑکیوں کے لئے نہایت آسانی سے یہ کہہ کر الگ ہو جاتے ہیں کہ ہمارے ہاں پردے کا رواج ہے۔ لیکن اِن مسلمانوں کے خیالات پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے جو لڑکی کو گیارہ بارہ سال سے پیشتر پابند پردہ کرنے کے حامی ہوں۔ پھر کیوں نہ مسلمان لڑکیوں کے لئے بھی مناسب انتظام کے ساتھ کم از کم گیارہ سال کی عمر تک جبری تعلیم کا رواج رہے؟ اور اس عمر کے بعد بھی پردے کی ایک خاص حد مقرر ہونی چاہئے۔ شرعی پردے کے متعلق بڑے بڑے علماء کا جو فیصلہ ہے وہ ایک مفصل مضمون کا محتاج ہے جس کو انشاءاللہ کبھی آیندہ اکابرانِ ملّت کی خدمت میں پیش کروں گی

اب اس طویل مضمون کو ختم کرتے ہوئے کیا میں یہ اُمید رکھ سکتی ہوں کہ میرے ناچیز خیالات کسی توجہ کے مستحق سمجھے جائیں گے اور رہنمایانِ قوم اس بنیادی اصلاح پر توجہ فرما کر اس کی مستقل اور پائیدار بہتری کا سامان بہم پہنچائیں گے؟ کیا چند مقتدر ہستیاں پوری زندگی اس کام کے لئے وقف نہیں کر سکتیں؟ خدا کرے کہ ایسا ہو اور اسلام کے بہترین دماغ اِس کام کا بیڑا اٹھائیں۔ آمین یا ربّ العٰلمین

کیا لکھیں؟

از جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری ایم - اے - پی ایچ - ڈی (لندن)

جب کبھی میں نے اپنے احباب سے کچھ لکھنے کی فرمائش کی تو ان کا جواب ہمیشہ اس سوال کی شکل میں نمودار ہوتا رہا کہ "کیا لکھیں؟" یہ ایک حقیقت ہے کہ ہماری زبان کی اخباری اور رسالہ جاتی زندگی ابھی عالم طفولیت میں ہے ورنہ یہ مسئلہ ایک حد تک خود بخود حل ہو جاتا۔ اور میرے احباب اگر وہ غیر معمولی طور پر کسی خاص مضمون کے ماہر نہوں ایسے موضوع سے اپنی تحریروں کی ابتدا کرتے جو عام پڑھنے لکھنے والوں کے لئے دلچسپی کا باعث بن سکتا ہو۔

ابھی ہم میں سے بہت سے حضرات کو دنیا کی روزمرہ کی معمولی معمولی باتوں ہی کے متعلق معلومات کی ضرورت ہے اور بجائے اس کے کہ اطراف واکناف کی چیزوں پر کچھ لکھا جائے دور و دراز کی اشیاء اور لاینحل مسائل پر قلم فرسائی کرنا نہ صرف اپنی قوتوں کو برباد کرنا بلکہ اپنے ملک وقوم اور زبان کو دھوکا دینا ہے۔

ہمارے اکثر ادبی ذوق رکھنے والے نوجوان جب کبھی قلم اٹھاتے ہیں تو ایسے موضوع اختیار کرتے ہیں جن کو صرف علماء اور مخصوصین ہی سمجھ سکتے ہیں، اور جن کی جگہ انسائیکلوپیڈیا ہی میں ہوسکتی ہے نہ کہ اخبار و رسائل میں۔ یہ کس قدر حیرت ناک بات ہے کہ حیدرآباد یا دہلی کا ایک اہل قلم "یونانی مجسمول" "فرانسیسی اخلاقی معیار" "جرمن کی معاشرتی زندگی" یا "میخی اور پیکانی رسم الخط" پر تو صفحے کے صفحے سیاہ کر دیتا ہے اور اگر نہیں لکھتا ہے تو "حیدرآباد یا دہلی کے آثار قدیمہ"، "مغلوں یا قطب شاہوں کی تعمیری خصوصیات"، "ہماری موجودہ معاشرت کے

نقائص" یا "اردو رسم الخط میں اصلاحیں" جیسے موضوعوں پر جن پر مضامین ہی نہیں کتابیں لکھی جا سکتی ہیں!

ایک قدیم طرز کے حیدرآبادی عالم جنھوں نے اردو میں کتابیں لکھ کر اس کی یقیناً خدمت کی ہے کھجور کی کاشت پر مبسوط کتاب لکھتے ہیں، لیکن خدا کے کسی بندہ کو اس امر کی توفیق نہیں ہوئی کہ آم یا خربوزے یا سیتاپھل (شریفہ) پر کوئی مضمون یا کتاب لکھے۔

۲

اکثر اوقات دوستوں اور عزیزوں سے گفتگو کرنے کے دوران ہی میں اچھے اچھے موضوع ہاتھ آجاتے ہیں۔ کوئی ایک لفظ ہی بعض دفعہ خیالات کا ایک سیلاب پیدا کر دیتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ موضوع ہر سمت سے نکلے نظر آتے ہیں اگر آپ کی نظر تیز ہو اور آپ کا ذہن اشیاء کا عکس لینے کے لئے تیار رہے۔

دن رات کے کام کاج اور کھیل کود کا ہر پہلو موضوع پیش کرنے کے غیر محدود امکانات اپنے اندر پنہاں رکھتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کوئی اس سے فائدہ اٹھائے۔ مثال کے طور پر آپ اپنے شہر یا گاؤں ہی پر نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ کتنے مضمون آپ کے ذہن میں پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مثلاً

۱۔ ہمارے شہر کی اہم تجارت۔ ۲۔ اس کی دلچسپیاں ۳۔ اس کے بہترین مناظر۔ ۴۔ اس کی سواریاں۔ ۵۔ اس کی سب سے بڑی سڑک۔ ۶۔ ہمارے ہم وطن شعراء ۷۔ نثر نگار۔ ۸۔ نقاش۔ ۹۔ امراء۔ ۱۰۔ بادشاہ ۱۱۔ فقیر۔ ۱۲۔ عمارتیں۔ ۱۳۔ باغ۔ ۱۴۔ محلوں اور عمارتوں کے عجیب و غریب نام۔ ۱۵۔ رسم و رواج ۱۶۔ قدیم روایتیں۔ ۱۷۔ عید اور تہوار وغیرہ۔

اگر آپ حسن اتفاق سے کسی قدیم شہر کے باشندے ہوں تو آپ کو ہر ویرانے میں سبزہ کے ساتھ ساتھ مضمونوں اور فسانوں کے خاکے بھی اگتے ہوئے نظر آئیں گے۔ قدیم آبادیاں فسانوں کے خاکوں سے بھری پڑی ہیں۔ خصوصاً دہلی، لکھنو، حیدرآباد اور لاہور ـــ وہ شہر جن کے در و دیوار عظمت ماضی سے صدیوں ہم آغوش رہ چکے ہوں۔ قصوں کے سرچشمے ہیں۔ اگر آپ کا محلہ یا اس کا قرب و جوار اور آپ کی روزمرہ کی گذرگاہیں کسی موضوع یا فسانوی خاکے سے آپ کی ضیافت کرتی نظر نہیں آتیں۔ تو آپ ٹہلتے ٹہلتے یا گاڑی میں ذرا دور نکل جائیے اور پھر ذوق نظر اور قوت گوش سے کام لیجئے۔ آپ شاید ہی محروم واپس ہو سکیں۔ فسانوں کے نہیں تو کم از کم مضامین کے خاکے تو آپ کو ضرور دستیاب ہو جائیں گے۔

اس قسم کی دوسری معلوماتی کتابوں سے بھی مدد ملسکتی ہے

۴

جب آپ انشاء پردازی کے لئے موضوع اور خیالات کی تلاش کر رہے ہیں تو بہت جلد معلوم کرلیں گے کہ کم ازکم ایک موضوع ایسا ضرور ہے جس کی طرف آپ بے تحاشہ بڑھتے ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہی ہوگی کہ اس خاص موضوع کے متعلق آپ کی معلومات یا تجربے نسبتاً زیادہ ہوں گے۔ اور جنھیں بیان کرنے میں آپ کو کسی قسم کی رکاوٹ یا زحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ یا وہ ایک ایسا موضوع بھی ہوسکتا ہے جس میں یا جس کے متعلقہ امور میں آپ کو انشاء پردازی شروع کرنے سے بہت پہلے ہی سے دلچسپی رہی ہو۔ اب آپ سوچیں گے کہ آیا میں ایسے موضوع کے لئے خود کو وقف کردوں اور واقعہ یہ ہے کہ کبھی کبھی آپ کے ذہن میں یہ خیال ضرور آئیگا کہ کیا کسی ایک ہی موضوع کا مخصوص انشاء پرداز بننا ضروری ہے یا نہیں

یورپ کے اکثر بہترین دماغوں کی رائے ہے کہ انشاء پردازی کی ابتداء کرنے والا اپنی دلچسپی کے مطابق کسی موضوع کو اپنے لئے مخصوص کرلے تو زیادہ مناسب ہے۔ ان کا یہ مشورہ اس خیال پر مبنی ہے کہ انشاء پرداز ایسے خیالات اور معلومات کے ساتھ اپنی تحریروں کا آغاز کرتا ہے جو جانے بوجھے ہوتے ہیں اور جو راہ ورسم انشاء پردازی سے اس کو آسانی کے ساتھ روشناس کرا سکتے ہیں۔ ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ لکھنے والا جب کسی موضوع سے پہلے ہی سے واقف ہوتا ہے تو اس کی نسبت کامل وثوق اور خود اعتمادی کے ساتھ لکھ سکتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ بغیر وثوق اور خود اعتمادی کے کوئی انشاء پرداز اپنی تحریروں کو کامیاب نہیں بنا سکتا۔

یہ بہت ممکن ہے کہ آپ کو ابتداء میں کوئی ایسا موضوع نظر نہ آئے جس کی طرف آپ شوق سے بڑھ سکیں لیکن آپ کو چاہیئے کہ اس قسم کا موضوع دریافت کرنے کی کوشش کریں۔ علم وفن کی کوئی نہ کوئی شاخ ایسی ضرور نکلے گی جس کی طرف آپ توجہ کرنا چاہیں گے۔ اگر آپ کی زندگی کا کوئی حصہ دیہات میں گذرا ہو تو آپ دیہاتی زندگی اور فن زراعت کے متفرق پہلوؤں پر مضمون اور قصے لکھکر اپنی انشاء پردازی کی ابتداء کرسکتے ہیں۔ یا اگر آپ کو مطالعے کا زیادہ شوق ہے تو آپ ہر کتاب کو پڑھنے کے بعد اس کی نسبت اپنے خیال کا اظہار بذریعہ تحریر کرسکتے ہیں۔ اور آپ کی یہ تحریریں خود بخود ادبی انشاء پردازی کی شکل میں منتقل ہوتی جائیں گی۔

۵

اس قسم کی دوسری معلوماتی کتابوں سے بھی مدد مل سکتی ہے

۴

جب آپ انشا پردازی کے لئے موضوع اور خیالات کی تلاش کر رہے ہیں تو بہت جلد معلوم کر لیں گے کہ کم از کم ایک موضوع ایسا ضرور ہے جس کی طرف آپ بے تحاشہ بڑھتے ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہی ہوگی کہ اس خاص موضوع کے متعلق آپ کی معلومات یا تجربے نسبتاً زیادہ ہوں گے۔ اور جنھیں بیان کرنے میں آپ کو کسی قسم کی رکاوٹ یا زحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ یا وہ ایک ایسا موضوع بھی ہو سکتا ہے جس میں یا جس کے متعلقہ امور میں آپ کو انشا پردازی شروع کرنے سے بہت پہلے ہی سے دلچسپی رہی ہو۔ اب آپ سوچیں گے کہ آیا میں ایسے موضوع کے لئے خود کو وقف کر دوں اور واقعہ یہ ہے کہ کبھی نہ کبھی آپ کے ذہن میں یہ خیال ضرور پیدا ہوگا کہ کیا کسی ایک ہی موضوع کا مخصوص انشا پرداز بننا ضروری ہے یا نہیں۔

یورپ کے اکثر بہترین دماغوں کی رائے ہے کہ انشا پردازی کی ابتدا کرنے والا اپنی دلچسپی کے مطابق کسی موضوع کو اپنے لئے مخصوص کر لے تو زیادہ مناسب ہے۔ ان کا یہ مشورہ اس خیال پر مبنی ہے کہ انشا پرداز ایسے خیالات اور معلومات کے ساتھ اپنی تحریروں کا آغاز کرتا ہے جو جانے بوجھے ہوتے ہیں اور جو راہ و رسم انشا پردازی سے اس کو آسانی کے ساتھ روشناس کرا سکتے ہیں۔ ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ لکھنے والا جب کسی موضوع سے پہلے ہی سے واقف ہوتا ہے تو اس کی نسبت کامل وثوق اور خود اعتمادی کے ساتھ لکھ سکتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ بغیر وثوق اور خود اعتمادی کے کوئی انشا پرداز اپنی تحریروں کو کامیاب نہیں بنا سکتا۔

یہ بہت ممکن ہے کہ آپ کو ابتدا میں کوئی ایسا موضوع نظر نہ آئے جس کی طرف آپ شوق سے بڑھ سکیں لیکن آپ کو چاہیئے کہ اس قسم کا موضوع دریافت کرنے کی کوشش کریں۔ علم و فن کی کوئی نہ کوئی شاخ ایسی ضرور نکلے گی جس کی طرف آپ توجہ کرنا چاہیں گے۔ اگر آپ کی زندگی کا کوئی حصہ دیہات میں گذرا ہو تو آپ دیہاتی زندگی اور فن زراعت کے متفرق پہلوؤں پر مضمون اور افسانے لکھ کر اپنی انشا پردازی کی ابتداء کر سکتے ہیں۔ یا اگر آپ کو مطالعے کا زیادہ شوق ہے تو آپ ہر کتاب کو پڑھنے کے بعد اس کی نسبت اپنے خیال کا اظہار بذریعۂ تحریر کر سکتے ہیں۔ اور آپ کی یہ تحریریں خود بخود ادبی انشا پردازی کی شکل میں منتقل ہوتی جائیں گی۔

۵

مخصوص موضوعوں سے ابتدا کرنے والوں کو اس بات کا ضرور لحاظ رکھنا چاہیئے کہ فنی اصطلاحوں کی کثرت اور معلومات کے خشک اظہار سے حتی الامکان پرہیز کریں فنی موضوعوں پر دلچسپ پیرائے میں بھی مضامین لکھے جاسکتے ہیں۔ اور یہ ایک طالب علم بھی جانتا ہے کہ دلکشی پیدا کئے بغیر انشاپرداز کو ہرگز مقبولیت حاصل نہیں ہوتی

جو لوگ ایسے موضوع اپنے لئے مخصوص کر لیتے ہیں جو عام دلچسپی کا باعث بن سکیں بہت جلد انشاپردازوں کی فہرست میں شامل کر لئے جاتے ہیں۔ اگر ہم میں سے کوئی شخص انسان کی صحت اور اس سے متعلقہ موضوعوں پر لطف اندوز اسلوب میں انشاپردازی شروع کر دے تو یقین ہے کہ اس کے مضامین ہر رسالہ میں شائع ہوں گے اور پڑھنے والے فرصت اولیں میں ان پر نظر ڈالیں گے۔

موضوع مخصوص کر لینے کے بعد کسی شخص کو یہ بھول نہیں جانا چاہیئے کہ کامیاب انشاپرداز وہی ہوتا ہے جس کی دلچسپیاں وسیع ہوں۔ ایک ہی موضوع میں محو ہوجانا' اور زندگی کے عام حالات وخیالات سے قطع تعلق کر لینا انشاپردازانہ خودکشی ہے۔ ایک انشاپرداز کے لئے "ہرفن مولا" ہونا سب سے زیادہ کامگاری کی دلیل ہے۔ اس کو چاہیئے کہ کارزارہستی اور اس کے کاروبار پر بے تعصبی کے ساتھ نظر ڈالے۔ اور انسانوں کی روزمرہ کی زندگیوں پر جو چیزیں اثر ڈالا کرتی ہیں ان کا گہرا اور ہمدردانہ مطالعہ کرتا رہے۔ معلومات کے اضافے اور وسیع نظری میں ہمیشہ جولی دامن کا ساتعلق رہا کرتا ہے۔ جو انشاپرداز صحیح طور پر ترقی کرنا چاہتا ہے ہمیشہ ایسے موقعوں کا متلاشی رہتا ہے جن کی وجہ سے وہ اپنی دلچسپیوں کے دائرہ کو وسیع تر کرسکے وہ چھوٹے سے چھوٹے موضوع پر بھی اسی توجہ سے کام کرتا ہے جو بڑے سے بڑے موضوع کے لئے درکار ہوتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے پیشے کی ہرشاخ کا ایک سچا اور کامیاب مخصوص انشاپرداز بن جاتا ہے۔

(۶)

اردو ادب صنف نازک کے لئے ایک خوشنما مستقبل انتظار کر رہا ہے لیکن ایسی کتنی مستورات ہیں جو اسے خوش آمدید کہنے کے لئے تیار ہیں۔ موجودہ نظام تعلیم اور طرز معاشرت کے لحاظ سے اُن کو اعلیٰ درجہ کی تعلیم بہت کم حاصل ہوسکتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم تو کجا ہماری اکثر عورتیں دنیا کی روزمرہ کی باتوں سے بھی عام طور پر ناواقف رہتی ہیں۔ لیکن ان دونوں حالتوں سے زیادہ قابل افسوس بات یہ ہے کہ

جو معدودے چند عورتیں پڑھی لکھی ہوتی ہیں ان میں اگر کسی کو انشاپردازی کا شوق بھی ہوتا ہے تو وہ ایسے موضوعوں سے اپنے ذوق کو سیراب کرتی ہیں جو نہ صرف ہمارے قدیم معیار شرم و حیا کے اعتبار سے قابل ملامت ہیں بلکہ ہماری جدید موجودہ ضروریات کے مدنظر بھی امید شکن۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت تک اردو میں اُمور خانہ داری تو خیر انسانی زندگی کے کسی شعبہ پر بھی کما حقہٗ ادب نہیں ملتا۔

ترقی یافتہ ملکوں میں اس صنف ادب کی طرف خاص طور پر توجہ کی گئی ہے۔ اور وہاں ایسے بے گنتی رسالے چھپتے رہتے ہیں جو صرف عورتوں کے لئے ہوتے ہیں، یا جن میں صرف عورتیں ہی لکھتی ہیں۔ اور اس قماش کے رسالوں کی تعداد روز بروز اور بھی بڑھتی جاتی ہے۔ ان مخصوص پرچوں کے علاوہ اکثر روزنامہ اخباروں میں ایک دو صفحے عورتوں کی ضرورتوں یا اُن کے مضمونوں کے لئے وقف ہوتے ہیں۔ اسی طرح کامیاب رسالوں کے مدیر یہ معلوم کرنے کے بعد کہ ان کے ناظرین میں صنف نازک کے افراد کی کس قدر زیادہ تعداد شامل ہے، اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ اپنی مطبوعات میں نسائی دلچسپی کے خاص خاص اجزا شریک کریں۔ یہی حالت ہمارے یہاں بھی کبھی نہ کبھی پیدا ہوگی اور جلد پیدا ہوسکتی ہے اگر ہماری مستورات اپنی دوسری مشغولیتوں اور آرائش و زیبائش کے اوقات میں سے تھوڑا سا وقت اس کام کے لئے بھی نکال لیا کریں۔

روزمرہ کی ضرورتوں پر لکھنا زیادہ مفید ہے اور جلد مقبولیت حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن اگر کسی کا ادبی ذوق اس قسم کے موضوعوں کو معمولی اور خشک سمجھتا ہو تو صنف نازک کی عام عادتوں اور طریقہ زندگی پر نفسی نقطۂ نظر سے دلچسپ اشارے، مضمون یا قصّے لکھے جا سکتے ہیں۔ یہ کام آسان ہے اگر کسی کو محسوس کرنا اور ظاہر کرنا آتا ہو۔ شادی، بچوں کی پرورش، میاں کے ساتھ دلچسپی، ساس بہو کے تعلقات، لڑکیوں کے کھیل، اور بوڑھیوں کے خاص خاص ضبط اور وہم وغیرہ ایسے موضوع ہیں جن پر سیکڑوں انداز سے اظہار خیال کیا جا سکتا ہے۔

لیکن اس خیال پر زور دینے سے کہ ہماری عورتوں کو فی الحال صنف نازک ہی کی معاشرتی ضرورتوں کے مطابق انشاپردازی کرنی چاہیے کسی کا منشاء ہرگز یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ دوسرے اور عام موضوعوں کے لئے قلم ہی نہ اٹھائیں۔ انشاپردازی میں ترقی اس وقت ہوسکتی ہے جب کہ محنت کے ساتھ ساتھ لکھنے والے کو موضوع کے ساتھ ایک خاص شغف ہو۔

اور اگر ہماری صنف نازک کے کسی فرد کو کسی علمی یا فنی مسئلہ سے دلچسپی ہو تو وہ ضرور اس پر اظہار خیال کر کے اپنی انشا پردازی کی ابتدا کر سکتا ہے۔ اس گئی گذری حالت میں حیدرآباد جیسے شہر میں بھی (جہاں زمانہ تعلیم کی خاطر خواہ ترقی نہیں ہوی ہے) بعض بی بیاں ایسی موجود ہیں جن کا ذوق علم انہیں اعلیٰ سے اعلیٰ اور مشکل سے مشکل مسائل کی طرف راغب کرتا ہے چنانچہ میں اس سلسلہ میں اس امر کا اظہار بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے قیام یورپ کے زمانہ میں جب میں اُردو کی لسانیاتی تحقیق میں مشغول تھا تو حیدرآباد سے ایک صاحب ذوق نے اپنے میاں کے توسط سے میرے کام کا بہت اور قابل قدر مواد روانہ کیا تھا۔ اور چونکہ میرے وہ لسانیاتی مضامین ابھی کسی شکل میں شائع نہیں ہوئے ہیں اور اس غیر متوقعہ مدد کا شکریہ ادا کرنے کا موقعہ نہیں ملا اس لئے میں اس موقعہ پر اس واقعہ کے ذکر کو نہایت غنیمت سمجھتا ہوں۔

خیالات

اثر - جناب علی اختر صاحب اختر

دل کو لذّت طلبِ بادۂ پندار نہ کر — دیکھ اس فتنۂ خوابیدہ کو ہشیار نہ کر

تو اگر کیف کے اسرار سے ناواقف ہے — آ، سرِ میکدہ، اندازۂ گفتار نہ کر

خلوتِ رُوح میں خوابیدہ ہیں اجزائے امید — اِس سے بڑھکر ہوسِ لذّتِ آزار نہ کر

دل ہے اور سر سے گزرتا ہوا اِک موجۂ خوں — بیخودی کو رہِ دانش سے خبردار نہ کر

کچھ نہیں ہستیٔ دوراں جو یہ پردہ اُٹھ جائے — سطح بیں! رُوح کو وقفِ رہِ اسرار نہ کر

تیری تعمیر ہے وابستۂ آئینِ حیات — آ، محالات کی تحصیل پہ اصرار نہ کر

تجھکو فطرت نے عطا کی ہے جو روحِ بیباک — فتحمندانہ گزر، عجز کا اقرار نہ کر

ذرّہ ذرّہ ہے اک آئینۂ تنویرِ جمال — بیخبر! اپنی حقیقت سے تو انکار نہ کر

دل کہ ہے راہبرِ جادۂ میدانِ عمل — اس کو آسایشِ منزل کا طلبگار نہ کر

دہر پابستۂ زنجیرِ علائق کب تک؟ — رُوحِ آزاد کو اس درجہ گرانبار نہ کر

"فتح" انجامِ عمل، وہم کی تخلیق "شکست" — اس میں کچھ شک ہے تو پھر ہمّتِ بیکار نہ کر

بیمِ فردا سے نہ کر، عشرتِ امروز تباہ — بیخبر! روزِ درخشاں کو شبِ تار نہ کر

زندگی صرفِ رہِ مرگ!! خدارا اختر

حلقۂ وہم میں عنقا کو گرفتار نہ کر

لاڈلے پوت

دل کے پھپھولے جل اُٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

از جناب مرزا عبدالحمید بیگ صاحب بی۔اے' بی ٹی (علیگ)

ضد اور ہٹ دھرمی کا تو کوئی علاج نہیں لیکن اگر انصاف اور حق پسندی دنیا سے مفقود نہیں ہوئے ہیں تو آپ کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہم میں جسمانی ۔ ذہنی اور اخلاقی جس قدر بھی کمزوریاں پائی جاتی ہیں ان سب کی ذمہ داری ہمارے محترم والدین اور اساتذہ پر عاید ہوتی ہے ۔ ممکن ہے بعض بزرگ اس الزام سے بچنے کے لئے اول "خطائے بزرگاں گرفتن خطا است" کی کمزور اور بوسیدہ ڈھال کے پیچھے پناہ لینے کی کوشش کریں اور بالآخر ہم کو چودھویں صدی کی ناخلف اولاد کے زمرے میں شریک کردیں مگر ان کے اس فعل سے حقیقت حال پر پردہ نہیں پڑ سکتا۔ محترم اساتذہ سے تو ہم کسی اور موقع پر نپٹینگے۔ اس جگہ پر تو صرف اپنے گھر کے واقعات گوش گزار کرکے اپنی کمزوریوں کی ذمہ داری کا فیصلہ آپ پر چھوڑ دیتے ہیں۔ بس لیجئے سُنیئے۔

ہماری خوش قسمتی ہی سمجھ لیجئے کہ ہم ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے جہاں اللہ کا دیا سب کچھ موجود تھا۔ یعنی آرام کرنے کے لئے پرتکلف بنگورا۔ ہوا خوری کے لئے فس کلاس گاڑی۔ خدمتگزاری کے لئے انّا وایا اور جناب نازو چوچلے اٹھانے کے لئے ہمارے شفیق والدین۔ لیکن اتفاق کہئے یا مصلحت ایزدی کہ ہماری اس خوش نصیبی پر بدقسمتی کا ایک چھینٹا ضرور پڑ گیا تھا یعنی یہ کہ اللہ میاں نے ہماری عنان پرورش

جن لوگوں کے ہاتھ میں دی تھی ان کو بچوں کی پرورش جیسے
اہم علم سے بالکل بے بہرہ رکھا تھا۔ چونکہ آپ خود تعلیم یافتہ
اور سمجھدار آدمی ہیں اس لئے ہم بلا پس و پیش یہ فرض
کر لیتے ہیں کہ آپ کو یہ ضرور معلوم ہوگا کہ بچے کی تعلیم و
تربیت در اصل اس کی پیدائش ہی سے شروع ہو جاتی
ہے اور ماں کی گود اس کی سب سے پہلی اور سب سے اہم
تربیت گاہ ہوتی ہے۔ اسی جگہ سے اس کی تربیت کی
بنیاد شروع ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ پایہ جس قدر
گہرا اور مضبوط ہوگا اسی قدر مستحکم اور عالیشان عمارت
اس پر تعمیر ہو سکے گی۔ اس لئے والدین کا فریضہ ہے کہ
ابتدا ہی سے بچہ کے لئے نہایت خوشگوار ماحول پیدا
کریں کیونکہ بچہ بالکل اندھا بنکر اپنے ماحول کی تقلید کرتا
ہے اور اس کے سامنے اس وقت زندگی کا جو نقشہ پیش
کیا جاتا ہے اس کے نقوش اس کے دل پر پتھر کی لکیر کی
طرح کندہ ہو جاتے ہیں۔ اس کی زندگی کی باگ ڈور
اس زمانہ میں پورے طور پر اس کے والدین کے ہاتھ
میں ہوتی ہے۔ جدھر چاہیں اسے موڑ دیں اور جس سانچہ
میں چاہیں اسے ڈھال لیں۔ والدین و گرد و پیش
والوں کا ہر فعل حتیٰ کہ ان کا چلنا پھرنا۔ کھانا پینا۔
بات چیت۔ وضع قطع غرض کہ ہر بات کا بچہ کی تربیت
پر اثر پڑنا ضروری ہوتا ہے۔ ہم سب "تخم تاثیر صحبت کا
اثر" روزمرہ استعمال کرتے ہیں مگر اس کے حقیقی مفہوم
پر غور کم کرتے ہیں۔ جس کا یہ مطلب ہے کہ بچہ اپنے
والدین کی برائیاں اور بھلائیاں لیکر دنیا میں آتا ہے
اور ماحول کے اثر سے وہ یا تو دب کر بیکار ہو جاتی ہیں
اور یا ابھر کر نمایاں ہو جاتی ہیں۔ مگر افسوس کہ ہم اس
اہم چیز کو قطعاً نظر انداز کر کے بچہ کو ایک خودرو پودے
کی طرح بلا کسی دیکھ بھال کے چھوڑ دیتے ہیں۔ اور
بعد میں خود بچہ کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔ خیر یہ
چند نفسیاتی امور ہیں جن سے غالباً آپ واقف
ہوں گے لیکن اب ذرا ان کی روشنی میں براہِ کرم
ہمارے گھر کا نقشہ ملاحظہ فرمائیے۔

ہمارے والدین اللہ کے فضل سے لکھے پڑھے
اور سمجھدار آدمی ضرور تھے مگر دونوں کو کچھ ایسی
مصروفیتیں لاحق تھیں کہ بچارے ہماری دیکھ بھال
کے لئے وقت ہی نہیں نکال سکتے تھے۔ ابا میاں سے
تو ہم کو کوئی شکایت نہیں کیونکہ وہ بچارے سارے
دن تو کچہری میں رہتے وہاں مسلوں پر چھوٹی بڑی
دستخط کرتے کرتے تھک کر چورا ہو جاتے۔ وہاں سے
فارغ ہو کر شام کو گھر آتے۔ منہ ہاتھ دھوتے۔ چائے
پیتے کہ اتنے میں سینما کا وقت آجاتا سینما کی ان کو
لت تھی۔ مینہ آئے یا آندھی مگر ان کا سینما ناغہ نہوتا

تھا۔ خود جاتے اور دوسروں کو بھی گھسیٹ کر لیجاتے
اگر کوئی اللہ کا بندہ انکار کرتا تو خفا ہو جاتے سینما سے
واپس آتے تو کھانے سے فارغ ہو کر باہر یار دوستوں
میں جا بیٹھتے۔ آدھی رات تک برج اڑتا دنیا بھر کی
باتوں پر تنقیدیں ہوتی رہتیں جب نیند کا غلبہ ہوتا تو
جا کر سو جاتے۔

ان کی گھریلو زندگی کا تو یہ نقشہ تھا۔ اب آپ ہی
فرمایئے کہ بھلا ان سے یہ توقع کیونکر ہو سکتی تھی کہ وہ
اپنے دوست احباب کی حق تلفی کر کے ہمارے لئے
کچھ وقت نکالتے۔ اب رہی بی اماں۔ تو اللہ بخشے
نہ تو وہ انگریزی داں تھیں اور نہ میموں ہی سے ان کی
ملاقات تھی مگر معلوم نہیں کیونکر ان میں ساری عادتیں
ہندوستانی میموں کی سی پڑ گئی تھیں یعنی کھانا پکانا
باورچی کے ذمے۔ سینا پرونا درزی کے حوالے۔ اوپر کا
کام پیش دست کے سپرد اور جناب والا ہماری تربیت
بی آپا کے تفویض۔ ہماری والدہ صاحبہ بس ڈائرکٹر
جنرل کی طرح بیٹھے بیٹھے تمام کاموں کی نگرانی کرتی
رہتی تھیں۔ اب آپ خود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ
آپا کے ہاتھوں ہماری تربیت کیا خاک ہوئی ہوگی۔ اول
تو وہ بیچاری جاہل اور ان پڑھ۔ اس کو بھلا کیا معلوم
کہ تربیت کس چڑیا کا نام ہے دوسرے ہم ٹھہرے
گھر کے لاڈلے آپا کو کیا خاطر میں لاتے۔ جہاں ان نے
کوئی کام ہماری مرضی کے خلاف کیا اور ہم نے دہاڑا دہاڑ
زمین پر پچھاڑیں کھانی شروع کر دیں۔ بی اماں کے
کان میں آواز گئی اور وہ جلدی جلدی آئیں اور الٹا
آپا کو ڈانٹ گئیں کہ "اے ہے بچہ کو ہر وقت رلاتی
ہی رہتی ہے۔ اری کمبخت میاں جو کہہ رہے ہیں وہ
کر دے نا۔ خواہ مخواہ بچے کو ضد دلا کر ہلکان کر رہی ہے"
چلئے فیصلہ ہوا۔ ہماری ضد پوری ہو گئی اور آئندہ
کے لئے راستہ صاف ہو گیا۔

اور بھئی ایمان کی بات تو یہ ہے کہ بیچاری آپا ہی
پر کچھ موقوف نہ تھا اللہ کے فضل سے گھر کا گھر
نورٌ علیٰ نور تھا۔ مختصر یوں سمجھ لیجئے کہ ابا میاں کی
عدم توجہی بی اماں کی مامتا اور ہماری خالہ جان کے
لاڈ نے کریلے کو نیم پر چڑھا دیا تھا۔ ہماری خالہ جان
ہم سے ضرورت سے زیادہ محبت کرتی تھیں۔ کسی
کی مجال نہ تھی کہ ہم کو ٹیڑھی نگاہ سے تو دیکھ لے۔
حد یہ کہ اگر کوئی ہم کو کسی بری بات پر بھی ٹوکتا تو ہماری
خالہ جان سے نہ رہا جاتا۔ فوراً تیوری میں بل پڑ جاتے
اور وہ فرماتیں "وہ بیچارا کیا کر رہا ہے۔ خواہ مخواہ
سب کے سب اس کے پیچھے پڑ گئے ہیں"۔ غرض یہ
کہ ابا میاں کبھی خفا ہوئے تو بی اماں کی مامتا کو

جوش آگیا اور بی اماں ناراض ہوئیں تو خالہ جان کا لاڈ کام کر گیا اور ہمارا کہا پورا ہوتا گیا اور اسی طرح رفتہ رفتہ بری عادتیں ہم میں جڑ پکڑتی گئیں اور کسی کو اس کا احساس بھی نہ ہوا۔

خیر بھئی یہ باتیں تو ایسی ہیں کہ ان کو نظر انداز بھی کیا جا سکتا ہے مگر ذرا اس ستم ظریفی کو تو ملاحظہ فرمایئے کہ ہمارے ننھے ننھے ہاتھوں سے پٹنا اور تتلانی زبان سے گالیاں سننا بڑا بھلا معلوم ہوتا تھا۔ خود بھی پٹتے اور گالیاں سنتے اور دوسروں کو بھی پٹواتے اور گالیاں سنواتے تھے اور اگر کوئی بھلا مانس اس پر اعتراض کر بیٹھتا تھا تو فوراً جواب ملتا تھا کہ "اے ہے اس کو بھی بھلا کوئی سمجھ ہے۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے بڑا ہو کر سب ٹھیک ہو جائیگا۔

جناب اب تو ہم بڑے ہو گئے۔ ٹھیک ہوئے یا نہیں اس کا حال تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ البتہ ہم کو اتنا ضرور معلوم ہے کہ غصّہ کے وقت اگر آپ کہیں تو ایک منٹ میں کم از کم بیس گالیاں فر فر سنا سکتے ہیں اور مزاج کی نازکی کا یہ عالم ہے کہ جہاں کوئی بات مرضی کے خلاف ہوئی اور ہمارا رنگ بدلا۔ کوئی غریب ہاتھ لگ گیا تو اچھا ہے ورنہ مفت میں بس چینی کے برتنوں کی شامت آجاتی ہے۔ اب آپ ہی خود فیصلہ کر لیجیے کہ ہم ٹھیک ہوئے یا نہیں؟

اور سنیئے۔ بس لاڈ کی انتہا تھی۔ یعنی ہم کو بھوک ہوتی یا نہ ہوتی زبردستی نوالے ہمارے حلق میں ٹھونسے جاتے۔ اوّل خوشامد کیجاتی۔ بہلایا پھسلایا جاتا۔ اور بالآخر جب ہم نہ کھاتے تو "لولو" یا "بیجا" سے ڈرایا جاتا۔ اگر ہم اس پر بھی راضی نہ ہوتے اور بیزار ہو کر بھاگ نکلتے تب بھی پیچھا نہ چھوٹتا یعنی ہم آگے آگے ہوتے اور کھانے کی رکابی پیچھے پیچھے۔ اور لطف یہ ہے کہ جب اس ٹھونسم ٹھانس کی بدولت ہم کو بدہضمی کی شکایت ہو جاتی تو طویلہ کی بلا بندر کے سر آتی یعنی بیچارے کلّو پر یوں نزلہ گرتا کہ "یہ موا اندیدہ کھڑا گھور رہا تھا۔ کوئی چیز ہضم ہی نہیں ہونے دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ بچّہ کا ہڈی سے چمڑا لگ گیا ہے"۔ حضرات یقین مانیے گھر والوں کا تو تھوڑی ہی دیر کا لاڈ ہو گیا یہاں ہمارا معدہ اپنی نزاکت کی انتہائی منزل کو پہنچ گیا چنانچہ اب ہماری حالت یہ ہے کہ اگر شام کو ہم ذرا زیادہ کھا لیتے ہیں تو پیٹ میں درد ہو جاتا ہے اور جناب خدا بھلا کرے اس "بیجا" کا کہ اس کی بدولت ہم ایسے بہادر بن گئے ہیں کہ رات کو پیشاب کرنے کے لئے بھی اکیلے نہیں اٹھ سکتے اور اگر خدانخواستہ کبھی کوئی سانپ بچھو نظر پڑ جائے تو بس اوسان خطا ہو جاتے ہیں

اور باہر سے کسی مرد ہی کو بلانے کی ضرورت پڑ جاتی ہے
اس سے بڑھ کر پُر لطف بات سُنیئے کہ وہم کو ہمارے
مزاج میں بڑا دخل ہو گیا ہے۔ اور یہ صدقہ ہے ہماری
خالہ جان کی شفقت اور نظر عنایت کا۔ ذرا غور تو فرمایئے
کہ جب کبھی دھوپ میں کھیلنے یا بھاگ دوڑ کرنے سے
ہمارا بدن ذرا گرم ہو جاتا تو ہماری خالہ جان کو بخار کا شبہ
ہو جاتا۔ کبھی ہاتھ دیکھتیں۔ کبھی پیٹ اور کبھی ماتھا۔ اور
زبردستی ہم کو بیمار بنا کر بستر پر لٹا دیتیں۔ اور پورا دواخانہ
ہمارے کمرہ میں آ جاتا۔ اور جو کبھی سچ مچ ہمارا درجہ حرارت
نارمل سے ایک پاؤ ڈگری بھی اوپر چڑھ جاتا تو پھر کیا
پوچھتے ہو ایک قیامت بپا ہو جاتی۔ ہر ایک اپنی اپنی
رائے پیش کرتا مگر جس رائے کو سب سے زیادہ درجہ قبولیت
بخشا جاتا وہ ہماری خالہ جان کی رائے ہوتی کہ " اسی
واسطے تو منع کرتے ہیں کہ دونوں وقت ملتے ننگے سر
نیم کے نیچے نہیں بیٹھتے "۔ چنانچہ الف سے لیکر یے تک
سب پیروں کی منت مانی جاتی اور بالآخر لال بجھکڑ
کو بلایا جاتا وہ گھر والوں کی ذہنی نبض معلوم کر کے " سایہ "
کا حکم لگاتے اور بالکل تھوڑا سا نذرانہ بدقت تمام قبول
کر کے تعویذ لکھ دیتے۔ اچھے ہو گئے تو دینے والے کی
برکت نہیں تو اللہ کی مرضی یا ہماری نیت کا قصور۔
تو جناب ایسی فضا میں پرورش پانے کے بعد
ہم سے یہ توقع رکھنا کہ ہمارے عقیدے درست ہونگے
ذرا بعید از انصاف ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہم
مجسمہ وہم بنگئے ہیں۔ تیسری تاریخ کا چاند نہیں دیکھتے
صبح کو اٹھکر روپے کے سوا دوسری چیز پہ نظر نہیں ڈالتے
زرد کپڑے کا استعمال منحوس خیال کرتے ہیں۔ سہ شنبہ
کو بال نہیں کٹواتے۔ چہار شنبہ کو غسل نہیں کرتے پنجشنبہ
کو سفر نہیں کرتے۔ غرضیکہ دن کو سوتے ہیں اور رات
کو جاگتے نہیں وقس علیٰ ھذا۔

غرض کیا بتائیں۔ ہماری تربیت کی شان ہی نرالی
تھی لاڈ ہوا تو اس شان سے کہ ہم کو بالکل بے لگام
چھوڑ دیا گیا۔ جو دل چاہا وہ کیا جس کو چاہا مارا جس کو
چاہا گالیاں دیں۔ جدھر منہ اٹھا نکل گئے۔ کبھی کسی
بات کی روک تھام نہ ہوئی حد یہ کہ ہماری بُری باتیں
بھی اچھی معلوم ہوتی رہیں مگر اب جبکہ بُری عادتیں
ہم میں راسخ ہو گئیں اور ان کی وجہ سے خود والدین
کو تکلیف ہونے لگی تو ہم پر عتاب نازل ہونے لگا
اور وہ بھی اس ٹھاٹھ سے کہ ہماری اچھی باتیں بھی
بُری ہو گئیں ظلم یہ کہ ہمارے بچپن اور انفرادیت کا
لحاظ کئے بغیر ہمارے ہر فعل کو بڑے آدمیوں کی
ذہنیت اور سمجھ کے معیار سے جانچا جانے لگا اور
اگر ہم اس معیار پر پورے نہ اترتے تو قابل سزا ٹھیرتے

چنانچہ ملاحظہ ہو۔

جب ہم کو لکھنے پڑھنے کا شوق ہوا اور بہ مقتضائے فطرت ہم نے چاک یا کوئلے سے دیوار اور میز سفید و سیاہ کرنی شروع کی تو بجائے اس کے کہ سلیٹ و پنسل دیکر ہمارے اس شوق کو جلا دی جاتی الٹی ہم پر مار پڑنے لگی یا جب ہم بچوں کی طرح اوندھے سیدھے سوال کرتے تو معقول جواب کے ذریعے ہمارے مادہ تجسس کو ترقی دینے کی بجائے جواب ملتا کہ "کیا بکواس لگا رکھی ہے۔ ایکساں ٹر ٹر کئے جاتا ہے"۔ اسی طرح جب ہم مٹی میں بیٹھکر کھلونے بناتے یا قینچی لیکر کاغذ و کپڑے کترتے پھرتے تو چاہیے تو یہ تھا کہ ہمارے اس شوق کو صحیح راستے پر ڈالا جاتا مگر اس کی بجائے ہم پر ڈانٹ پڑتی تھی۔

غرض یہ کہ تھوڑے عرصے تک تو اسی طرح ہم میں اور والدین میں رسّاکشی ہوتی رہی کبھی وہ غالب آجاتے اور کبھی ہم مگر بحیثیت مجموعی فتح ہماری ہی ہوئی کیونکہ ہم نے بارہا بی اماں کو اپنی کمزوری اور شکست کا ان الفاظ میں اظہار کرتے ہوئے سنا تھا کہ "بچے تو سبھی کے ہوتے ہیں مگر ان جیسے بچے تو ج کسی کے ہوں۔ میرا تو ناک میں دم آگیا ہے۔ ایسا بے قابو ہوا ہے کہ جس کی کوئی حد نہیں"۔

کیوں صاحب آپ ہی فیصلہ کیجیے الٹے چور والا مضمون ہے یا نہیں۔

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردئی
بازمی گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

خیر صاحب تھوڑا زمانہ تو اسی کشمکش میں گزر گیا۔ مگر جب سب گھر بار ہماری شرارتوں سے تنگ آگیا تو آخر پرانے ترکش میں سے ایک نیا تیر نکالا گیا یعنی جہاں ہم نے شرارت کی اور بی اماں نے فرمایا "اچھا بچا جی۔ ٹھیرو۔ بہت شرارت پر کمر باندھی ہے۔ لے اب تجھکو مدرسہ ہی میں بٹھا دیتی ہوں۔ وہاں استاد ڈنڈے مار مار کر اپنے آپ ٹھیک کر لینگے"۔

لیجیے صاحب یہاں سے ہماری تعلیم کا آغاز ہوتا ہے۔ آپ ہی فرمائیے کہ بسم اللہ ہی غلط ہوئی یا نہیں، یعنی جس چیز پر ہماری زندگی کا پورا دارومدار ہے اور جس سے ہم کو حقیقی شوق اور دلچسپی پیدا کرانی چاہیے تھی اسی کو ہمارے سامنے ایسی بھیانک شکل میں پیش کیا جاتا ہے کہ ہم خواہ مخواہ اس سے خائف اور متنفر ہو جاتے ہیں لیکن افسوس تو یہ ہے کہ ہمارے گھر میں کسی کو اس کا احساس بھی نہ ہوا کہ اس فقرے کا اثر ہماری زندگی پر کیا پڑا۔ اوّل اوّل تو ہم نے کچھ سمجھا ہی نہیں کہ مدرسہ کیا چیز ہے اور استاد کیا بلا ہیں جن کے سپرد

ہم کئے جانے والے ہیں مگر جب یہ معلوم ہوگیا کہ مدرسہ سے مطلب قید خانہ ہے استاد صاحب اس کے جیلر ہیں تو پھر تو ان دونوں کے نام سے ہماری رُوح ہی فنا ہونے لگی اور ہم اس سے اتنی ہی دور اور بھاگنے لگے جتنی دُور لاحول سے شیطان بھاگتا ہے۔

ہماری ابتدائی تربیت کا لب لُباب یہ سمجھ لیجئے کہ ہم گھر کے رہے نہ گھاٹ کے۔ گھر والوں کے لاڈ و پیار نے ہم کو اس قابل نہ ہونے دیا کہ زندگی کے پیچیدہ ڈرامے میں ہم باہمت لوگوں کی طرح اپنا پارٹ خوبصورتی سے ادا کرتے۔ اب تو ہماری مثال اُس اناڑی تیراک کی ہے جو دریائے زندگی میں بغیر ہاتھ پاؤں مارے پانی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ چلا جاتا ہے اور جہاں کہیں بھی جا لگے گا وہی کنارا ہو جائے گا۔

لیکن بھئی یہ سب کچھ سہی۔ مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ بچارے والدین کا بھی کوئی قصور نہیں۔ انھوں نے موجودہ زمانے کے مدرسوں اور کالجوں میں تعلیم نہیں پائی تھی کہ ان کے خیالات پر علم نفسیات کا ملمع ہوتا اور بھئی جب کسی چیز کا احساس ہی نہیں تو پھر اس کا مواخذہ کیسا۔ عدم واقفیت کا عذر قانوناً ناقابل سماعت نہ سہی مگر شاید اخلاقاً تو قابل سماعت ہو جائیگا۔ خیر آپ کچھ ہی خیال کرتے رہیئے ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ والدین کے قدم تلے جنت ہے۔ دنیا میں تو گئے گزرے ہو ہی گئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جنت سے بھی محروم ہو جائیں۔ اسلئے سارا الزام چپکے سے اپنی قسمت کے سر تھوپ دینا ٹھیک ہوگا اگر ایسا ہی ہے تو پھر آئندہ مضمون میں اسکا بدلہ نکال لینگے۔

چونچال بچے

مدیرہ کی اہم اور دلچسپ ترین تحریک

یہ اپنی طرز کا ایک بالکل جدید اور انوکھا باب ہے جسے ہمجولی میں سرِ دست آزمائشی طور پر جگہ دی جا رہی ہے اگر قوم کے روشن خیال شفیق والدین اور ہمدرد اُستادوں نے اس طرف توجّہ فرمائی اور اس کے فوائد کے مدِنظر وقتاً فوقتاً مطلوبہ اور مفید معلومات سے میری مدد کی تو اس اہم باب کو انشاء اللہ مستقل حیثیت دیدی جائے گی تاکہ بچّوں کے ذہنی اور جسمانی ارتقاء کا نہایت دلچسپ رکارڈ فراہم ہوتا رہے۔ ابتداء میں اس کے لئے والدین کو تھوڑی بہت زحمت ضرور گوارا کرنی پڑے گی مگر اپنے بچّوں کے لئے کون محنت نہیں اٹھاتا ان کے مستقبل کی درخشانی کے لئے کیا کچھ جتن نہیں کیئے جاتے، محض اس اُمید پر کہ وہ دنیا میں شادکام زندگی بسر کریں اور اپنے وجود کو دوسروں کے لئے مفید اور کار آمد بنا سکیں۔ بچّوں والا گھر مشکل ہی سے کوئی ایسا نکلے گا جہاں اُن سے دو دو اور چار چار دن کے وقفے سے کوئی نہ کوئی ایسی بات یا حرکت سرزد نہ ہو جاتی ہو جس پر والدین یا دیگر اعزہ کو بے اختیار ہنسی نہ آگئی ہو۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ اس بھولی اور معصوم مخلوق کی صرف ایک ہی بات پر ماں باپ نے ہفتوں قہقہے اڑائے ہیں اور وہ آئے گئے کے سامنے بار بار دھرائی جاتی رہی ہے مگر چونکہ وہ محفوظ نہیں کی جاتی لہٰذا کچھ ہی دن کے بعد بھلا دی جاتی ہے اور کسی کو سنجیدگی سے اس پر غور کرنے کا موقعہ نہیں ملتا کہ یہ ہوشمندی کے ستارے کی کونسی کرن تھی؟ لیکن جن والدین کو خدائے کریم نے عقلِ سلیم عطا فرمائی ہے وہ "ان ہی ذرا ذرا سی باتوں کے ذریعے اپنے بچّوں کی ترکیبِ نفسی سے پوری واقفیت حاصل کر لیتے ہیں اور ان کی ہر جہتی فلاح و ترقّی کے لئے ایسے وافر سامان پیدا کر دیتے ہیں جن کی بدولت ان کی ذہنی قوتیں بتدریج ترقّی پا جاتی ہیں۔

پستالوزی Pestalozzi کی یہ رائے بالکل درست ہے کہ بچّہ کی تعلیم درحقیقت گہوارے ہی سے شروع ہو جاتی ہے، وہ لیٹے ہی لیٹے اپنے گردو پیش کو گھورتا رہتا ہے۔ جو چیز اس کے ہاتھ لگ جاتی ہے اسے ٹٹولتا ہے اور چوسنا شروع کردیتا ہے۔ یہ گویا ابتداء ہوتی ہے اُس انتہا جس کی بدولت یہی ننھے اور شیرخوار بچے کسی وقت دنیا کے زبردست مہندس بن جاتے ہیں یہی ایسے سیّاروں کی تحقیقات کرتے ہیں جو نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں۔ یہی بے تار برقی کے پیغام پہنچاتے ہیں اور انہی کی بدولت وہ تمام ترقیاں نصیب ہوتی ہیں جو آج ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بچے کے قوائے جسمانی اور دماغی کے اعمال وظائف قدرتی اور اٹل ہوتے ہیں لیکن والدین کی نشوونما نگہداشت سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہے اور جس بچے کی دماغی اور ذہنی کیفیات کا بنظر غور مطالعہ کیا جاتا ہے اس کی ایک ایک حرکت کا مشاہدہ کرکے اس سے مختلف نتائج اخذ کئے جاتے ہیں، اُس کی اُفتادِ طبیعت سے پوری واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو اس سے نہ صرف اس کے فطری رجحانات کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے بلکہ اس کے دماغی توانائی کے سرچشموں کے بہاؤ کے لئے ایسے صحیح راستے پیدا کئے جاسکتے ہیں۔ جن سے اس کی عملی زندگی پُر بہار بن سکتی ہے۔

درختوں سے پھل پھول ہمیشہ جھڑتے رہتے ہیں جس میں بظاہر کوئی انوکھی بات نہیں معلوم ہوتی مگر **اسحاق نیوٹن** Issac Newton بھی ایک سیب گرتا ہوا دیکھ لیتا ہے گو بات ذرا سی ہوتی ہے مگر بات کا بتنگڑ بن جاتا ہے اور قدرت کے اس زبردست قانون کا پتہ چل جاتا ہے جس کے بل بوتے پر آج سارا نظام عالم قائم ہے۔ یہی اسحاق بچپنے میں کوڑھ مغز سمجھا جاتا تھا مگر اس کی تربیت اور ذاتی محنت نے اس کی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کردیا اور اب رہتی دنیا تک اس کا نام روشن رہے گا۔

ایک عرب بچے کو اتفاقاً بھڑ کاٹ لیتی ہے وہ بلبلا اٹھتا ہے، باپ وجہ پوچھتا ہے مگر وہ بھڑ کے نام سے واقف نہیں ہوتا اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ کس چیز نے اسے کاٹ لیا وہ صرف یہ کہتا ہے کہ مجھے ایک ایسے کیڑے نے کاٹ کھایا ہے جو "مخطط چادر" میں لپٹا ہوا تھا، یہ سنتے ہی باپ خوشی سے اچھل پڑتا ہے اور بے ساختہ، پکار اٹھتا ہے کہ "واللہ یہ بچّہ شاعر ہوگا" چنانچہ یہی وہ لڑکا تھا جو آج **ابن رشیق** کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جس کی شاعری کی دھوم

مچی ہوئی ہے۔

دُور کیوں جاؤ ابھی حال کا واقعہ ہے کہ موجودہ شہزادۂ ویلز کی غالباً آٹھویں سالگرہ تھی جس کی تقریب میں ملک معظم نے ایک مختصر سا ڈنر ترتیب دیا تھا اس میں صرف خانوادۂ شاہی کے اراکین اور ملازمینِ خاص مدعو کیئے گئے تھے۔ ڈنر کے اختتام پر شاہزادۂ موصوف کو مختلف تحائف دئے گئے مگر ملک معظم نے ایک چھوٹی سی تلوار دیتے ہوئے شاہزادے سے فرمائش کی کہ موقعہ کی مناسبت کا لحاظ کرتے ہوئے کوئی تقریر کرو۔ چنانچہ شہزادے نے تعمیل حکم میں ایک مختصر سی تقریر کی اور ان الفاظ کے خاتمے پر تلوار کمر میں حمائل کر لی:

"یہ ننھی سی تلوار جو جلالتآب نے مجھے عنایت فرمائی ہے میری کمر کی زینت کے لئے نہیں ہے۔ میں اس سے کام لونگا۔ یہ ملک و قوم کی حفاظت کے کام آئے گی۔ میں اس سے تاج اور تاجدار کی نگہبانی کروں گا اور جب تک میں زندہ ہوں اسے عزیز رکھوں گا اور یہ مجھسے جدا نہ ہوگی!"

حاضرین پر اس مختصر مگر پرجوش تقریر کا بڑا اثر ہوا اور مدتوں اس تقریر دلپذیر کے چرچے ہوتے رہے چنانچہ ملک معظم نے ایک موقعہ پر آخر یہ کہہ ہی دیا کہ "یہ تقریر بڑی برجستہ اور دلنشین تھی اگر میں خود شاہزادے کی جگہ ہوتا تو یقیناً ایسی تقریر نہ کر سکتا۔"

یہ واقعہ ہے کہ بچے عموماً نہایت صحیح الدماغ اور حاضر جواب ہوتے ہیں، ان کی معصوم اور بالی روحوں میں ذہنی اور اخلاقی قوتوں کی نمو کا ہیجان ہوتا ہے، وہ ایسی فردوسِ خیال میں زندگی بسر کرتے ہیں جہاں افکار و حوادث بار نہیں پا سکتے۔ وہ رسم و رواج کی قید و بند سے آزاد ہوتے ہیں، اسی لئے وہ اپنے خیالات کے اظہار میں بے باک ہوتے ہیں۔ بناوٹ اُن کو نہیں آتی اور ان کا دماغ جہاں تک یاوری کرتا ہے اپنی حسب استطاعت وہ اظہار خیال میں کسی تصنع سے کام نہیں لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ چھوٹے بچوں کی پیاری پیاری باتیں سادگی اور صداقت کا مجسمہ ہوتی ہیں۔ ان کی خوش فعلیوں اور معصوم شرارتوں پر پیار آتا ہے ان کی ہر ادا دل میں ایک سرور پیدا کرتی ہے مگر جوں جوں ان کے قوائے عقلیہ میں ارتقاء ہوتا رہتا ہے اور وہ اپنے ماحول کے اثرات قبول کرتے چلے جاتے ہیں ان کی ہر معصومانہ ادائیں بھی بتدریج انقلاب پیدا ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ ان کی

زندگی میں ایک وقت ایسا آتا ہے جب کہ وہ دنیا کے دھندوں میں پھنس کر اس کی آلائشوں میں تیر جاتے ہیں۔ امتداد زمانہ بچپن کی یاد کو دفتر پارینہ بنا چکا ہوتا ہے اور اگر احیاناً کبھی اسے یاد کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے تو اسے عہد طفلی کے صرف ایسے مٹے ہوئے نشانات نظر آتے ہیں جن سے وہ کوئی اندازہ نہیں کر سکتا کہ اس کا ماضی کس طرح گذر گیا۔ اس کے والدین نے مستقبل کی تشکیل کے لئے کیا کیا موثر تدابیر اختیار کیں، اور اگر وہ اس کی افتاد طبیعت سے واقف ہو کر مفید اور کارگر تدابیر اختیار کرتے تو صورت حال کیا ہوتی؟

قدرت نے والدین کو بچوں کے حق میں اپنے "کارکن اور ترجمان" کی سی حیثیت عطا کر رکھی ہے لہٰذا ان کی پرورش اور تربیت کی جو اہم ذمہ داریاں ان پر عاید ہوتی ہیں انھیں کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس جگہ ان کی تفصیل ضروری نہیں البتہ موقعہ بہ موقعہ انشاء اللہ ان پر روشنی ڈالی جا سکے گی۔

سر دست جس پہلو پر زور دینا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ والدین کو اپنے بچوں کی ابتدائی حالت سے ان کے مستقبل کے اندازے کی پوری کوشش کرنی چاہیئے چنانچہ اس باب کے قیام کی ضرورت اسی لئے لاحق ہو رہی ہے کہ نہ صرف والدین بلکہ اساتذہ نیز دیگر متعلقین کو بھی بچوں کی افتادِ طبیعت اور فطری رجحانات کا خاص طور پر مشاہدہ اور تجربہ کرنا چاہیئے تاکہ بچوں کے جذبات و خیالات، ان کی قابلیت و صلاحیت اور ان کے مستقبل کی ضرورتوں کا صحیح صحیح اندازہ ہو سکے اور اگر اس فریضے کی اس ابتدائی حالت ہی میں پورے پورے طریقہ پر بجا آوری ہوگی تو گویا والدین حقوقِ اولاد کے بہت سے اہم فرائض سے قبل از وقت ہی سبکدوشی حاصل کر سکیں گے۔

وہ ہمدرد والدین جنھیں اپنی اولاد سے ذرا سی بھی محبت ہوگی اور جنھیں ان کی فلاح و بہبودی کا کچھ بھی خیال ہوگا اُمید ہے کہ اس اہم تحریک کو نہایت غور اور دلچسپی سے پڑھیں گے اور "ہمجولی" کی ان بے لوث کوششوں کو کامیاب بنانے کے لئے مطلوبہ مواد کی فراہمی کا فوری بندوبست شروع کر دیں گے جو "ہم خرما و ہم ثواب" کے مصداق نہ صرف خود ان کی تفریح طبع کا باعث ہوگا بلکہ ان کے معصوم اور سمجھدار بچے بھی ان کی اس ذرا سی محنت کو محبت سے یاد کریں گے اور والدین کی یہ حقیر زحمت بچوں کے حق میں ایک دن رحمت ثابت ہوگی اور





امّن میاں سلمہٗ پہلی سالگرہ پر

The Hyderabad Printing Works.

یہ وہ ترکہ ہوگا جس کو والدین اپنے ذرا سے ایثار سے بچوں کے حق میں گرانبہا بنا سکتے ہیں۔

آپ کی کوشش، آپ کا ایثار یا جو کچھ بھی اسے کہا جاسکتا ہے وہ صرف یہ ہوگا کہ آپ اپنے یا اپنے عزیزوں دوستوں اور ہمسایوں کے بچوں کے دلچسپ لطیفے، دلغریب مکالمے، ان کی شوخیاں اور معصوم شرارتیں، ان کی حاضر جوابیاں، ان کی تیزی فہم کے حالات، ان کی ذکاوت اور مشاغل کی داستانیں، ان کے کھیلوں کے طریقے، ان کی من گھڑت کہانیاں ان کی اختراعات وایجادات کی طبع آزمائیاں ان کے ڈرائنگ اور نقشہ کشی کے نمونے، نیز دیگر ذہنی اور عقلی انکشافات کی داستانیں غرض بچوں کی ہر متعلقہ چیز جسے آپ دلچسپ سمجھتے ہوں "پھول" میں طبع ہونے کے لئے آپ بار بار بھیجتے رہیں تاکہ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ ان کے عقلی اور ذہنی قواء کے ارتقاء کا بہترین ریکارڈ فراہم ہوتا رہے۔ اس سے آئندہ جو جو فواید حاصل ہوں گے زمانہ خود بتادے گا مگر سب سے اہم اور فوری فائدہ جسے معمولی عقل و فراست کا انسان بھی بخوبی سمجھ سکتا ہے یہ ہوگا کہ بچوں کی مخصوص ترکیب ذہنی پر آپ کو پوری دستگاہ حاصل ہو جائے گی اور اس طرح اپنے مشاہدے اور تجربے سے آپ اپنے بچوں کے لئے دین اور دنیا دونوں کی نعمتیں فراہم کر سکیں گے۔

اس باب میں بچوں کے ایسے حادثات بھی خاص طور پر درج کئے جائیں گے جن سے خدانخواستہ انھیں دوچار ہونا پڑا ہو اور اُن تدابیر کا بھی ذکر ہوگا جو ان کے دفعیے کے لئے اختیار کی گئیں ہوں۔ اس قسم کا اندراج دوسرے والدین کے لئے مشعلِ ہدایت ہوگا اور انھیں طرح طرح کی پریشانیوں سے بروقت نجات دلا سکے گا۔ بہت سے گھریلو علاج اور سہل الحصول معالجے ایسے ہیں جن سے صرف بڑی بوڑھیاں ہی خوب واقف ہوتی ہیں اور ان کے سونف وپودینے میں اس بلا کا جادو ہوتا ہے کہ ادھر بچوں کو استعمال کرایا گیا اور اُدھر اُن کی حالت روبہ اصلاح ہوئی۔ باقی دارد۔

یہ مضمون عدم گنجایش کے سبب پورا نہ آسکا تاہم اظہارِ مدعا کے لئے یہ کافی ہے۔ اگلے پرچے میں اپنے بڑے لڑکے ان اللہ خاں خوشگی (امن میاں) کے کچھ دلچسپ لطیفے اور حالات بطور نمونہ لکھوں گی جس کی تصویر آج شایع کر رہی ہوں امید ہے کہ دیگر بہن بھائی اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے اپنے بچوں کی تصویریں اور لطائف وغیرہ ضرور روانہ کریں گے۔

نقشہ کشی

یہ ثابت ہوچکا ہے کہ بچّوں کی عقلی تربیت کے لئے سب سے پہلے انھیں اشکال۔ تصویریں اور نقشے دکھائے جائیں اور جب وہ اُن کو خوب سمجھنے لگیں اور ان کے متعلّق ہر سوال کا جواب دے سکیں تو اس سے اندازہ کرلینا چاہیئے کہ اب اِن میں اپنے ماحول کو سمجھنے کی قوت پیدا ہوچلی ہے۔ یہ بچّوں کی عقلی تربیت کا گویا پہلا قدم ہوتا ہے
اس کے بعد بچّوں کو قلم کاغذ دیا جائے جس کا وہ طبعاً مطالبہ کرتے ہیں تاکہ اس کے استعمال سے ان کو اپنی انگلیوں پر قابو حاصل ہوجائے۔ اس میں کچھ عرصہ لگے گا اور ان میں حسب مرضی لکیریں کھینچنے کی جب قوت پیدا ہوجائے تو انھیں سب سے پہلے رنگوں کا ڈبہ اور برش دئے جائیں تاکہ وہ بے تکلّف رنگ آمیزی کرتے رہیں اس کے لئے بہتر ہے کہ باتصویر پُرانے رسالے اور میگزین دئے جائیں تاکہ وہ ان کی تصویروں پر رنگ بھرتے رہیں حتیٰ کہ ان کو رنگوں کی پہچان ہوجائے اور جب بچّوں کو رنگوں کے استعمال کا کچھ سلیقہ پیدا ہوجائے تو ان کے لئے ایسی کتابیں فراہم کی جائیں جن پر محض سادے خاکے ہوں تاکہ بچّے حسب مرضی ان میں رنگ بھرتے رہیں ایسی کتابیں چونکہ قیمتی ہوتی ہیں اور ہر بچّے کے لئے نہیں خریدی جاسکتیں لہٰذا "ہمجولی" میں اس قسم کے خاکوں کا انتظام کیا گیا ہے ہر پرچے کے ساتھ اس قسم کا خاکہ شریک رہے گا اور بچّوں کو اختیار رہے گا کہ جس قسم کا رنگ چاہیں اس میں بھریں اور اسے مکمل کرکے اپنا نام اس خاکے کی پشت پر لکھدیں۔ اس خاکے میں بہترین رنگ بھرنے والے کو پانچ روپیہ انعام دیا جائے گا۔ یہ نقشہ کشی کے لئے ابتدائی چیز ہے انشاءاللہ رفتہ رفتہ اس میں تبدیلی اور ترقی ہوتی جائے گی اور اسی طرح انعاموں میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ بہرحال رنگ بھرنے میں صفائی اور سلیقے کا خاص لحاظ رہے اور اس کے لئے دو ایک خاکے خراب بھی ہوجائیں تو پرواہ نہ کی جائے۔ یہ رنگ بھرے ہوئے خاکے ہمارے پاس ہر انگریزی مہینے کی بیس ۲۰ تاریخ تک آجانے چاہئیں تاکہ اگلے پرچے میں انعام حاصل کرنے والے کا نام دیا جاسکے۔

ادارہ

ہمجولی بابتہ ماہ مہر ۱۳۴۰ف م اگست ۱۹۳۱ء

جلد (۱) | ترتیب: سیدہ بیگم خویشگی۔ فتح میدان حیدرآباد دکن | نمبر (۲)

عہد آفرین پریس میں چھپکر دفتر رسالہ ہمجولی سے شایع ہوا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہیولی

للّٰہ الحمد ہر آن چیز کہ خاطر میخواست
آخر آمد ز پسِ پردۂ تقدیر پدید

ہیولی کا پہلا نمبر شایع ہوا اور خدا کا شکر ہے کہ اس کو توقع سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ ہم ان تمام علم دوست حضرات اور خواتین کے بے انتہا ممنون ہیں جنھوں نے ازراہِ تلطف اس ماہ نامے کا پرتپاک خیر مقدم فرما کر نہ صرف ہماری حوصلہ افزائی فرمائی بلکہ ان مقاصد کے وقوف پر بے انتہا اظہار پسندیدگی بھی فرمایا ہے جن کے تحت مدت کے غور و فکر کے بعد ہیں **ہیولی** کے اجرا کا موقع نصیب ہوا ہے۔ خدائے لایزال ہمیں اپنے ارادوں میں استقامت بخشے اور اپنے ظلِ عاطفت میں ایسے مواقع اکثر و بیشتر عطا فرمائے کہ اس ابتلا اور آزمایش کے دور میں ہم ملک و ملت کی اِن خدمات کو قرار واقعی انجام دیکیں جن پر ہمارے مستقبل کی درخشاں کا فی الحقیقت دار و مدار ہے۔ آمین!

ملک کے مایۂ ناز انشا پرداز اور معزز معاصرین ہیولی کو ملاحظہ فرمانے کے بعد جن دلچسپ اور قیمتی آرا کا اظہار فرما رہے ہیں انھیں ہم اگلے نمبروں میں سلسلہ وار شائع کرنا چاہتے ہیں تاکہ نہ صرف ہمارے مقاصد کی مزید وضاحت ہوتی رہے بلکہ آپ کو یہ بھی معلوم ہوتا رہے کہ یہ رسالہ کامیابی کی کس منزل میں ہے اور اس کی روز افزوں ہر دلعزیزی میں کس قدر اضافہ ہو رہا ہے: نموناً ذیل کی عبارت معزز سرگزشت سے نقل کی جاتی ہے جو علی گڈھ کے کھلنڈروں کا

ایک زبردست اور بلند بانگ ارغنوں سمجھا جاتا ہے۔ خوش نوائی اور شیریں مقالی کے ساتھ اسے آموں اور ڈنڑوں سے بھی بڑی دلچسپی ہے اور یہ خبر سُن کر غالباً معاصر موصوف کو بہت طمانیت حاصل ہوگی کہ اب مخدومی مولوی عبدالحق صاحب نے بھی اپنی نئی لغت میں اس خاص دلچسپی اور ذوق " ابیقوری " کو فنون لطیفہ کی شق میں داخل فرمانے کا تہیّہ فرمالیا ہے اس لئے اصولاً ہر وہ شخص آرٹسٹ یا پروفیسر کہلانے کا مستحق ہوسکتا ہے جو اس فن لطیف میں کچھ بھی مہارت رکھتا ہو۔ اب معاصر موصوف کی " لے " ملاحظہ ہو:۔

بغداد ثانی یعنی حیدرآباد دکن سے رسالہ " ہجو لی " شائع ہوا ہے۔ کیا ہی دلکش نام ہے اور کیسی پیاری صورت ہے۔ صورت کے ساتھ سیرت بھی ماشاءاللہ خوب ہے، جو مضمون ہے اپنے رنگ میں یکتا اور نصیحت آمیز و پرکیف ہے۔ از حمد تا ح ایک گلدستہ ہے جس کا ہر پھول خوشبودار و خوش رنگ ہے۔ ٹائٹل پیج بھی ایسا کہ جس پر یہ مصرع پورا پورا صادق آتا ہے:

"اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا!"

صفحہ ۵ پر فخر قوم، ایثار مجسم جناب نواب ڈاکٹر مسعود جنگ بہادر کا بلاک فوٹو ہے اور حیدرآباد کے زمانۂ قیام کے حالات و موجودہ کارناموں کا مختصر تذکرہ ہے۔ اور بھی فوٹو نقشے ہیں غرض کہ جس پہلو دیکھئے بے ساختہ زبان سے یہی نکلتا ہے کہ ہندوستان میں یہ اپنے رنگ و طرز کا سب سے بہتر ماہانہ پرچہ ہے۔ محترمہ جنابہ سیدہ بیگم صاحبہ خویشگی کی محنت، قابلیت اور خوش مذاقی کی جس قدر بھی داد دی جائے کم ہے۔ ہماری دعا ہے کہ خدائے پاک اس کو حوادثات زمانہ سے محفوظ رکھے اور دن دونی رات چوگنی ترقی دے آمین

نوٹ " سمدھن کا گڈا " جناب پروفیسر عبدالمجید خاں صاحب کلیہ جامعہ عثمانیہ کی یہ نظم پڑھنے کے قابل ہے جو ہجو لی کے صفحہ ۵۲ پر درج ہے۔"

یہ لطیف تنقید ہم نے نہایت خوشی اور دلچسپی سے پڑھی لیکن اطمینان کا سانس اسی وقت لیا جب یہ یقین کرلیا کہ اس میں کسی جگہ یادش بخیر یہاں کے " بگھارے بینگنوں " اور ملغوبہ آموں کا کوئی " سخن " درمیان نہیں آیا ہے۔

کس منہ سے شکر کیجئے اس لطف خاص کا

پرسش ہے اور پائے " سخن " درمیاں نہیں!!

گزشتہ ہفتے امریکہ کی ڈاک میں نیو یارک سے ہمیں محترمہ مسز مائیکل پم Mrs. Michael Fym کا ایک مکتوب موصول ہوا ہے جس میں آپ نے اپنی مشہور کتاب "The Power of India" کا حوالہ دیتے ہوئے ذیل کی سطور سپرد قلم فرمائی ہیں :-

"یہ کتاب کیا ہے ہندوستان سے میری محبت کا ایک غیر مکمل اظہار ہے۔ میں ایک مسلمان خاتون ہوں اسی لئے حیدرآباد سے مجھے بطور خاص دلچسپی ہے اور میں بہ فخر یہ کہہ سکتی ہوں کہ بلحاظ تقابل دنیا کی دیگر اسلامی سلطنتوں سے حیدرآباد کا نظم و نسق سب سے بہتر ہے جسے خاندان آصفیہ کا طرۂ امتیاز کہا جاسکتا ہے یہی وجہ ہے کہ آج تک نہ صرف مغلیہ سلطنت کی اعلیٰ روایات قائم ہیں بلکہ اس خانوادے کی وجاہت نسبی بھی بوجوہ احسن بحال و برقرار ہے ....

میں آج کل "دی انڈیا اکاڈمی آف امریکہ" کی واشنگٹن کمیٹی کے صیغۂ تنظیم کی معتمد ہوں جس کے باعث مجھے اکثر و بیشتر ایسے اصحاب سے ملنے کا اتفاق ہوتا رہتا ہے جو ہندوستان سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

خاندان ٹیگور کے ایک علم دوست بزرگ دبستان[1] مذکور کے بانی اور ناظم اعلیٰ ہیں جن کا اسم گرامی ڈاکٹر جے۔ جی چڑجی ہے۔ ڈاکٹر ول بر Dr. Wilbur وزیر داخلہ، واشنگٹن کے بشپ فریمین Bishop Freeman پال کریوتھ Paul Cravath امریکہ کے مشہور ماہر مالیات اور پروفیسر جان ڈیوے Prof. John Dewey نیز دیگر اصحاب ادارہ ہذا کے سرپرست ہیں۔

ہمارا مقصد ہے کہ امریکن جامعات اور دیگر ذرائع سے ہم ہندوستان کے تہذیب و تمدن کو ترقی دیں، ہندوستان سے اساتذہ اور طلبار کا تبادلہ باہمی عمل میں لائیں اور اس کا پتہ لگانے میں مصروف رہیں کہ ہندوستان اور دیگر ممالک کی تہذیب و تمدن کا آپس میں کیا رابطہ ہے یا ہندی تہذیب سے اور کون سے تمدن پیدا ہوئے۔ ہندی تہذیب سے ہماری مراد صرف ہندو یا بودھ مَتی تہذیب نہیں ہے بلکہ اسلامی تہذیب و تمدن کو بھی ہم اس کا جزو لاینفک سمجھتے ہیں۔ غرض اس طریقے پر ادارہ مذکور میں ہم مختلف شعبے قائم کرتے چلے جاتے ہیں اور جس طرح ہم نے اب تک ہندو و بودھ فلسفے کی پروفیسروں

---

[1] اس کے لئے براہ کرم اگلا نوٹ ملاحظہ ہو۔

کو مدعو کیا ہے امید ہے کہ اسی طرح اسلامی فلسفے اور علوم وفنون کے ماہر بھی ہیں دستیاب ہوسکیں گے اور دبستان مذکور میں یہی ایک چیز ایسی ہے جس سے مجھے بے انتہا شغف ہے۔ سیاست تفرقہ ڈالتی ہے لیکن علم اور اس کے تعمق سے ایسا رشتہ قائم ہوسکتا ہے جو محبت و آشتی پیدا کرسکتا ہے

یہ سن کر آپ مسرور ہوں گی کہ میری کتاب کے شائع ہونے کے بعد حکومت فرانس نے مجھے Officier d'Academie کے معزز خطاب سے سرفراز کیا ہے جو فنون لطیفہ اور تعلیم عامہ سے متعلق سب سے اعلیٰ خطاب ہے۔

مس میو کی رسوائے زمانہ کتاب "مدر انڈیا" تو آپ نے دیکھی ہوگی لیکن آپ مسز مائیکل پم کی تصنیف "پاور آف انڈیا" بھی ملاحظہ فرماویں جس میں امریکہ کی اس مشہور اخبار نویس خاتون نے ہندی تصویر کے ہر دو پہلوؤں پر اس خوبی سے روشنی ڈالی ہے کہ اس کا کوئی خد وخال غیر متناسب نہیں ہونے پایا۔

قارئین کرام کی تفریح طبع کے لئے بطور نمونہ ہم اس کتاب کے ایک نہایت ہی دلچسپ باب کا آزاد ترجمہ عنقریب پیش کرنے والے ہیں جس میں محترمہ موصوف نے ہندوستان کی سب سے بڑی اسلامی ریاست حیدرآباد کے متعلق ایک پرمغز اور معرکۃ الارا مقالہ تحریر فرمایا ہے جو انگریزی ادب کا بے مثال نمونہ ہے اور اس کے لئے آپ نے ازراہِ تلطف ہمیں بطور خاص اجازت بھی عطا فرمائی ہے کہ "ہمجولی" میں یہ ترجمہ شائع کر دیا جائے جس کے لئے ہم اپنی عزیز بہن کے بے انتہا ممنون ہیں۔

ہمیں یاد پڑتا ہے کہ آج سے بارہ پندرہ سال پیشتر غالباً لاہور کے رسالہ مخزن میں بڑی گرما گرم بحثوں کے بعد اکاڈمی Academy کا ترجمہ "سبھا" تجویز کیا گیا تھا اور خواہش ظاہر کی گئی تھی کہ اسے عام طور پر رواج دیا جائے لیکن آج کل من مانے طریقوں پر اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے جس کے باعث اس کا حقیقی مفہوم بھی غائب ہوگیا ہے۔ اکاڈمی دراصل زمانہ قدیم میں ایک باغ تھا جو خطہ یونان کے شہر ایتھنز کے قرب وجوار میں واقع تھا۔ کہا جاتا ہے کہ افلاطون اسی مقام پر اپنے شاگردوں کو درس دیا کرتا تھا اور اسی مناسبت سے یورپ کی اکثر زبانوں میں اس قسم کے ادارے کو جہاں علوم وفنون کا چرچا ہو اب بھی اکاڈمی ہی کہا جاتا ہے۔ معلوم نہیں کہ عربوں نے اس تاریخی یادگار سے کیوں بے التفاتی برتی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشرقی زبانوں میں یہ لفظ آج تک بار نہ پا سکا۔

فرانسیسی یا انگریزی توسّط سے یہ لفظ ہندوستان آیا اور جب اس کی جامعیت پر نظر پڑی تو ہمیں اس کی قدر معلوم ہوئی بہتیرا کوشش کی کہ اس کو توڑمروڑ کر ہندیا لیا جائے لیکن یہ ٹیڑھی کھیر نکلا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ صدیاں گذر جانے کے بعد بھی اکاڈمی " اکاڈمی " ہی باقی ہے۔ ہماری طبع رسا نے اگر بہت زور مارا تو کہیں اسے" سبھا" بنا دیا یا " بزم " کی رونق بخش دی ورنہ دار، درا شعبہ، انجمن، قصر، دائرہ اور ادارہ ایسی اصطلاحیں گڑھ لیں جن میں وہ بات کبھی نہ آسکی جو اکاڈمی میں موجود ہے۔

ہمارے ادب میں ایک لفظ بے تکلّف استعمال کیا جاتا ہے جو " ادب " اور " ستان " کو ترکیب دیکر بنایا گیا ہے لیکن " دبستان " کہلاتا ہے۔ اس کی معنوی خوبیوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علوم، فنون اور ادب کی مناسبت کا لحاظ کرتے ہوئے دبستان اور اکاڈمی میں ایک خاص نفسیاتی رشتہ موجود ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ اکاڈمی کا ترجمہ دبستان نہ کیا جائے۔

ممکن ہے کہ آپ اس کے لئے بھی حسبِ دستور کسی شاعر غرّہ کی سند کا حیلہ کر جائیں کیونکہ بغیر اس کے ہماری اردو کا مریل ٹٹو ایک قدم آگے نہیں بڑھتا تو اسے بھی پیش کئے دیتے ہیں۔ سُنیئے! سید انشاء اللہ خاں انشا اس اکاڈمی والے غریب افلاطون کے متعلق فخریہ فرماتے ہیں:۔

ایک طفلِ دبستاں ہے فلاطوں مرے آگے
کیا منہ ہے، ارسطو جو کرے چوں مرے آگے

اب صرف ایک بات رہ جاتی ہے اور وہ " دبستاں " کو موقع سے کھپانا ہے تو یہ چیز آپ کی خوش مذاقی پر منحصر ہے ہمجولی کو اس سے سروکار نہیں۔

اسی سلسلے میں لگے ہاتھ Loud speaker کے ترجمے کے جھگڑے کو بھی ہم نمٹا دینا چاہتے ہیں جس نے کچھ دن سے اردو زبان میں بڑا سر اٹھا رکھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی من چلے نے اس کا ترجمہ " آلہ مکبر الصوت " کر ڈالا تھا بس کیا تھا پکی پکائی جو ملی تو اس کو پر لگ گئے اور اب یہ حال ہے کہ شاید ہی کوئی ایسا منحوس دن جاتا ہو گا جو ان مکبر الصوت صاحب کی صورت روز اخبارات میں نظر نہ آجاتی ہو۔ انگریزی داں طبقے کو تو بھلا اس ترجمے کے جھمیلے سے کیا واسطہ انھوں نے لاوڈ اسپیکر کہا اور مطلب حاصل ہو گیا لیکن مشکل ان لوگوں کی ہے جو نہ لاوڈ اسپیکر سمجھتے ہیں۔

اور نہ آلہ مکبر الصوت تو پھر اس تیر مارنے سے فائدہ ؟

ہم نے اس عجوبہ روزگار اور ثقیل ترجمے کو اردو اخبارات میں پڑھا ہے اور خوب پڑھا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ارتقائی منزلیں ابھی تک پورے طور پر طے نہیں ہونے پائی ہیں جس کی وجہ سے اسے ہر روز اخباروں میں نت نئی شکلوں میں جلوہ افروز ہونا پڑتا ہے۔ بکبر الصوت۔ مکبر الصورت۔ تکبر الصوت وغیرہ تو خیر کوئی ایسی قابل گرفت چیزیں نہیں تھیں۔ البتہ ایک اخبار نے اس لاوڈ اسپیکر کا جو بامحاورہ اور سلیس ترجمہ اپنے قارئین کرام کی خدمت میں پیش کیا تھا وہ ایسا مقطع تھا جسے دیکھتے ہی جی باغ باغ ہوگیا۔ اس میں خیر سے کسی کا اتباع بھی نہیں فرمایا گیا تھا بلکہ اپنی اجتہادی ترنگ میں اس مکبر الصوت کو صرف "تکبیر الصلوات" کا جبہ عنایت فرما کر کاتب بیچارے کو راندہ درگاہ بنانے کی تدبیر سوچ لی تھی بہر حال اب اس غتربود کا خاتمہ ہوجانا چاہیئے اور اس کے لئے ایک ایسا لفظ تلاش کرنا چاہیئے جو عام پسند ہوکر زبانوں پر رچ جائے۔

آپ نے لفظ "بھپارا" تو سنا ہوگا جس کی اصلی شکل (بھاپ + ارا) تھی مگر کثرت استعمال سے بھپارا ہوگئی۔ اسی طرح لفظ گونج کو لیجیئے اور اس میں "ارا" کے لاحقے کو شریک کردیجیئے تو (گونج + ارا) ہوجاتا ہے لیکن یقین ہے کہ کثرت استعمال سے یہ بھی گنجارا ہوجائے گا۔ تو پھر اگر ابھی سے لاوڈ اسپیکر کی بجائے "گنجارا" استعمال کیا جائے تو کیا قباحت ہوگی۔ آپ خود غور کر لیجیئے کہ آلہ مکبر الصوت آلہ نشر الصوت یا تکبیر الصلوات اور اس گنجارے میں کیا چیز مابہ الامتیاز ہے اور ان ناموں میں سے کونسا نام ایسا ہے جو مناسب مفہوم کے ساتھ عام طور سے زبانوں پر بے تکلف رواں ہوسکتا ہے۔ بہرصورت یہ دو چیزیں برسبیل تذکرہ آپ کی خدمت میں پیش کردی گئیں تھیں اگر یہ چل نکلیں تو خود قبولیت کی دلیل بن جائیں گی ورنہ اردو بےچاری میں رکھا ہی کیا ہے:

اطلاع حضرت اقدس و اعلیٰ کی شبیہہ مبارک تیار ہے جو بمبئی سے حسب وعدہ آج وصول ہوجانی چاہیئے تھی جس کے لئے پرچہ کی اشاعت بھی روکی گئی مگر آج بھی نہ آئی اس لئے مجبوراً بحالت موجودہ ہجو لی شائع کیا جارہا ہے اور اگلے پرچہ میں یہ شائع کی جائے گی۔ قلت گنجایش کے سبب "نقشہ کشی" اور انعام کے متعلق بھی نوٹ نہ آسکے بچے اس دئے ہوئے خاکے میں رنگ بھریں اور ۵ ستمبر تک اپنا حل بھیجدیں تو سب سے بہتر حل کرنے والے بچے کو پانچ روپے دئے جائیں گے۔ ادارہ

اپنے اللہ سے

از جناب صاحبزادہ عبدالستار بیگ تیموری بی اے، ایم آر اے ایس لنڈن

الٰہی تو کہ ہے زیبندۂ شانِ خود آرائی ۔۔۔ الٰہی تو کہ ہے زینت دہِ اقلیمِ یکتائی

الٰہی تو کہ پردہ دار ہے خدّامِ عاصی کا ۔۔۔ الٰہی تو کہ ہے بخشندہ ہر اہلِ معاصی کا

شہنشاہوں کے سر جھکتے ہیں تیرے آستانے پر ۔۔۔ تری چشمِ کرم رہتی ہے یارب اک زمانے پر

ملائک، جن، پری، انسان، حورینِ باغِ جنت کی ۔۔۔ بندھی ہے سب کی گردن میں رسن تیری طاعت کی

سوا تیرے قدیر و قادر و سبحان ہے کوئی؟ ۔۔۔ سوا تیرے بصیر و ناصر و رحمان ہے کوئی؟

نہیں ہرگز نہیں، کوئی نہیں، ہاں صرف تو ہی ہے ۔۔۔ الٰہی ایک ربُّ العٰلمین۔ ہاں صرف تو ہی ہے

تو پھر اس بندۂ عاصی کی بھی کچھ داستاں سن لے ۔۔۔ کہانی رنج و غم کی درد دل کا کچھ بیاں سن لے

نگاہِ لطف ہو جائے بحق احمدِ مرسل ۔۔۔ بہت عرصہ سے دل بیکل ہے دے بیکل کو یارب کل

جتائے دیتا ہوں دل کی تمنّا کچھ اشاروں میں ۔۔۔ گنا جاؤں تری توحید کے خدمت گزاروں میں

وہ قوت دے کہ حق پر جان میں اپنی فدا کردوں ۔۔۔ وہ ہمت دے کہ زور و طاقتِ باطل فنا کردوں

وہ طاقت دے کہ چرخِ پیر گو ظلم و ستم ڈھائے ۔۔۔ نہ لغزش بھول کر بھی پائے استقلال میں آئے

جو دل ہو خوشتگی کے حسنِ ہمجولی پہ مائل ہو ۔۔۔ زمانہ اس کی حق گوئی کا جان و دل سے قائل ہو

تیری تبلیغ کا سکّہ بٹھا دے یہ زمانے میں ۔۔۔ تری توحید کا ڈنکا بجا دے یہ زمانے میں

دُعا دی! نرگسِ گلشن نے اپنی آنکھ جب کھولی

گلِ مقصود سے پُر کر دے تو دامانِ ہمجولی

شاگردِ رشید

از جناب مرزا عبدالحمید بیگ صاحب بی۔اے، بی۔ٹی (علیگ)

گر ہمیں مکتب است ہمیں ملّا

کارِ طفلاں تمام خواہد شد

گو اب ہم تعلیمات میں نہ سہی مگر وہاں کے نکلے ہوئے ضرور ہیں اور پھر اس دشت کی سیاحی میں زمانہ بھی خاصا اچھا گزرا ہے اس لئے اس مضمون کے تحت ہماری حیثیت گھر کے بھیدی سے کسی طرح کم نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج ہم مدرسے کی لنکا ڈھانے کے خیال سے کھڑے ہوئے ہیں مگر کوئی صاحب تنگ نظری سے یہ خیال نہ کریں کہ خدانخواستہ ان کی ذات پر کوئی حملہ ہے کیونکہ ہم ایسی چھوٹی باتوں سے بہت ارفع ہیں اگر ہماری خالی خولی باتوں کا یقین نہ ہو تو ہم مرزا غالب مرحوم کی شاعری کی قسم کھائے دیتے ہیں کہ ہمارا روئے سخن کسی خاص طرف نہیں اگر ہو تو روسیاہ۔ البتہ عام باتیں بیان کرنی مقصود ہیں اگر اتفاق سے کسی دوست پر چپک جائیں تو بھی اللہ کی مرضی بہتر ہوگا کہ وہ صاحب یہ سمجھ کر خاموش ہو جائیں کہ نہ نشیب ہوتا نہ پانی مرتا اگر ضبط نہ ہو سکے تو جماعت میں کسی غریب طالب علم پر ہمارا غصہ اتاریں اور یا خیر ہم ہی کو دو چار گالیاں دے لیں ہم برا نہ مانیں گے اس مختصر سی تمہید کے بعد آمدم برسرِ مطلب۔

اس سے قبل ہم والدین کے متعلق کچھ عرض کر چکے ہیں مگر ہزار کچھ ہو وہ والدین ہی تھے وہ ہمارے تھے اور ہم ان کے ان کے متعلق ہم نے دل کھول کر شکایت کی اور آپ نے مزے لے لیکر سنی مگر اب باری محترم

اساتذہ کی ہے وہ ہزار اپنے ہوں گر پھر بھی غیر ہیں اور
ان کی شان میں زبان ہلانا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے کیونکہ
ظالموں نے ڈنڈے کے زور سے دلوں پر وہ رعب
جمایا ہے کہ شاید مرتے دم تک نہ جائے چنانچہ اب بھی
ہم لکھنے سے پہلے اِدھر اُدھر دیکھ لیتے ہیں کہ کوئی صاحب
چھڑی لئے ٹہل تو نہیں رہے بہر حال دل کڑا کر کے
دل میں جو کچھ ہے وہ کہہ تو سناتے ہیں مگر دیکھئے کیا
انعام ملتا ہے سمجھدار اساتذہ تو ضرور ہماری جرأت کی
داد دینگے اور ہمارے لکھنے سے فائدہ بھی اٹھائیں گے
مگر ہاں کسی نہ کسی کونے سے لعن طعن کی بوچھاڑ آنی
بھی یقینی ہے۔ خیر ہر کس بقدر ہمت اوست۔

ہم کسی اور موقعہ پر یہ عرض کر چکے ہیں کہ محترم
والدین کی بیجا عنایت و شفقت نے ہم کو گیا گزرا کر دیا
تھا اور ہم مدرسہ وغیرہ کے نام سے اتنی ہی دور بھاگنے
لگے تھے جتنی دور لاحول سے شیطان بھاگتا ہے
لیکن بھلا اس روشن زمانہ میں مدرسہ و تعلیم سے کوئی
کیسے بچ سکتا ہے آخر ایک دن ہم کو بھی اس قید خانہ
کی ہوا کھانی پڑی اور جو کچھ کمی والدین حضرات نے
باقی رکھی تھی وہ محترم اساتذہ نے پوری کر دی۔ آئیے
آپ کو بھی ذرا اپنے قید خانہ کی سیر کرادیں۔

ایک روز صبح کو ناشتہ کر کے ہم کلّو کے ساتھ
گولیاں کھیلنے کے لئے باہر جانے کا ارادہ کر ہی رہے تھے
کہ ناگہاں ابّا میاں نے منشی جی سے کہا کہ جاؤ میاں کو
ذرا مدرسہ میں تو داخل کرا آؤ۔ مدرسہ کا نام سننا تھا کہ
بس روح ہی تو فنا ہو گئی اور ہم نے نہایت عاجزی
سے ابّا میاں کا منہ تکنا شروع کیا مگر وہ حضرت
ذرا نہ پسیجے۔ منشی جی نے ہمارا ہاتھ پکڑا اور مدرسہ کا
رُخ کیا مدرسہ قریب ہی تھا چند ہی منٹ میں پہنچ
گئے مگر جونہی دروازہ میں داخل ہوئے اللہ بخشے
بی امّاں کی پیشین گوئی پوری ہوتی نظر آگئی دیکھا کہ
ایک چوچشمی "صاحب بہادر" کوٹ پتلون چڑھائے
ننگے سر۔ الٹا ہاتھ پتلون کی جیب میں اور سیدھے
ہاتھ میں ایک چھڑی لئے کھڑے ہیں۔ اور چھوٹے
بڑے مدرس طلباء کی خاطر و تواضع کر رہے ہیں ہم
ڈرتے ڈرتے آگے بڑھے جب ان صاحب بہادر
کے قریب پہونچے تو انہوں نے چھڑی سے ہماری
بھی تواضع کرنی چاہی مگر وہ تو خدا بھلا کرے منشی جی
کا کہ وہ جھٹ سے بول اٹھے کہ "صاحب میاں کو
داخل کرانے لایا ہوں" صاحب نے (جو بعد میں
معلوم ہوا کہ صدر مدرس صاحب تھے) یہ سنکر متانت
سے گردن ہلائی اور "اچھا دفتر میں چلو" کہکر دوسرے
لوگوں کی مہمان نوازی میں مشغول ہو گئے۔ یہہ سن کر

ہماری جان میں جان آئی کیونکہ ہماری حالت بالکل
غیر ہوگئی تھی اگر اور تھوڑی دیر وہیں کھڑے رہتے تو
شاید کپڑے بدلنے کی نوبت آجاتی خیر صاحب
اس اوّل منزل سے چھٹکارا پاکر مدرسہ کی
بھول بھلیاں میں داخل ہوئے اور دفتر کی تلاش میں
ٹامک ٹوئیاں مارتے مارتے اتفاقاً جماعت دوم کے
سامنے جانکلے جہاں پر ایک لمبے چوڑے مدرس
کھڑے بچّوں پر خفا ہو رہے تھے جماعت میں ایسا
سناٹا تھا جیسے کسی کو سانپ سونگھ گیا ہو ازراہ تجسس
ہم بھی اسی جماعت کے دروازے پر جا کھڑے ہوئے
مگر وہاں قدم رکھنے ہی کی دیر تھی کہ حضرت نے ہم کو
اس بُری طرح ڈانٹا کہ شاید رات کو ۲ بجے آنے والے
راہ گیر کو پولس والا بھی نہ ڈانٹیگا۔ یہ ڈانٹ سنکر ہم وہاں
سے نوک دُم بھاگے اور ایک برآمدہ میں جاکر سانس لیا
خوش قسمتی سے ایک چپراسی نظر پڑا اس کی مدد سے
صاحب بہادر کے دفتر تک رسائی ہوئی ہم تو باہر ہی
بیٹھے رہے منشی جی اندر گئے اُن کے اور صدر صاحب
کے درمیان ہمارے متعلق پنچنامہ ہوا اور بالآخر صدر
صاحب نے بشرط محنت و نیک رویہ ہمارے حق میں
دس سال کی قید بامشقت اور ماہانہ کچھ جرمانے کی سزا
ٹھونک دی اور چپراسی کے ذریعہ ہم کو کمرہ نمبر (۱)
میں داخل کرادیا۔ کمرہ (۱) کیا تھا خاصا اچھا مارشل لا
کا ایک چھوٹا سا نمونہ تھا ایک لحیم شحیم استاد ایک چھڑی
ہاتھ میں لئے اس مجمع کے سامنے کھڑے تھے۔ بچے
ایسے سہمے بیٹھے تھے کہ کاٹو تو لہو نہیں۔ نہ کسی کو جگہ سے
ہلنے کی اجازت تھی اور نہ بات چیت کرنے کی۔ اگر
کسی نے زبان ہلائی تو استاد صاحب کی چھڑی اسکی
کمر پر آئی اور اگر وہ جگہ سے کھسکا تو ماسٹر صاحب نے
اس کو ڈانٹا۔ یہ رنگ دیکھ کر ہمارے تو ہوش اڑ گئے۔
ہم بھلا ناز و نعم کے پلے ہوئے اس قید کو کس طرح
برداشت کرتے۔ گھر میں ہم کو پوری آزادی تھی۔
جو چاہتے کرتے۔ جہاں چاہتے جاتے۔ کوئی روک
ٹوک نہ تھی۔ لکڑی کا گھوڑا بناکر سارے دالان میں
دوڑاتے پھرتے کس کی مجال کہ ہم کو روکے۔ پوں
پوں کرکے موٹر چلاتے اور سارے گھر کو سر پر اٹھا لیتے
مگر کوئی ٹیڑھی نگاہ سے نہ دیکھ سکتا بھلا غور تو کیجئے
کہ آزادی کی ایسی فضا میں سے نکل کر اس قسم کے
قید خانہ میں داخل ہونا کتنا بڑا ظلم ہے۔ گھر اور مدرسہ
میں کوئی مناسبت ہی نہیں تھی۔ مدرسہ میں ایک
چیز بھی ایسی نہیں تھی جو گھر کے ماحول سے ملتی جلتی
ہوتی۔ استاد کو والد کا رتبہ دیا جاتا ہے مگر اب
آپ ہی غور فرمائیے گا کہ ہمارے ساتھ ان کا کیا

سلوک رہا۔ مگر اب ہم کر ہی کیا سکتے تھے۔ اس قید خانہ
میں باقاعدہ ہمارا داخلہ ہو چکا تھا۔ قہر درویش برجانِ
درویش کہکر منشی جی کو گالیاں دیتے ہوئے ہم بھی
جا بیٹھے۔ اور قید خانہ جانا روزانہ کا معمول ہو گیا۔
مینہ آئے آندھی آئے مگر مدرسہ جانا ناغہ نہ ہو اور یہ
کیوں؟ اس لئے نہیں کہ ہم کو مدرسے سے کوئی دلچسپی
پیدا کرا دی گئی تھی بلکہ اس لئے کہ قبلہ استاد صاحب
کی چھڑی میں مقناطیسی اثر تھا کہ ہم روز گھسٹے ہوئے
چلے جاتے تھے رات بھر استاد صاحب کی چھڑی
اور اپنی کمر کے خواب دیکھتے۔ صبح ہوتے ہی مدرسہ جانے
کی تیاری شروع کر دیتے راستہ بھر "حق تو سبحان تو
قدرت کمال تو۔ آئی بلا کو ٹال تو۔" کا وظیفہ ورد
کر کر کے اپنے ہاتھ منہ اور سینہ پر دم کرتے مگر پھر بھی
دعا قبول نہ ہوتی۔ کسی نہ کسی صورت میں بلا نازل ہو ہی
جاتی۔ کبھی پہاڑے یاد نہ ہوتے۔ کبھی املا غلط ہوتا
کبھی تختی بھول آتے اور ماسٹر صاحب کو اپنی شفقت
دکھانے کا موقعہ ملجاتا اور کبھی اتفاق سے ان سب باتوں
سے بچ بھی جاتے تو طویلہ کی بلا بندر کے سر آتی یعنی
گھر میں ماسٹر صاحب کو کھانا وقت پر نہ ملتا۔ گھر والی
سے جھڑپ ہوتی۔ دو میل کی راہ پیدل طے کر کے
مدرسہ آتے اور سب کا غصہ ہم پر اتارتے۔ واللہ وہی
مثل ہو گئی کہ کمہار پر بس نہیں چلا گدھیا کے کان اینٹھے
تھپڑ۔ مکا۔ طمانچہ اور چٹکی تو کوئی بات ہی نہ تھی۔
اگر پارہ زیادہ چڑھا ہوتا تو چھڑی کے استعمال میں بھی
دریغ نہ تھا۔ اور اس پر طرہ یہ کہ بڑے زور سے
دعویٰ اس بات کا ہوتا کہ ہم تو بچوں کو اپنی اولاد کے
برابر سمجھتے ہیں۔ ہاں بھئی زبردست مارے اور رونے
نہ دے۔ ہم تو جب جانیں کہ اپنی اولاد کو بھی ہماری
طرح اپنے مکے اور طمانچے کا تختۂ مشق بنائیں مگر
وہاں چلتی کس کی ہے۔ وہ تو ہم غریب مل جاتے
ہیں کہ جس طرح چاہو سلوک کرو کوئی پوچھنے والا نہیں
خطا کریں تو پٹیں نہ کریں تو پٹیں۔ اپنی مرضی سے
کوئی کام کریں تو سزا اور استاد صاحب کی مرضی
کے خلاف کریں تو خطا وار بھلا اس ستم ظریفی کو تو ملاحظہ
فرمائیے کہ ہمارے افعال و حرکات کو اپنے معیار سے
جانچتے ہیں۔ اور اگر ہم اس معیار سے گرتے ہیں تو
استاد صاحب کو غصہ آتا ہے کوئی اللہ کا بندہ ٹریننگ
کالج میں ان کو اتنا نہیں سمجھاتا کہ ہماری اور ان کی
ذہنیت اور سمجھ میں زمین و آسمان کا فرق ہے
اور بچوں کو پڑھاتے وقت ان کو اپنی قابلیت کی
بلند چوٹی پر سے نیچے اتر کر ہماری سمجھ کے میدان
میں آنا چاہئے تاکہ وہ ہم کو جو بات سمجھانا چاہیں وہ

ہماری ذہنیت کے مطابق ہو نہ کہ خود ان کی اعلیٰ قابلیت کی دلیل بھلا غور تو کیجئے کہ اگر ہماری اور انکی قابلیت ۔ ذہنیت اور سمجھ برابر ہی ہوتی تو آخر ہم پر ایسی کونسی مصیبت پڑی تھی کہ جوتیاں کھانے کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اللہ کے بندے ذرا غور نہیں کرتے ۔ ارے بھائی اگر آپ کی یہی خواہش ہے کہ ہم آپ کی مرضی کے مطابق عمل کریں اور اپنی رائے کو کسی چیز میں دخل نہ دیں یعنی بالفاظ دیگر اپنی شخصیت اور انفرادیت کو مٹا دیں تو گستاخی معاف ہمارا مخلصانہ مشورہ قبول فرمائیے کہ "اسکول ماسٹر" کی بجائے "سرکس ماسٹر" بنجائے وہاں ہر کام آپ کی مرضی کے مطابق ہوتا چلا جائے گا کوئی چوں وچرا نہ کرے گا ۔ لیکن جب تک آپ کا تعلق ہم جیسے جیتے جاگتے انسانوں سے ہے اس وقت تک آپ کو بلاشبہ اپنے نفس پر پورا قابو رکھکر ہماری شخصیت کا لحاظ رکھنا پڑے گا تاکہ ہماری انفرادیت کو ابھرنے کا موقع ملے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو یاد رکھئے کہ قوم آپ سے مواخذہ کریگی ۔

اول تو ویسے ہی ماشاء اللہ آپ کا تن و توش ہمارے لئے کوئی معمولی چیز نہیں اس پر آپ کی اس قدر نازک مزاجی کہ ہماری معمولی سی حرکت بھی آپ کے جذبہ انتقام کو مشتعل کر دے ہمارے لئے موت کے پیغام سے کم نہیں ہے ۔ آپ کے غصہ سے ہمارے ہوش وحواس بالکل اڑ جاتے ہیں اور جو چیز ہم گھر سے یاد کر کے لاتے ہیں آپ کے لال چہرہ کو دیکھ کر وہ بھی بھول جاتے ہیں ۔ اس کے بدلے اگر آپ نرمی و محبت سے کام لیں تو آپ کے ایک سوال کے بدلے ہم دو جواب دیں گے ۔ آپ ایک چیز یاد کرنے کو کہیں گے ہم دو چیزیں یاد کر کے سناویں گے ورنہ آپ اگر دس سوال بھی کریں گے تو بھی ہماری مہر سکوت قائم رہیگی ۔ اگر آپ زیادہ سختی کریں گے تو ہم مدرسہ کو خیرباد کہدیں گے ۔ اور اس کا عذاب آپ کی گردن پر ہوگا ۔

مگر صاحب اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ ہم سزا کے بالکل مخالف ہیں کیونکہ اگر سزا کا خوف ہمارے دل سے اٹھ جائے تو پھر تو ہم شاید استادوں کو بھی پڑھا کر چھوڑ دیں گے اور ہم یقیناً یہ بھی نہیں چاہتے کہ موجودہ حالت میں ہم کو "منشور آزادی" Chart of liberty عطا کر دیا جائے تاکہ ہم بذریعۂ رزولیوشن خود استاد صاحب کا داخلہ جماعت میں ممنوع قرار دیدیں ۔ ہمارا مقصد صرف اس قدر ہے کہ استاد صاحب سزائے جسمانی کو سختی کے ساتھ

کی طرح آنکھیں بنا کر کے استعمال نہ کریں بلکہ ذرا سوچ سمجھکر اور اپنے غصہ کو قابو میں رکھکر سزا دیں کیونکہ سزا ہمیشہ تادیبی ہونی چاہئے نہ کہ انتقامی جیسا کہ ذیل کی مثالوں سے بخوبی واضح ہو جائے گا۔

ایک روز ہم دفتر میں رجسٹر حاضری رکھکر بچوں کی طرح ذرا اچھلتے کودتے ہوئے واپس آرہے تھے کہ ہمارے سکنڈ ماسٹر صاحب نے ہم کو دیکھا اور معلوم نہیں اخلاقیات کے کون سے اصول کے تحت اس چال کو خلاف تہذیب قرار دیکر ہمارے ہاتھوں پر ایک دم نصف درجن بید یں رسید کر دیں۔ خیر یہ ہمارے اخلاق تھے کہ ہم نے ضبط سے کام لیا اور اس ناانصافی کے باوجود بھی ان کے احترام میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ اسی طرح ایک روز شام کے وقت ہم فٹ بال کھیل کر ایک دوست کے ساتھ واپس ہو رہے تھے۔ بدقسمتی سے راستہ میں ہمارے تھرڈ ماسٹر صاحب کا بالاخانہ پڑتا تھا۔ ان کی عادت تھی کہ شام کے وقت اس کے برآمدہ میں ایک آہنی اسٹول پر تشریف رکھتے تھے۔ ان کے سیاہ چہرے چپٹی ناک اور گھونگر والے بالوں پر ایک نہ بند۔ ایک نیم آستین اور "بلا پھند نے کی ایک میلی سی ترکی ٹوپی کچھ ایسی بہار دیتی تھی کہ بس دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی تھی۔

اس روز مغرب کے جھٹپٹے میں اس ٹھاٹھ سے بیٹھے ہوئے جو آپ نظر پڑے بیساختہ ہنسی آنے لگی۔ اول تو ویسے ہی ان کے نام سے دم نکلتا تھا اس پر کچھ ادب و لحاظ مانع ہوا۔ ہنسی روکنے کی بہت کوشش کی لیکن آخر جذبۂ فطری غالب آگیا اور ہم ان کے بالاخانے کے نیچے پہنچتے ہی کھل کھلا کر ہنس پڑے اس پر غضب یہ ہوا کہ ہر پندرہ[۱۵] بیس[۲۰] قدم چلکر مڑ مڑ کر ان کی طرف بھی دیکھتے گئے۔ ان کی غضب آلودہ آنکھیں بھی ہم کو یکساں گھورتی رہیں ہنسنے کو تو ہم ہنس دیئے مگر وہیں ماتھا ٹھنکا کہ بچہ جی اب کل خیر نہیں چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ دوسرے روز ماسٹر صاحب نے ایک مشکل سا سوال حل کرنے کو دیا ہم حساب میں تو اللہ کے فضل سے پہلے ہی صفر تھے ماسٹر صاحب کو اچھا موقعہ مل گیا۔ ٹہلتے ہوے ہمارے پاس آئے اور "ابھی تک نہیں کیا" کہکر اور ہونٹوں سے بھینچ بھینچ کر کے ہمارے بازو کو اس زور سے مسلا کہ بس خون جھلک آیا اور ہم رونے لگے۔

اب ہم آپ ہی سے پوچھتے ہیں کہ اگر ہمارے تھرڈ ماسٹر صاحب نفسیات اطفال Child Psychology سے واقف ہوتے تو کیا ہمارے اس بچپن اور فطری جذبہ کا لحاظ نہ کرتے۔ ہاں البتہ

اگر سزا نہ دی جائے تو ہم کو شکایت ہرگز نہ ہوگی جیسے
کہ ایک مرتبہ نماز میں ہنسنے کی وجہ سے ہمارے قبلہ
ہیڈ ماسٹر نے ہمارا کان چھیدا تھا۔ خیر اس جزا و سزا
کے مسئلہ ہی کو جانے دیجئے۔ ممکن ہے ہماری یہ شکایت
قابل التفات نہ ہو کیونکہ ہم ٹھہرے سزا یافتہ اور دل
جلے پتھر مارا ہی کرتے ہیں مگر غالباً آپ کو اس امر سے تو
انکار نہ ہوگا کہ استاد صاحب کا کام صرف سی۔اے۔ٹی
کیٹ۔ کیٹ معنے بلی رٹوا دینا نہیں ہے۔ وہ نہ صرف
ہماری تعلیمی ترقی کے ذمہ دار ہیں بلکہ جسمانی۔ ذہنی
اور اخلاقی نشوونما کی ذمہ داری بھی ان پر عاید ہوتی
ہے۔ ڈنڈے کے زور سے جملوں کے معنے اور سوالوں
کا حل رٹوا دینا تو آسان ہے مگر حقیقی معنوں میں جو تعلیم
ہے یعنی کیرکٹر کا بنانا وہ ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ اور یہ
مقصد صرف اس وقت حاصل ہوسکتا ہے جب استاد
صاحبان خود مجسمہ کیرکٹر بن کر ہمارے سامنے پیش ہوں
اگر یہ بات نہ ہوگی تو ممکن ہے کہ وہ لکڑی کے بل کڑی
سنجانے میں کامیاب ہوجائیں مگر ہمارے دل میں انکی
وہ وقعت اور عزت ہرگز نہ قائم ہوگی جو درحقیقت
استاد کے شایان شان ہے۔ مگر ہم اس معاملہ میں بھی بدقسمت
ثابت ہوئے یعنی ہمارے محترم اساتذہ "دیگراں را نصیحت
خود را فضیحت" کی زندہ مثال تھے۔ ان کے
قول و فعل میں زمین و آسمان کا فرق تھا مگر لطف یہ کہ
ہم سے توقع کرتے تھے کہ ان کی نصیحت پر عمل پیرا ہوں
بھلا یہ کیسے ممکن تھا؟ مثلاً پابندی اوقات کی ہم کو تو
بہت سختی کے ساتھ تاکید ہوتی بلکہ سزا بھی دیجاتی اور
خود کی یہ حالت کہ دس دس پندرہ پندرہ منٹ تک
جماعت میں تشریف نہ لاتے حالانکہ صدر مدرس کا حکم
تھا کہ گھنٹہ بجتے ہی جماعت میں چلے جائیں جماعت
میں آتے بھی تو یا تو میز پر ٹانگیں پھیلا کر آرام کرنے
لگتے اور یا اپنے بی۔اے۔ کے امتحان کی تیاری میں
مشغول ہوجاتے۔ اور مانیٹر کو حکم دے دیتے کہ
صدر صاحب کو دیکھتے رہو۔ ہم بھی بیٹھے آرام کرتے
رہتے۔ اگر کبھی صدر صاحب آکر ہم سے کوئی سوال
کرتے تو ہم لازماً صفر نکلتے۔ مگر ماسٹر صاحب سرخرو ہونے
کے لئے الٹی ہماری شکایت کر دیتے کہ صاحب بہتیرا
سر مارتا ہوں کبھی توجہ ہی نہیں کرتا اور نہ والدین ہی
گھر پر دیکھ بھال کرتے ہیں۔ دیکھئے کل سوال دیئے
تھے وہ بھی نہیں لایا میں کیا کروں۔ اور سنئے ہم
جماعت کے اندر کسی دوست سے بات چیت کرتے
تو بنچ پر کھڑے کر دیئے جاتے لیکن اگر خود کا کوئی دوست
ملنے آنکلتا تو پورا کا پورا گھنٹہ اس سے باتوں میں
گذار دیتے اور ہم کو "خاموش۔ خاموش" کی آواز

لگاتے رہتے۔ اور اگر اتفاقاً صدر مدرس صاحب دورہ کرتے ہوئے وہاں آ نکلتے اور حضرت کو باتیں کرتے ہوئے پا لیتے تو فوراً صفائی سے جھوٹ بول دیتے کہ "صاحب یہ اپنے بچے کو یہاں داخل کرانا چاہتے ہیں۔ آپ کی تعریف سن کر یہاں آئے ہیں"۔ حالانکہ اگر ہم کبھی مصلحتاً بھی جھوٹ بولتے تو پورا گھنٹہ جھوٹ کی برائیاں بیان کرنے میں ختم ہو جاتا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ہم گھر سے ہوم ورک کر کے نہ لاتے اور کسی ہم سبق کی کاپی میں سے نقل کر لیتے۔ ان کو خبر بھی نہ ہوتی لیکن اگر کسی روز ان کو معلوم ہو جاتا تو بہت خفا ہوتے نصیحت کرتے شرم دلاتے مگر خود کا حال یہ کہ گھر سے سبق کے اشارے Notes of lesson تیار کر کے نہ لاتے اور صدر صاحب کو دھوکہ دینے کے لئے جماعت میں ہی بیٹھکر دو چار لفظ گھسیٹ کر ضابطہ کی تکمیل کر دیتے خود تو مدرسے میں کبھی نماز نہ پڑھتے کیونکہ وہ "صاحب" کے کھانے کا وقت ہوتا تھا مگر ہم کو نماز کی غیر حاضری پر سزا دیتے۔ ہمارے سامنے جماعت میں صدر مدرس صاحب کو برا بھلا کہتے لیکن جب ان سے ملتے تو ان کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے اسکاوٹنگ میں شرکت کرنے پر ہم کو طعن کرتے اور جب صدر صاحب اس کی نسبت گفتگو کرتے تو سوائے جی ہاں کے اور کچھ نہ فرماتے۔ دوسرے مدرسین کی شکایت صدر صاحب سے کرتے اور صدر صاحب کی شکایت ان سے کرتے۔ صدر صاحب کا حکم تھا کہ وہ سزائے جسمانی دینے سے احتراز کریں اور وہ ڈنڈے کے زور سے It is far better to rule by love than fear کے معنی ہم سے رٹواتے۔ واللہ کیا عجیب بات ہے۔ کیا قول و فعل کے اختلاف کی اس سے زیادہ دلچسپ اور کوئی مثال مل سکتی ہے مگر حضرات ان سب ناانصافیوں اور بے قاعدگیوں کے باوجود بھی ذرا ہماری دریادلی اور وسعت خیال کی داد دیجئے کہ ہم یہ کہکر اپنے محترم اساتذہ کو تمام الزامات سے سبکدوش کر دیتے ہیں کہ ان کو نفسیات اطفال Child Psychology سے بالکل محروم رکھا جاتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ ہمارے دلوں کی کیفیت کا اندازہ لگانے سے قاصر ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی ہم اپنے محترم اساتذہ سے اتنا ضرور عرض کرینگے کہ ہماری وسیع النظری سے فائدہ اٹھائیں۔ ہر طالب علم اتنا سخی نہیں ہوتا کہ آپ کی ہر بات کو نظر انداز کر جائے۔ ذرا زمانے کے رنگ کو پہچانئے اور حالات کے مطابق کام کیجئے اب وہ زمانہ نہیں رہا ہے کہ گوشت آپ کا ہوتا تھا اور ہڈیاں والدین کی۔ اس زمانہ میں

ہماری ہر چیز ہماری ہے۔ ہماری شخصیت کو اُبھرنے کا موقع دیجئے۔ ہماری انفرادیت کا لحاظ رکھئے۔ اور ہم کو اس طرح تعلیم دیجئے کہ مدرسہ قید خانہ اور آپ جلاد نہ معلوم ہوں۔ گھر اور مدرسے میں کوئی فرق نہ رہے۔ ہمارا کھیل تعلیم ہو اور تعلیم کھیل ہو۔ ذرا سی تکلیف گوارا فرما کر مغربی ممالک میں جو جدید اصول تعلیم رائج ہیں ان سے واقفیت حاصل کیجئے اور کافروں کی ہر چیز کو بُرا نہ سمجھئے اگر شان کے خلاف نہ ہو تو ہماری عینک مستعار لیکر اس کے ذریعے خُذ مَا صَفَا کی سطریں جلی حروف میں پڑھ لیجئے اور ان پر کاربند ہو جائیے۔ غرض یہ کہ ہماری تعلیم کھیلتے کودتے ہو جائے مثلاً اگر آپ ہم کو گنتی و حساب سمجھانا چاہتے ہیں تو ہم کو میٹھی گولیاں دیدیجئے ہم کھاتے جائیں اور آپ گنتے جائیں۔ اگر نفع و نقصان سکھانا ہے تو ہم کو پیسے دیدیجئے اپنی کتاب ہمارے ہاتھ بیچئے اور ہماری قلم خود خریدیے۔ ہم کو جو اخلاقی سبق سکھانا چاہیں پہلے خود اس کی مثال بن جائیے وقس علیٰ ہذا۔ بس اگر آپ اس طرح کام کریں تو پھر دیکھئے ہم کس طرح آپ کے گلے کا ہار بنجاتے ہیں اور اگر ایسا نہ کیا تو ہمارے دلوں میں آپ کی وہ عزت نہ ہوگی جو ہونی چاہئے اور ہم آپ کے نام سے کوسوں دور بھاگتے رہیں گے۔

یہ سب کچھ سچ سہی مگر بھائی صاحب کس کی بکری کون ڈالے گھاس۔ استاد کو آخر کیا غرض پڑی ہے کہ وہ ہم پر جان مارے سررشتہ غریبوں کو تنخواہ تو اس قدر قلیل دیتا ہے کہ اُن کو اپنا اور اپنے متعلقین کا پیٹ بھرنا مشکل ہوتا ہے ٹیوشن کرنے کی ان کو اجازت نہیں۔ اوپر سے دستِ غیب ان کو نہیں ہوتی۔ بیچارے صبح سے شام تک اسی ادھیڑ بن میں رہتے ہیں کہ کس طرح عزت سے بسر کریں۔ نون۔ تیل لکڑی کا فکر ان کے دماغ کو بالکل معطل کر دیتا ہے اس کے بعد اگر ان سے یہ توقع رکھی جائے کہ وہ مغربی ممالک کے اساتذہ کی طرح جوش و انہماک سے کام کریں اور اپنا تن من دھن غرضیکہ سب کچھ بچوں کی نذر کر کے فنا فی المدرسہ ہو جائیں تو ہمارے خیال میں اگر ظلم نہیں تو بعید از انصاف ضرور ہے مثل مشہور ہے۔ مزدور خوش دل کند کار بیش۔ اگر سررشتہ تعلیمات ان کی تنخواہوں میں معقول اضافہ کر دے تو پھر دیکھئے وہ بھی کیسے جوش سے کام کرتے ہیں۔ ورنہ موجودہ صورت میں تو لائق حضرات کو اس محکمہ میں قدم رکھنا بھی عار معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ تنخواہ کم۔ ترقی کا موقع محدود۔ پبلک کی نگاہ میں کوئی وقعت نہیں اور وظیفہ پانے تک دماغ کھوکھلا

ہوجاتا ہے۔ خیر یہ تو آمد سخن تھی۔ ہمارا اُس سے کوئی تعلق نہیں۔ تو صاحب اسی طرح لشتم پشتم زمانہ گزرتا گیا۔ ایک جلاد سے پیچھا چھوٹا تو دوسرے کے حوالہ ہوئے۔ اس سے نکلے تو اس سے بڑھکر جلاد ملا۔ کسی نہ کسی طرح دس سال پورے ہو ہی گئے لطف یہ ہے کہ اس مدّت کے منقضی ہونے پر ہی ہمارے پاؤں کی بیڑیاں نہ کٹیں چنانچہ اب محنت و نیک چلنی کی علّت میں مزید چار سال کی سزا کا حکم ہوگیا اور ہم صحبس میں منتقل کر دیئے گئے جہاں قید صرف برائے نام ہی تھی ورنہ دراصل ہم پورے طور پر آزاد تھے بلکہ آزادی بھی ایسی کہ کوئی پرسان حال نہ تھا مگر چونکہ اب آپ تھک گئے ہیں اس لئے اس کو کسی اور موقعہ کے لئے اٹھا رکھتے ہیں اور آپ سے رخصت چاہتے ہیں۔ لیکن چلنے سے پہلے ایک گزارش ہے وہ یہ کہ اگر بدقسمتی سے کوئی نازک مزاج ہمارا مضمون ایسے وقت پڑھیں جبکہ گرمی یا سردی کی وجہ سے ان کا دماغ متاثر ہو چکا ہو یا مدرسوں کے بچّوں نے اس کی مقدار میں کمی کر دی ہو تو ممکن ہے کہ وہ اس کو (سب لغو) All humbug کہکر ردی کی ٹوکری میں پھینکدیں۔ اور اس کی نسبت وہی رائے قائم کریں جو امریکہ کی ایک مشہور ہمدرد خاتون کی ایک قابل قدر تصنیف کے متعلق ہندوستان کے ایک بہت بڑے لیڈر نے قائم کی تھی اور اس سے ان کو ہمارے مدرسے کی نسبت غلط فہمی ہو جائے تو اس لئے ایسے حضرات کی خدمت میں عرض ہے کہ ہمارا یہ مضمون شکایتی ہے اور اس کے سیاہ مُنہ پر ہم تعریف کا سفید دھبہ لگا کر اس کو کوڑھی بنانا نہیں چاہتے۔ ورنہ اگر یہ خیال نہ ہوتا تو ہم اپنے مدرسے اور اساتذہ کی خوبیوں سے ورق کے ورق سیاہ کر دیتے اور سب سے پہلے اپنے اُن شفیق صدر مدرس کی عنایت و شفقت کا شکریہ ادا کرتے جنھوں نے ہمارے ساتھ ہمیشہ پدرانہ سلوک کیا اور جن کے قطب زماں ہونے میں ہم کو ذرا بھی شک نہیں کیونکہ ہم نے بارہا آزمایا ہے کہ ان کو جہاں کہیں یاد کیا یا جہاں کہیں اُن کا خیال دل میں آیا خواہ وہ قطب ہوتا یا نظام الدین کوٹلہ ہوتا یا اوکھلا چاندنی چوک ہوتا یا قاضی کا حوض وہ ہمیشہ حضرت خضر کی طرح آموجود ہوتے فقط

عہدِ طفلی

از سحر طراز حضرت ثاقب کانپوری



کھو گیا مجھ سے مرا وہ عہدِ طفلی کھو گیا
جسکے دامن میں نہاں تھی کیف پرور اک ہوا

اب نہ وہ ایامِ ماضی ہیں نہ وہ شبہائے خواب
میرے بچپن کے لئے شاید فضا ہے سوگوار

آہ کیا دن تھے وہ جب آغوشِ مادر تھی نصیب
جسکی ہر جنبش سے تھا رازِ محبت آشکار

میں سمجھتا تھا اسی کو وسعتِ دنیا ہے یہ
جس کا ہر گلشن تھا اک سرمایہ دارِ صد بہار

دیکھتی رہتی تھیں آنکھیں جلوۂ روئے قمر
کھیلتا تھا چاند جب چھپ کر ردائے ابر میں

میں تقاطر کو سمجھتا تھا کہ ہے جھولا مرا
ایک بامعنی مسرت تھی صدائے ابر میں

بے زبانی ہی مری تھی ترجمانِ حالِ دل — کتنے بامعنی تھے میرے وہ اشاراتِ لطیف

طائرِ تخئیل میرا عرش سے ہمدوش تھا — گرچہ تھا میں ناتواں اعضا بھی تھے میرے ضعیف

ہیں کھلونے خود بنا کر کھیلنا تھا رات دن — اور سمجھتا تھا کہ ان کی دوستی ہے پائدار

ہاں مگر آکر جوانی نے وہ منظر کھو دیا — ہو گئی بے کیف اس سے دلکشیِ جوئبار

دوستوں کے جمگھٹے خوابِ پریشاں ہو گئے — یاد سے انکی بڑھا جاتا ہے دل کا اضطراب

اب کہاں پاؤں تجھے اے عہدِ طفلی سچ بتا — کاش تو مجھکو بنا دے ایک نقشِ سطحِ آب

ہے مرے دلمیں ابھی تک آرزوئے سیرِ گل — ہیں مری نظروں میں اب تک باغ کی شادابیاں

ہاں مگر فطرت کی تبدیلی نے پلٹا وہ ورق — جسکی تحریرِ مصفّا میں تھیں کچھ رنگینیاں

ہو گئیں برہم نشاط و عیش کی وہ محفلیں — جن کا ہر نغمہ سرورِ لذّتِ جاوید تھا

ہاں مگر اس کا مآلِ غم فزا سمجھا نہیں — یعنی ہر لمحہ طرب کا غم کی اک تمہید تھا

ہندی ہمجولی

ہندو مسلمان دونوں ہمجولی ہیں

از محترمہ صغرا ہمایوں مرزا ام۔آر۔اے۔ایس (لندن)

ہندوستان میں مسلمان، عرب، ترکستان، ایران اور افغانستان سے آکر ایسے بسے کہ ہندوستان کو اپنا وطن ہی بنالیا ایسا وطن بنالیا کہ پھر کبھی اپنے پرانے وطن کی طرف رُخ تک نہ کیا عورتوں نے اپنا لباس ترک کرکے ہندوؤں کی ساڑی اختیار کرلی۔ اپنی غذا ترک کرکے ہندوانی غذا زیادہ تر روزمرہ کھانا شروع کی۔ شادی بیاہ میں رسومات ہندوانی لے لئے سہرا باندھنا کنگنی باندھنا۔ مانجا بٹھانا۔ ہلدی لگانی۔ ساچق۔ مہندی۔ دلہن کو دولہا کو پھول پہنانا دلہن کو سرخ کپڑے پہنا کر جھکا کر بٹھانا۔ یہ سب رسومات ہندوانی ہیں۔ عرب۔ ایران۔ ترکستان میں دلہن کو سرخ لباس نہیں پہنایا جاتا سفید لباس پہنایا جاتا ہے اور پھول پہنانے کی رسم کسی اسلامی ملک میں نہیں ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ غمی کے وقت بھی بہت سی رسومات ہندوانی برتی جاتی ہیں۔ چوڑیاں توڑنا۔ لچھا توڑنا۔ سفید لباس پہنا۔ زیارت کے دن میوہ ناریل وغیرہ رکھنا۔ پان کا بیڑا کھولنا پھول تیل وغیرہ رکھنا۔ بیوہ عورت اور یتیم بچوں کے لئے ان کے عزیزوں کے ہاں سے سفید کپڑا آنا اور اڑھایا جانا۔ غرض اس طرح کی بہت سی رسمیں ہیں جو مسلمانوں نے ہندوؤں سے لے لی ہیں۔ اگر کسی نے ان رسموں کو ترک کیا تو گویا قانون کے خلاف کیا۔ اسی طرح ہندوں نے وسط ایشیا سے آکر ہندوستان کو اپنا وطن بنالیا اور انہوں نے بھی بہت سی رسمیں اور تہذیب وغیرہ مسلمانوں سے لی فارسی زبان ہندوؤں نے سیکھی اور فارسی میں تصنیف و تالیف

کی ہندوستان میں فارسی زبان دفتری زبان تھی۔
ہندوؤں نے فارسی میں ایسے ایسے اشعار لکھے ہیں
کہ اہل زبان داد دیتے ہیں۔ مصطلحات بہارعجم
جیسی ضخیم لغت کا مولف ہندو تھا اور اہل عجم نے اس کو
مستند سمجھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہندو مسلمانوں کا
آپس میں کیسا اتحاد تھا۔ شہنشاہ اکبر نے تو ہندو مسلمانوں
کو ایک سمجھا اور اپنے وقت میں بڑے بڑے عہدوں
پر ہندوؤں کو رکھا اور اپنی ایک ملکہ جو رانی جودھابائی
تھی اس کے پوجاپاٹ کے لئے مندر وغیرہ بنوا دیا وہ
جمنا کے کنارے اشنان کرتی تھی اور پوجاپاٹ برابر
کرتی تھی۔ اسی طرح جہانگیر اور شاہجہاں نے
بھی اپنے اپنے وقت میں ہندوؤں کو مسلمانوں کے
برابر بڑے بڑے عہدے دیئے اور اتفاق کا ثبوت
دیا۔ افسوس کہ چند سال سے ہندو مسلمانوں کا جھگڑا
عام ہو رہا ہے جس کی وجہ سے مجھے بہت رنج ہوتا ہے
میں نے سوچا کہ آپس کا اتحاد کیونکر قائم ہو میرا خیال
ہے کہ اگر ہم عورتیں آپس میں سہیلی بن جائیں اور خلوص و
محبت سے ملیں اور اپنے ہاں شادی بیاہ عید بقرعید
وغیرہ میں اپنی ہندو بہنوں کو بلایا کریں اور ہندو
بہنیں اپنے تہوار دیوالی۔ دسہرہ۔ ہولی وغیرہ میں
اپنی مسلمان بہنوں کو مدعو کریں بلکہ غمی کے موقعوں پر
بھی ایک دوسرے کو بلایا کریں تو اس سے یہ فائدہ ہوگا
کہ عورتوں کی دوستی و اتحاد کا اثر مردوں پر ضرور پڑیگا
مرد بھی آپس میں دوست بنجائیں گے۔ بچے جو اپنی
ماں کے ہمراہ آیا جایا کریں گے وہ بھی ہمجولی کہلائینگے
جب وہ جوان ہوں گے تو ان کو ہندو مسلمان کا فرق
نہیں معلوم ہوگا کیونکہ وہ کمسنی سے ایک دل ہو جائیں
گے اس سے ہماری آئندہ نسل کو بہت فائدہ ہوگا۔
سردست ہندو مسلمان عورتیں آپس میں محبت و اتحاد
پیدا کریں تاکہ ہمارے ملک کی ترقی ہو۔ اتفاق باہمی پر
سینکڑوں مضامین لکھے گئے اور تقریریں بھی ہوئیں لیکن
کچھ اثر نہ ہوا اب اس کام کا بیڑا عورتیں اٹھائیں اور
دکھادیں کہ جو کام بڑے بڑے مدبران قوم نے نہیں کیا
وہ ہم عورتوں نے کر دیا۔ اب وہ وقت نہیں رہا کہ مسجد
کے سامنے سے باجا بجایا جائے تو مسلمان چراغ پا
ہو جائیں اور یہ کہیں کہ ہماری نماز میں خلل آتا ہے
ہماری نماز تو وہ ہے کہ حضرت علیؓ کے پیر میں تیر کا
پھل رہ گیا تھا تو حضرت نے فرمایا کہ جب میں سجدہ
میں جاؤں اس وقت نکال لو۔ اس سے ظاہر ہے کہ
نماز کے وقت خدا کی طرف انسان ایسا محو ہو جاتا ہے
کہ اس کو کسی قسم کا درد بھی محسوس نہیں ہوتا۔ پھر باجا
بجنے سے نماز کیونکر خراب ہو سکتی ہے۔ اسی طرح ہندو

کی حالت ہے کہ مندر کے اندر اگر مسلمان چلا جائے تو
آپس میں جھگڑا شروع ہو جاتا ہے ہندوؤں کے کھانے
کو مسلمان ہاتھ لگا دے تو لڑائی ہوتی ہے ہندوؤں
کے کنوئیں سے مسلمان پانی نکالے تو جھگڑا ہوتا ہے
ان سب جھگڑوں کو چھوڑ دینا چاہئیے مسجد اور مندر
دونوں خدا کے گھر ہیں عبادت کا طریقہ الگ الگ
ہے لیکن سب ایک ہی خدا کی پرستش کرتے ہیں۔ کوئی
پتھر کو سامنے رکھکر عبادت کرتا ہے تو کوئی آگ کو۔
کوئی آفتاب کو دیکھ کر خدا کی عبادت کرتا ہے تو کوئی
مسجد میں بیٹھکر خدا کی یاد کرتا ہے۔

دیر و حرم کلیسا بیکار کا ہے جھگڑا
یہ سب ہیں تیرے مسکن جس جا پہ دیکھو تو ہے

قرآن میں خدا نے اپنے متعلق
"ربّ العالمین" فرمایا ہے اس سے صاف
ظاہر ہے کہ ہندو مسلمان عیسائی۔ پارسی سب کا
خدا ایک ہی ہے پھر کیا وجہ ہے کہ ہم آپس میں
جھگڑا کریں۔

ہمجولی رسالہ جو بڑے اعلیٰ پیمانے پر نکالا گیا
ہے اُمید کرتی ہوں کہ ہندو مسلمان خواتین میں
محبت پیدا کرے گا ہندو مسلمان خواتین آپس
میں بہنوں۔ سہیلیوں کا سا برتاؤ کریں گی اور رسالہ
ہمجولی میرے خیال کو عملی جامہ پہنائے گا
خدا کرے اس کا وجود ملک و قوم کے لئے
مفید ہو۔ فقط

یادِ شباب

از حضرت زیبا ردولوی

پیاری پیاری آوازوں پہ بیدار خموشی چھاتی ہے
موسیقی جب بھی یاد آ آکر دل کو تڑپا جاتی ہے

جوہی کے ننھے منے غنچے دھوپ سے کمھلا جاتے ہیں
جب نام نہیں خوشبو کا ہوتا جب بھی خوشبو آتی ہے

ایسے ہی اکثر راتوں میں آتا ہے جب دم یادِ شباب
اُس میٹھے میٹھے خواب کی غفلت اب بھی کچھ چھا جاتی ہے

مدت کے بھولے بسرے منظر آنکھوں میں پھر جاتے ہیں
ہوتے ہیں نقش جو دھندلے دھندلے ان میں جلا آجاتی ہے

تاروں سے شب بھر باتیں کرنا جیسے سب کچھ سنتے ہیں
پیغام صبا کے ہاتھوں دیا گویا پہونچا آتی ہے

وہ اگلی ہنسی اگلے آنسو الفت کی راتیں پیار کے دن
سب یاد مجھے کیا آتے ہیں اک جان سی دل میں آتی ہے

سوتے سوتے چونک اٹھتے ہیں اشک آنکھوں میں بھر آتے ہیں
اور دل کی چوٹ کو تازہ کرنے آہِ سرد بھی آتی ہے

پھر دل میں لہریں اٹھتی ہیں بحرِ عشق میں بہنے کی
پھر سر میں سودا ہوتا ہے پھر زلفِ دوتا یاد آتی ہے

دنیا میں تصور کی پھر کچھ تصویریں چلتی پھرتی ہیں
جو آگ دبی ہے مدت کی یاد اسکو پھر بھڑکاتی ہے

جذبات سے دم گھٹ جاتا ہے انگڑائی لیکر اٹھتا ہوں
ہیجان سا دل میں ہوتا ہے اور خون میں تیزی آتی ہے

پھر آپ ہی اپنے نظارہ سے بیخود سا بن جاتا ہوں
گو ہوش میں ہوتا ہوں لیکن بیہوشی سے چھا جاتی ہے

اشعار ایسی بیخبری میں جب لکھتا ہوں اور روتا ہوں
کم ہوتا ہے طوفاں دل کا اور نیند مجھے آجاتی ہے

اصول تعلیم

از جناب مرزا محمد ہادی صاحب رسوا لکھنوی بی اے

از روئے عقل تین ۳ طرح کی تعلیم ہونی چاہیئے:-

(۱) جسمانی یا طبعی

ورزشیں مثلاً کشتی مفید کھیل کود نہ ایسے کھیل جس سے بلا ضرورت تھکن پیدا ہو، بلکہ معتدل قسم کے کھیل ہونے چاہئیں جن کا اصل اصول یہ ہے کہ طبیعت اس سے اکتائے نہیں بلکہ اس میں دل لگا رہے۔ اور فی الجملہ ورزش بھی ہو اور دلچسپی بھی ہو۔ یونانین قدیم نے دوڑ دھوپ کو ایک اعلیٰ درجہ کی ورزش قرار دیا تھا اور اس میں مرد عورت دونوں داخل تھے بیس ۲۰ چالیس ۴۰ میل تک دوڑنا کوئی بات نہ تھی یہ ترقی ایسی تدریجی طور سے ہوتی تھی کہ مبتدی اس سے گھبراتا تھا نہ زیادہ تھکتا تھا۔

(۲) عقلی

اس کے لئے میں نہایت مناسب سمجھتا ہوں کہ خواص الاعداد اور ہندسی شکلوں کی معرفت بچوں کو ابتدائے سن میں حاصل ہو جائے مثلاً اعداد میں فرد کیا ہیں زوج کیا ہیں اور ہندسی شکلوں میں مربع مستطیل دائرہ ان کے سلیس خواص بتائے جائیں۔

(۳) اخلاقی

مجھے خوب یاد ہے کہ فارس قدیم میں سچ بولنے کی عادت کرائی جاتی تھی اور اس کی خلاف ورزی کے لئے سخت تعذیریں مقرر تھیں ان کو سچ بولنے کی ایسی ہی مشق ہوتی تھی جیسے آجکل لکھنا پڑھنا سیکھتے ہیں مگر آجکل بخلاف اس کے جھوٹ بولنے کی مشق کیجاتی ہے اور اس کو چالاکی اور ذہنیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ فقط

پرورشِ اطفال

ڈاکٹر عبدالرحمٰن ایم۔بی۔ سی۔ اچ۔ ڈی۔ ٹی۔ ایم اینڈ ایچ (اڈنبرا)

نومولود بچے کی غذا

بچے کی پیدائش کے عموماً تیسرے دن ماں کو دودھ آنے لگتا ہے اس وقت تک بچہ کو خاص طور سے غذا کی ضرورت نہیں ہوتی۔ صرف تھوڑی شکر ملاکر پانی دینا کافی ہوتا ہے لیکن جو پانی بچہ کو پلایا جائے بہتر ہے کہ اُس کو پہلے اُبال لیا جائے۔ اگر تھوڑا سا پانی صبح میں اُبال کر رکھ دیا جائے تو وہ دوسرے روز صبح تک استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یہ احتیاط ایسے مقام پر لازمی ہوتی ہے جہاں کنویں یا نہر کا پانی استعمال کیا جاتا ہو۔ اگر اس پر اکتفا نہ ہوسکے اور بچہ بھوک سے زیادہ روئے تو پانی میں قلیل مقدار گائے کے دودھ کی ملادی جائے لیکن یہ زیادہ نہیں ہونی چاہیئے۔ آدھی پیالی پانی میں دو چائے کے چمچہ برابر دودھ کافی ہے اگر گائے کا دودھ میسر نہ ہو تو مصنوعی (ڈبہ کا) دودھ Nestle's Milkmaid's دیا جاسکتا ہے لیکن اس کی مقدار اور بھی کم ہونی چاہیئے ماں کو دودھ آنے کے ساتھ ہی بچہ کو چھاتی سے لگا دینا چاہیئے بچہ اور ماں کی صحت کے واسطے بہتر یہی ہے کہ بچہ ماں ہی کا دودھ پیئے۔ ماں کے ابتدائی دودھ میں قبض کشا اشیاء ہوتی ہیں جس سے بچہ کو اجابت صاف آنے لگتی ہیں۔ یہ جاننا چاہیئے کہ ماں کے دودھ میں جو خواص ہوتے ہیں وہ کسی اور دودھ میں نہیں ہوتے اور بچہ کی عمر کے ساتھ ماں کے دودھ میں تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں جو بچہ کے حق میں مفید اثر رکھتی ہیں۔ اس لحاظ اتنا کا دودھ ماں کے دودھ کا مقابلہ نہیں کرسکتا اور جانوروں کا دودھ تو اس کے پاسنگ کو بھی نہیں آسکتا بلکہ عموماً مضر اثر رکھتا ہے دودھ پلانے سے ماں کی صحت بھی اچھی رہتی ہے۔

پہلے مہینہ میں بچہ کو دودھ ہر دو گھنٹہ پر دینا چاہیئے۔ اگر بچہ کمزور ہو تو اُس سے بھی جلدی جلدی دینا چاہیئے۔ بچہ کو وقتیہ کتنی دیر دودھ پلانا چاہیئے یہ بچہ پر منحصر ہے۔ بعض بچہ بہت آہستہ پیتے ہیں اور بعض جلد اور دس منٹ میں جتنا ان کو ضرورت ہوتی ہے پی لیتے ہیں اوسطاً پندرہ منٹ درکار ہوتے ہیں۔ دودھ پلانے میں جلد بازی نہیں کرنا چاہیئے ابتداءً بچہ اتنا نحیف و کمزور ہوتا ہے کہ مناسب یہ ہے کہ ماں اُس کو لیٹ کر دودھ پلائے اور اپنے ہاتھ سے اُس کے جسم کو سنبھالی رکھے۔ اگر دودھ اچھی طرح نہ نکلتا ہو تو پستان کو باہر کے جانب تیل سے مالش کرے۔ اس بات کا لحاظ کرنا ضروری ہے کہ بچہ کے شُش نہایت کمزور ہوتے ہیں۔ اور ان میں ہوا زیادہ مقدار میں نہیں ہوتی۔ اسی لئے کم عمر بچہ جلد جلد سانس لیتا ہے اور منہ اور ناک دبنے سے اُس کے دم گھٹنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اس لئے بچہ کو اپنے جسم سے بہت زیادہ چمٹانا نہیں چاہیئے۔ خصوصاً جب ماں کو دودھ پلاتے وقت خود سو جانے کی عادت ہو حتی الامکان احتیاط کی جائے کہ دودھ پلاتے وقت ماں کو نیند نہ آئے۔ بچہ کو بھی دودھ پیتے وقت سونے نہ دینا چاہیئے۔ ورنہ وہ کافی دودھ نہیں پیئے گا اور پھر دودھ کے اوقات کا لحاظ رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ اگر بچہ کو دودھ پلانے کے اوقات کا لحاظ رکھا جائے تو تھوڑے روز میں اُس کو عادت ہو جاتی ہے اور انہی اوقات میں وہ دودھ طلب کرتا ہے۔ لیکن اگر بچہ وقت پر دودھ کے واسطے نہ اُٹھے تو اس کو اٹھانا نہیں چاہیئے قدرت خود اُس کا انتظام کرتی ہے اور بچہ خود تھوڑی دیر بعد اُٹھ کر رونے لگتا ہے ہاں کمزور اور نحیف بچوں کی حالت میں یہ بہت ضرور ہے کہ ان کو وقت مقررہ پہ اُٹھا کر دودھ دیا جائے بعض بچے اسقدر نحیف ہوتے ہیں کہ وہ محض کمزوری کی وجہ سے نیم غنودگی کی حالت میں رہتے ہیں اور رونے کی قابلیت نہیں رکھتے۔

دوسری بات جس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ بچہ کتنا دودھ دراصل پیتا ہے۔ کیونکہ صرف چوسنے یا نگل نے کو دیکھنے سے اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا کہ بچہ کافی مقدار دودھ کی پی رہا ہے ایک ماہ کی عمر ہونے تک ڈیڑھ اونس سے ڈھائی اونس تک دودھ وقتیہ پینا چاہیئے اور پھر جیسا عمر بڑھتی جاتی ہے ویسا مقدار میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ پہلے مہینہ میں بچہ کو دودھ دو دو گھنٹے دن میں دینا چاہیئے۔ اور رات میں صرف دو مرتبہ۔ دوسرے اور تیسرے مہینہ میں دن میں ڈھائی ڈھائی گھنٹوں میں دودھ پلایا جائے۔ اور دس بجے رات سے چھ بجے صبح تک بالکل پلانا چاہیئے۔ اگر بچہ رات میں بےچین ہو تو تھوڑا پانی پلا دینا

کافی ہے۔ چند روز میں بچہ کو عادت ہو جاتی ہے اور پھر رات میں وہ دودھ طلب نہیں کرتا ہے۔ اس طرح ماں کے نیند میں خلل نہیں ہوتا اور وہ چین کی نیند سو سکتی ہے جو اس کے صحت کے لئے ضروری ہے۔ یہ طریقہ رات میں دودھ نہ پلانے کا بہت ضروری ہے۔ گو ابتدا میں بعض وقت بچہ کو اس کا عادی بنانے میں ذرا تکلیف ہوتی ہے لیکن اسکو گوارا کرنا چاہئیے۔ یہ عادت نہ صرف ماں کے حق میں مفید ہے بلکہ بچہ کے معدہ کو بھی اس سے رات بھر آرام ملتا ہے اور ہاضمہ پر اچھا اثر پڑتا ہے۔

چوتھے اور پانچویں ماہ میں ہر تین گھنٹہ پر دودھ پلانا چاہئیے اور چھٹے مہینہ میں ہر ساڑھے تین گھنٹہ پر یہ بالکل کافی ہے۔

دودھ پلانے والی ماں کو اپنی صحت کی نگرانی بھی نہایت ضرور ہے۔ اس کے متعلق کسی دوسرے موقع پر بالتفصیل ذکر کیا جائیگا۔ یہاں پر اس پر اسقدر بتلا دینا کافی معلوم ہوتا ہے کہ اکثر عوام میں اس کے متعلق غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے اور ماؤں کو بے ضرورت اکثر مفید چیزوں سے پرہیز کرایا جاتا ہے جس کی وجہ سے بجائے فائدے کے نقصان ہوتا ہے۔ ماں کی صحت کے خرابی سے لامحالہ بچہ کی صحت پر اثر پڑتا ہے اس لئے کہ ایسی حالت میں نہ تو اس کو کافی دودھ مل سکتا ہے اور نہ اس کی نگرانی اچھی طرح ہو سکتی ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہئیے کہ بچہ کے اکثر و بیشتر امراض کی وجہ اس کو بے ترکیبی سے غذا پہنچانا ہے اس لئے یہ یاد رکھنا چاہئیے کہ جس بچہ کو غذا دینے میں احتیاط برتی جاتی ہے اور اس کی نگرانی کافی طور پر ہوتی ہے تو خوش مزاج ہوتا ہے۔ جو بچہ سوتا کم ہے روتا زیادہ ہے اور بے چین رہتا ہے۔ وہ خرابی صحت کو ظاہر کرتا ہے۔

پانی کا استعمال

یہ یاد رکھنا چاہئیے کہ بچوں کی تشنگی بہت زور کی معلوم ہوتی ہے خصوصاً گرم موسم میں بچوں کو پانی نہ دینا جرم میں شمار کیا جانا چاہئیے۔ اکثر اوقات بچے صرف پیاس کی وجہ سے روتے ہیں اور ماؤنکو اس بات کا احساس نہیں ہوتا اور ان کو سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرنا چاہئیے۔ ایسی حالت میں تھوڑا پانی پلا دینا انکے تسکین کا باعث ہوتا ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہئیے کہ پانی (یہ ہمیشہ گرم کیا ہوا ہونا چاہئیے) بچوں کے واسطے مضر صحت نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ معدہ اور آنتوں کو دھو کر صاف کرتا ہے اور اس لئے نہایت مفید چیز ہے بخار کی حالت میں بچہ ہمیشہ پیاسا رہتا ہے اسلئے ایسی حالت میں ہمیشہ اسکو تھوڑی تھوڑی دیر میں پانی پلاتے رہنا چاہئیے اس معمولی بات کا علم اکثر لوگوں کو نہیں ہے کہ پانی قبض کشا ہوتا ہے امعا میں براز کو پتلا کر دیتا ہے اور سدے بننے نہیں دیتا۔ قبض کی عموماً وجہ براز کا سخت ہو جانا ہے جو پھر آسانی سے نکل نہیں سکتا ہے۔

پانچ درویش موٹر میں

پہلی قسط

مسٹر قصیرؔ نے خاص ہمجولی کے لئے انگریزی میں لکھا

برکھا رت تھی ۔ فطرت پر گل و گلزار کا سماں چھایا ہوا تھا ۔ چپہ چپہ فردوسِ نظر بنا ہوا تھا کہ ہم پانچ دوستوں کو ایک دعوت کے سلسلے میں سیر کا شوق چرایا ۔ سیر بھی ایک طرح کی شرفاگردی ہوتی ہے جس میں اچھے خاصے بھلے مانس اس طرح ٹاپتے پھرتے ہیں جیسے ان کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں رہا ۔ یہی گردش ایک روز ہم پر بھی آئی اور ہم پانچوں درویش مختصر سامان کے ساتھ بجائے ریل گاڑی کے موٹر میں بیٹھ اس امید میں سر شام گھر سے نکل کھڑے ہوئے کہ چند گھنٹے میں اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں گے ۔

ہم کون ہیں ؟ ہم کیا ہیں ؟ یہ نہ پوچھئے ، ہم کیسے ہیں البتہ ایک نظر دیکھ لیجئے ۔

ہم میں سے ایک صاحب "لانگ فیلو" ہیں ، یہ "کلِ طویل" یا عوج بن عنق (عوق) تو نہیں کہے جاسکتے البتہ ماشاءاللہ "لم تڑنگ" ضرور ہیں ۔ دوسرے صاحب ان کی ضد "کلِ قصیر" کے مصداق بڑے تیز و چالاک ہیں ان کی ٹمٹماتی ہوئی آنکھوں میں بلا کی شوخی بھری ہوئی ہے ۔ تیسرے بزرگوار ان سب کے "پیرِ طریقت" اور سالارِ قافلہ ہیں جن کی سرکردگی میں ہمیں اس سفر کا موقع ملا ۔ چوتھے حضرت کا قد میانہ اور چھریرا جسم ہے آپ کے چہرے پر متانت اور بردباری کا جھماجھم نور برستا ہے جس کے باعث آپ ازسرتاپا "فیلسوف" معلوم ہوتے ہیں ۔ پانچویں صاحب بھی اپنی کاٹھی اور ڈیل ڈول میں حضرت "فیلسوف" سے کچھ کم نہیں مگر کیونکہ ان کے

فرق مبارک نے بالوں کا بکھیڑا نہیں پالا اس لئے ایک مشہور مقولے کے تحت انھیں صرف خوش نصیب کہا جاسکتا ہے۔

غرض جوں ہی ہم روانہ ہوئے اور جنگل کی سہانی ہواؤں نے طبیعت میں جولانی پیدا کی آپس میں نت نیا مذاق ہونے لگا اور ہم میں کا ہر فرد گویا دنیا کے بکھیڑوں سے بے فکر خوش فعلیاں کرتا دل کشا مناظر دیکھتا موٹر میں اڑا چلا جاتا تھا۔ اس حال میں ہم نے مشکل سے بیس ۲۰ پچیس ۲۵ میل طے کئے ہونگے کہ چاروں طرف سے کالی کالی گھٹائیں اُٹھ کر دم کے دم میں سروں پر چھاگئیں اور گرج چمک شروع ہوگئی۔ شام بھی ہو رہی تھی اس لئے ابر کا اندھیرا رات کی تاریکی کا سا لطف دے رہا تھا آخر پہلے ہلکی پھوار پڑنی شروع ہوئی اور پھر زور سے مینہ کا تڑیڑا آکر موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ اس حالت میں بھی ہم نے کوئی نصف میل طے کر لیا اس اُمید پر کہ اگر بارش نے طول کھینچا تو موٹر کے پردے لگاکر ہم لوگ بالکل محفوظ ہو جائیں گے لیکن اب سب جل تھل ہو چکا تھا اور طوفان نوح کا نقشہ آنکھوں میں پھر رہا تھا جس میں ہماری ناچیز موٹر نوح کی کشتی بنی ہوئی

کشتی درونِ دریا، دریا درونِ کشتی!

کا تماشا دکھا رہی تھی۔ اب پردوں کی تلاش شروع ہوئی مگر یہ معلوم ہو کر سناٹا چھا گیا کہ پردے ہم لوگ گھر ہی چھوڑ آئے تھے۔ ہوا اور پانی کے ارد گرد کے حملوں نے ہمیں شورابور کر دیا تھا خوش قسمتی سے ہمارے خضر راہ حضرت پیر طریقت نے ایک شطرنجی ساتھ رکھ لی تھی جو اس وقت بڑا کام دے گئی ہم نے اسے تان کر پردوں کا کام لیا مگر ہوا کی تیزی سے اس بھیگی ہوئی شطرنجی کے دامن کے تھپیڑوں نے ہم سب کا مزاج بحال کر دیا۔

غرض ہم یوں ہی لشتم پشتم چلے جاتے تھے اور ہماری منزل مقصود ابھی کوئی دس میل باقی ہوگی کہ ایک نالے کا ٹوٹا ہوا پل ملا۔ ارادہ کیا کہ اسے کسی پایاب اور قابل گزر مقام سے عبور کیا جائے اور اس لئے موٹر کو ایک ایسے مقام پر لے آئے جہاں نالے کا پاٹ دس فیٹ اور عمق ایک فیٹ سے زیادہ نہ تھا مگر پانی کی تیزی سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ موٹر تو کیا ہاتھی بھی تاب نہ لاسکے گا۔

اب سفر کا دلچسپ حصہ شروع ہوتا ہے ہم سے ایک صاحب چھڑی لے کر اس نیت سے اترے کہ پانی کی گہرائی کا اندازہ کریں معلوم ہوا کہ پانی کی گہرائی تقریباً پانچ فیٹ ہے انھوں نے ہمت کرکے

نالے کو عبور کرنے کی کوشش کی اور پانی میں جھکولے کھاتے اور خود کو سنبھالتے دوسرے کنارے جا پہنچے اور وہاں سے بہ آواز بلند کہا کہ یہ ریتیلا مقام ہے موٹر آسانی سے گزر سکتی ہے۔ اس پر مسٹر دراز قد جنھیں موٹر رانی میں ید طولیٰ حاصل ہے لپک کر موٹر چلانے کے لئے آ بیٹھے اور خدا کا نام لے کر موٹر کو پانی میں ڈال دیا مگر فوراً ہی اگلے پہیے کیچڑ میں پھنس گئے اور ساتھ ہی پیچھے کے پہیوں کو اسقدر زور کا جھٹکا لگا کہ موٹر اژدہا کی طرح پھنکار مار کے خاموش ہو گئی اب ہم کیچڑ اور پانی میں پھنسے ہوئے کھڑے اللہ کو یاد کر رہے تھے رات ہو چکی تھی اور اندھیرا اس بلا کا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سوجھائی نہ دیتا تھا اور ہماری پریشانی اور مایوسی بڑھ رہی تھی اور ہم میں کا ہر شخص اس بھنور سے نکلنے کی جان توڑ کوشش کر رہا تھا۔

اب بارش میں کچھ کمی ہو گئی تھی کہ دراز قد صاحب کو دور کی سوجھی اور ان حضرت نے پیر طریقت کی شطرنجی موٹر کے پہیوں کے نیچے رکھ کر موٹر کو پھر آگے بڑھایا اس کا نتیجہ ہوا کہ اب چاروں پہیے زمین دوز ہو گئے۔ واقعہ یہ ہے کہ مصیبت تنہا نہیں آتی اور اب پانی کا زور اور بڑھنے لگا۔ موٹر پانی میں تھی اور ہم موٹر میں تھے اور حضرت لم تڑنگ موٹر کی کان مروڑی نہایت استقلال سے کئے جا رہے تھے۔ اُدھر میاں خوش نصیب خشکی پر مامون و مصئون کھڑے ہوئے ہم لوگوں کو جرات اور ہمت دلا رہے تھے ہم نے بھی ان کی ہمنوائی کی اور اب سب کی آوازیں مل جُل کر ایسا منظر پیش کر رہی تھیں جیسے گاڑی والے اوس وقت بیلوں کی ہمت بڑھانے کے لئے چیخ و پکار کرتے ہیں جب ان کی گاڑی کیچڑ یا دلدل میں پھنس جاتی ہے اس اندھا دندھ اور مار امار کوشش کا یہ نتیجہ ہوا کہ موٹر بیچ نالے میں آکر نصف سے زیادہ نالے میں دھنس گئی۔ پانی موٹر میں بھر گیا اور اندیشہ ہوا کہ کہیں ہم بھی دریا برد نہو جائیں۔ اس خیال کے آتے ہی پہلے حضرت پیر طریقت نے اپنی شیروانی اور پاجامے کو سنبھالتے ہوئے ایک جست لگائی اور ان کے ساتھ ہی پستہ قد صاحب موٹر سے کود نکلے اب دراز قد صاحب کی باری تھی انھوں نے بھی دس پانچ لمبے لمبے ہاتھ پاؤں مار نالے کو عبور کر لیا مگر حضرت فیلسوف نے انتہائی استقلال دکھایا اور "بھاگتے بھوت کی لنگوٹی بھلی" کے مصداق انھوں نے یہ سوچکر کہ چلتے چلاتے جو چیز ہاتھ لگ جائے غنیمت ہے موٹر کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ ادھر پانی زور کر

رہا تھا اوہر ہمارے ہیرو فیلسوف صاحب کی تلاش جاری تھی۔

ہم لوگوں نے کنارے آکر جب دم لیا اور دیکھا کہ فیلسوف صاحب انتہائی ایثار سے کام لے رہے ہیں تب ہم نے اپنی اپنی چیزیں یاد کر کے کہنا شروع کیا:

"میری شیروانی؟"

"بہ گئی!" حضرت فیلسوف فوراً بول اُٹھے

"بھائی کپڑوں کا صندوق"

"غائب ہے!"

"میرا تھرماس؟"

"بہ گیا!"

"میرا سگریٹ کا ڈبہ؟"

"بہ گیا!"

"خدا کے لئے تم تو نکلو؟"

"بہ گیا!"

اسپر بڑا فرمائشی قہقہہ پڑا کیونکہ فیلسوف صاحب نے بدحواسی کی ترنگ میں سب کو ایک ہی لکڑی سے ہنکا دیا تھا۔

اس عرصہ میں سیلاب کا زور بے انتہا بڑھ گیا تھا اور نالے کا پاٹ دمبدم چوڑا ہوتا جا رہا تھا اور اسی کے ساتھ ہماری بدحواسی بھی بڑھتی جا رہی تھی خیال تھا کہ فیلسوف صاحب کہیں داغ مفارقت نہ دیجائیں اس لئے سب زور سے چیخ اُٹھے۔

"کود و! کود و!!"

حضرت فیلسوف نے فوراً موٹر سے سر نکالا اور جونہی سیلاب کی مصیبت کا خیال آیا آپ بغل میں دو چار چیزیں دبائے دہم سے پانی میں کود موٹر کے قریب غوطے کھانے لگے۔ (باقی آئندہ)

چونچال بچے

مُدیرہ کی اہم اور دلچسپ ترین تحریک

(دُوسری قسط)

نوٹ:۔ اس تحریک کے مختلف پہلوؤں کی مزید وضاحت کے لئے پہلی کا گزشتہ نمبر ضرور ملاحظہ فرمایا جائے ورنہ مضمون تشنہ رہیگا۔

مُدیرہ

اس باب میں بچّوں کے ایسے حادثات بھی خاص طور پر درج کئے جائیں گے جن سے خدانخواستہ انھیں دوچار ہونا پڑا ہو اور اُن تدابیر کا بھی ذکر ہوگا جو اُن کے دفعیے کے لئے اختیار کی گئیں ہوں۔ اس قسم کا اندراج دوسرے والدین کے لئے مشعلِ ہدایت ہوگا اور انھیں طرح طرح کی پریشانیوں سے بروقت نجات دلا سکے گا۔ بہت سے گھریلو علاج اور سہل الحصول معالجے ایسے ہیں جن سے صرف بڑی بوڑھیاں ہی خوب واقف ہوتی ہیں اور ان کے سونف و پودینے میں اس بلا کا جادو ہوتا ہے کہ ادھر بچوں کو استعمال کرایا گیا اور اُدھر اُن کی حالت رو بہ اصلاح ہوئی مگر افسوس کہ آج جوں جوں ان کا مبارک سایہ سروں پر سے اٹھتا جاتا ہے ہماری اس معلومات میں بھی دن بدن کمی ہوتی چلی جارہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج ذرا ذرا سی بیماریوں سے خوفزدہ ہو کر فوراً ڈاکٹروں اور طبیبوں کی طرف رجوع کیا جاتا ہے بلکہ عنقریب ایسا وقت آنے والا ہے جب کہ موجودہ نانی کو مشکل سے اس بات کا یقین آئے گا کہ ان کی نانی اور دادیوں

کے دستِ شفقت میں ایسی کرامات تھی کہ بچوں کے بیسوں امراض کے علاج وہ خود کرلیا کرتی تھیں اور مشکل سے کسی طبیب کو بلانے کی نوبت آیا کرتی تھی مگر آج جس قدر تعلیم کا معیار بلند ہوتا چلا جاتا ہے افسوس ہے کہ اُسی قدر ہماری لڑکیاں اور لڑکے اس کی گلچھیوں میں پھنسے ہوئے عملی زندگی سے دور اور بیگانہ ہوتے چلے جاتے ہیں اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ آخر اس کا کیا نتیجہ ہونے والا ہے۔

قوائے عقلیہ کے ساتھ ساتھ بچوں کی جسمانی اور چہرے مہرے کی ساخت کی تدریجی تبدیلیوں کے نمایاں کرنے کے لئے ہم نے یہ التزام کیا ہے کہ بچوں کی مذکورہ دلچسپ باتوں کے ساتھ ہم ان کے فوٹو بھی شایع کرتے رہیں اس سے نہ صرف ہماری تحریک میں اک جان پڑجائے گی بلکہ آپ کے عزیز بچوں کی صحت و توانائی کی حقیقی تصویروں کا ایک ایسا لاجواب البم تیار ہوجائے گا جسے وہ سنِ شعور کو پہنچکر اپنی زندگی کا سب سے گرانبہا خزانہ سمجھیں گے۔ انھیں اپنے ماضی اور اس کے ماحول کے سمجھنے کا بےنظیر موقعہ حاصل رہے گا اور اگر آپ نے ان کی زندگی کے اس ابتدائی دور میں ان کی مناسب آسایش، معقول پرورش اور کافی نگہداشت کا قرار واقعی لحاظ رکھا ہوگا جس کی شہادت تصویر دیگی۔ تو کیا آپ اپنی اولاد کی اُس خوشی اور سپاس گذاری کا اندازہ کرسکیں گے جو ہمجولی کے اس لاجواب البم کو دیکھ کر ان پر طاری ہوگی؟ اس قسم کی جس قدر تصاویر وقتاً فوقتاً شایع ہوتی رہیں گی سال کے اختتام پر اُنہیں سے صرف ایسی تصویروں پر انعامات دئے جائیں گے جو والدین کی "ذاتی" احتیاط، پرداخت، سلیقے اور رکھ رکھاؤ کی بہترین مثالیں ہونگی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ بچے تندرست ہوں گے۔

ممکن ہے کہ بعض بےشعور اور ناعاقبت اندیش والدین کو اس تحریک سے اتفاق نہ ہو مگر مجھے قوم کے لائق اور ہوشمند والدین سے پوری توقع ہے کہ وہ نزاکت حال کا لحاظ کرتے ہوئے نہ صرف میری اس آواز پر ضرور توجہ فرماویں گے بلکہ ادب لطیف یا اسی قبیل کی دوسری ادبیات کو سرِ دست بالائے طاق رکھ کر حسب استطاعت ایسے مضامین تحریر فرمانے کی کوشش کریں گے جو بچوں یا ان کے والدین کے لئے حقیقی طور پر مفید کہے جاسکیں کیونکہ موجودہ ہنگامہ حیات کے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی تعمیری کام نہیں ہے اسی کے ذریعے ہم اپنی اولاد یا آنے والی قوم کے لئے کوئی بہتر کی سبیل پیدا کرسکتے ہیں ہمیں پورا احساس ہے کہ ہماری

حیات قومی کے تیس چالیس سال یوں اللّے تللّوں میں
گذر گئے مگر اب ایک ایک لمحے کا ضائع کرنا معصیت ہوگی
اور دیدہ و دانستہ اپنی اولاد کو اب تباہ نہ کیا جائے گا
کیونکہ قوم کا شاندار مستقبل بس اسی معصوم مخلوق کے
دامن سے وابستہ ہے اور اگر ہم نے اب بھی تغافل سے
کام لیا تو یقین مانئے کہ پھر کہیں اگر ہم کو پناہ مل سکتی ہے
تو وہ صرف جہنم ہے۔

اس وقت ایسے خوش باش والدین کی بھی کمی
نہیں جو اپنی عمر اور دولت کا معتدبہ حصہ مختلف
لہو لعب میں گذار رہے ہیں۔ تجارتی اغراض کے قطع نظر
کسی کو تصویر دار پوسٹ کارڈ جمع کرنے کی لت ہے تو
کوئی مستعملہ ٹکٹ فراہم کرنے میں وقت اور روپیہ
برباد کرتا ہے کسی کو پرانے سکے جمع کرنے کا شوق
ہے تو کوئی پرانی چینی اور آثار قدیمہ کے ٹوٹے پھوٹے
برتن جمع کرنے پر جان دیتا ہے غرض ان میں کا ہر
شخص "بخیالِ خویش خبطے دارد" کی زندہ مثال
بنا ہوا ہے۔ گو وہ اپنے اس ذوق کی اضافی قدر و قیمت
سے واقف ضرور ہے مگر انہیں ذاتی نمائش کو فائدے
پر محض اس لئے مقدم سمجھا جاتا ہے کہ ہمچشموں اور
اقران و امثال میں اپنے "عجوبہ ذوق" کے مظاہرے
سے تحسین و آفرین کا غلغلہ بلند کیا جا سکے۔

اس علت کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اس ذہنیت
کے والدین چونکہ اپنے ذوق اور تفریح کے مشاغل کو
پورا کرنے کے لئے کوئی موزوں اور صحیح راستے تلاش
نہیں کر سکتے اس لئے بھی صرف اس سطحی اور نمائشی
جنجال میں پھنس کر وہ اپنی اوقات تباہ کر لیتے ہیں کاش
اگر وہ ذرا بھی توجہ کریں تو انکی نظر التفات کے لئے
ان کے بچوں کی پر بہار زندگی کے ایسے جنت نظیر نظارے
سامنے آ موجود ہوں گے جن کی دلکشی اور لطافت
میں ان کے تمام ذوق کی صدہا سبیلیں پائی جا سکتی
ہیں۔ اس کے لئے دُور جانے کی ضرورت نہیں، اس
کے لئے بیدھڑک روپیہ خرچ کرنے کی ضرورت نہیں
ان کی صرف ذرا سی توجہ سے ان صفحات میں بہت کچھ
سامان تفریح پیدا ہو سکتے ہیں بشرطیکہ والدین
اپنے بچوں کی اُس ابتدائی پرداخت سے غافل نہ
رہیں جن کا اوپر تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ اس سے نہ صرف
والدین کو ایک نہایت دلچسپ اور کارآمد مشغلہ ہاتھ
آجائے گا بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ بچوں کی اس
عمدگی سے پرورش و تربیت ہوتی رہے گی جس کا
بحالت موجودہ آپ کو محض اس لئے اندازہ نہیں ہو سکتا
کہ یہ ایک بالکل نیا تجربہ ہے۔ اس کے عملی ثبوت کے
لئے بس آغاز کار کی ضرورت ہے۔ دیکھیں کون سے

ذی ہوش اور درد مند والدین اس اہم تحریک کی طرف توجہ فرماتے ہیں اور کہاں تک ان کا یہ دعویٰ پورا ہوتا ہے کہ :-

"ہمیں اپنی اولاد سے بڑی سچی محبت ہے"

میرے پاس لیڈی گریوز Lady Greaves کی لکھی ہوئی ایک کتاب موجود ہے جس میں اس خاتون نے خط وکتابت کی صورت میں اپنے پالتو کتے "بٹی" کے حالات زندگی پر بڑی واضح روشنی ڈالی ہے اور اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اس کتاب کو آرٹ پیپر پر چھپوا کر جگہ جگہ "بٹی" کی تصویروں سے اسے مزین بھی کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کتنی ذہنیت کا خاتون مذکور نے کس غور و فکر سے مطالعہ کیا ہوگا؟

غرض لوگ جب کتے بلیوں کی ذہنیت اور افتاد طبیعت کا عمیق نظروں سے مطالعہ کرکے چاؤ چوچلے سے ان کی باتصویر سوانح حیات تک شائع کرا دیتے ہیں تو کیا خدانخواستہ ہمارے بچے ان کتے بلیوں سے بھی گئے گذرے ہوئے جو ہم اپنی آنکھیں بند کئے انھیں گھاس پھونس کی طرح بڑھنے دیں اور ان کی نفسی کیفیات اور دل و دماغ کی قوتوں سے اس قدر بے اعتنائی برتیں کہ گو ان کی پرورش ہو جائے لیکن ان کا اٹھان اور قوائے ذہنی بالکل حیوانوں کے سے رہیں۔ وہ نہتے دنیا میں داخل ہوں اور اپنی مدافعت کے لئے کوئی کارگر حربہ ساتھ نہ رکھتے ہوں۔ اگر یہی لیل و نہار رہے تو یاد رکھئے کہ اس ننھی اور معصوم مخلوق کی زندگی میں ایک ایسا وقت بھی آنے والا ہے جبکہ کشمکش حیات سے ان کی آنکھیں کھلیں گی لیکن اُس وقت پانی سر سے اونچا ہو چکا ہوگا، کوئی تدبیر کارگر ثابت نہ ہوگی اور قدرت کا فولادی ہاتھ والدین کے نامۂ اعمال میں تباہی کی اُس خون چکاں داستان پاستان کو جلی حروف میں رقم کر چکا ہوگا۔

ابھی وقت ہے مہلت ضائع نہ کی جائے اور قوم کی فلاح وبہبودی کی جہاں دیگر تدبیروں پر غور کیا جاتا ہے اس بنیادی تحریک پر بھی سنجیدگی سے غور کیا جائے تو وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ کچھ دن کے بعد یہی دلچسپ مشغلہ تعمیری کاموں کے لئے حقیقی سنگِ بنیاد کا کام دیگا

یہ مضمون ضرورت سے زیادہ طولانی ہو چکا ہے اور اب زیادہ لکھنے کی اس جگہ گنجائش نہیں البتہ آئندہ یہ باب اپنے اصلی رنگ و روپ میں پیش کیا جائے گا کیونکہ یہ ایک بالکل نئی چیز ہے اور ممکن ہے کہ اسکے سمجھنے میں کوئی الجھن ہو لہٰذا ایک مشہور مقولے کے تحت میں

اپنے ہی گھر اور بچوں سے اس کی ابتدا کرنی چاہتی ہوں اس لئے اگلے پرچہ میں انشاء اللہ اپنے بڑے لڑکے برخوردار امان اللہ خاں خویشگی (امن میاں) کے کچھ لطیفے اور حالات لکھوں گی جس کی ایک تصویر گذشتہ نمبر میں شائع کر چکی ہوں کیونکہ یہ بچہ ابھی بہت کم عمر ہے لہٰذا طبعاً اس سے زیادہ توقع نہیں کی جا سکتی۔ البتہ وہ بہن بھائی جن کے بچے نسبتاً ماشاء اللہ زیادہ عمر کے ہیں اس تحریک کو سمجھکر یا اگلا پرچہ دیکھ کر اپنے بچوں کے تفصیلی حالات بھیجنا شروع کر دیں تو یہ باب اس قدر دلچسپ ہو جائیگا جس کی نظیر ادب میں مشکل سے ملیگی۔ باقی دارد۔

یہ باب عام اظہار آرا کے لئے ہر وقت کھلا ہوا ہے لہٰذا رائے عالی سے بے تکلف ایما فرمایا جا سکتا ہے

سنگ مرمر کی ایک زبردست کان

ابھی حال میں مولوی محمد نظام الدین صاحب ایم بی ایچ بی وظیفہ یاب انجینیر نے علاقہ سرکار عالی قاضی پیٹھ بجواڑہ لائن کے ریلوے اسٹیشن پاپٹ پلی سے دس میل کے فاصلے پر موضع جانسٹہ پلّی میں دریافت کی ہے جس کا سنگ مرمر استحکام وصفائی وخوبصورتی میں اپنا نظیر نہیں رکھتا۔

اس کان کے کھودنے اور سنگ مرمر حاصل کرنے کے لئے آپ ابھی یورپ جاکر واپس تشریف لائے ہیں۔ اور پانچ لاکھ روپیہ سکہ کلدار کے مجوزہ سرمایہ سے ایک کمپنی بنام

دی دکن ماربل اینڈ مائننگ کمپنی لمیٹڈ

قائم کی ہے جو سو سو روپے کے پانچہزار حصص پر منقسم ہے ملک کے مشہور امرا و اعلیٰ عہدہ دار اس کے ڈائرکٹر ہیں اگر آپ کو اس کمپنی سے دلچسپی ہے اور اس دریافت سے آپ معقول فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انگریزی یا اردو پراسپکٹس اور درخواست کے فارم پتہ ذیل سے طلب فرمایئے

دی دکن ماربل اینڈ مائننگ کمپنی لمیٹڈ

نارائن گوڑہ حیدرآباد دکن

ہمجولی بابتہ ماہ آبان ۱۳۴۰ف م ستمبر ۱۹۳۱ء

جلد (۱) ترتیب: سیدہ بیگم خویشگی۔ فتح میدان حیدرآباد دکن نمبر (۳)

عہد آفرین پریس میں چھپکر دفتر رسالہ ہمجولی سے شائع ہوا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہمجولی

"دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے"

'آپ بیتی' کے لکھنے سے مقصد اپنی شہرت یا تعریف بالکل نہیں ہے، صرف واقعات سنا کر لوگوں کو آگاہ کرنا ہے کہ والدین کی تھوڑی سی ناعاقبت اندیشی سے لڑکیوں کو کن مصائب اور تکالیف سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور ان کی زندگی کیسی تباہ ہو جاتی ہے"

اس مختصر اور سیدھی سادی تمہید کے ساتھ ملک کی ایک لائق مگر غم نصیب خاتون نے ایک مضمون بہ عنوان "آپ بیتی" خاص ہمجولی کے لئے قلمبند فرما کر ہمیں بغرض اشاعت بھیجا ہے، جس میں دکھایا گیا ہے کہ بعض سنگدل اور ناعاقبت اندیش والدین یا سرپرست کسی خاص اثر یا جذبے سے مغلوب ہو کر کس طرح اپنی عزیز لڑکیوں کو ایسے اجنبی مردوں کے پلے باندھ دیتے ہیں جن کے عادات و اطوار کو کبھی بغور و تعمق کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا، اور اس کا کھلا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر معصوم لڑکیاں جو ابتداء ہی سے رسم و رواج کی قیود میں طرح طرح سے جکڑی ہوئی رہتی ہیں اس مصیبت کے پہاڑ کے ٹوٹنے کے بعد پھر کہیں کی نہیں رہتیں۔ ان کی لہلہاتی ہوئی امنگوں پر حرماں نصیبی کے بادل امنڈ آتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے مایوسی کی برق باریوں سے ان کی عزیز اور پربہار زندگی خاک میں مل جاتی ہے۔

خاتون موصوف جنھوں نے یہ مضمون لکھا ہے سوءِ اتفاق سے خود اس مظلمہ کی زندہ مثال ہیں اس لئے واقعات کی روشنی میں ان کا یہ احتجاج کسی طرح بے جا نہیں کہا جا سکتا۔ اُمید ہے کہ یہ عبرت کی داستان بہت غور اور توجہ سے پڑھی جائے گی جس کا فقرہ فقرہ اثر میں ڈوبا ہوا ہے اور غیر محتاط والدین اس موقعہ پر اپنی جلد بازی کے عواقب کو پیش نظر رکھتے ہوئے کسی ایسے اخلاقی فریضے کی بجاآوری میں کوتاہی سے کام نہ لیں گے جو مبادا ایسی محترم اور بزرگ ہستیوں کے لئے کلنک کا ٹیکہ ثابت ہو۔

آج کل کی اصطلاح میں جس یاوہ گوئی کو ادب لطیف کہا جاتا ہے اس سے اس مضمون کو کوئی واسطہ نہیں یہ اس لئے نہیں لکھا گیا ہے کہ اپنا اور دوسروں کا وقت غارت کیا جائے بلکہ اس میں ناعاقبت اندیش والدین اور ایک نفس پرست شوہر کے افعال کو زیر بحث لا کر قوم کو ایک ایسے خطرے سے آگاہ کیا گیا ہے جس کی تباہ کاریوں کے دل گداز مناظر سے آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ نتیجہ خیز مضمون چونکہ غلو اور لفظی ٹیپ ٹاپ سے پاک ہے اور اس کا ہر پہلو سبق آموز ہے نیز اس میں:

نہ کچھ مضموں طرازی ہے نہ کچھ رنگیں بیانی ہے

حقیقت اور امرِ واقعی سچی کہانی ہے

اس لئے قرار پایا ہے کہ خاتون موصوف کو اس کے صلے میں ایک اشرفی نذر کی جائے، اُمید ہے کہ وہ اپنی دستخطی رسید بھیجکر دفتر ہجولی سے یہ اشرفی حاصل کریں گی۔

ہمیں افسوس ہے کہ یہ مضمون قلت گنجائش کے سبب اس نمبر میں نہ آسکا اور نہ اسے قسط وار شائع کرنا مقصود تھا لہذا اگلی اشاعت میں انشاء اللہ اسے مکمل حالت میں پیش کر دیا جائے گا قدرے انتظار فرمایا جائے۔

یہ مضمون اس قابل تھا کہ اصولاً اس کے حقوق طبع محفوظ کر دئے جاتے لیکن چونکہ یہ ایک اصلاحی مضمون ہے اور اس قابل ہے کہ ہندوستان کے ہر گھرانے میں پڑھا جائے لہذا نہایت خوشی سے اجازت دیجاتی ہے کہ جس طرح ہجولی کے اور مضامین نقل کئے جاتے ہیں اسی طرح یہ خاص مضمون بھی نقل کر کے ملک کے گوشے گوشے تک پہنچا دیا جائے تاکہ ہر چھوٹا اور بڑا حسب مقدرت اس سے سبق حاصل کر سکے۔ اور اگر اس سے ایک زندگی بھی سنبھل گئی تو گویا ہجولی کو اپنی محنت کا پھل مل جائے گا:

خاطرِ یک دو کس ار از تو شود شاد بس است
زندگانی بہ مرادِ ہمہ کس نتوان کرد

وہ ارباب ذوق جو "ہمجولی" کی کامیابی کی ارتقائی منازل بڑے غور سے ملاحظہ فرمارہے ہیں یہ سُن کر مسرور ہوں گے کہ جہاں پبلک نے امید سے زیادہ اس نونہال کی قدرافزائی فرمائی ہے وہاں ملک کے امرائے عالی وقار بھی اس جانب خاص طور پر متوجہ نظر آرہے ہیں۔ چنانچہ حال ہی میں ہز اکسلنسی نواب فخرالملک بہادر جیسی محترم ہستی نے ازراہِ تلطف مبلغ ۵ سالانہ کی امداد بطور خاص منظور فرماکر ہمجولی کو اپنے ہم جنسوں میں ایک امتیازی افتخار عطا فرمادیا ہے جس کے لئے ہم نواب صاحب ممدوح کے بے انتہا شکر گذار ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ آپ کے سایہ عاطفت میں اسے مدّت مدید تک پھلنے پھولنے کا موقعہ نصیب ہو۔

جو پوچھا ہیں از رہِ قدر دانی
عنایت، نوازش، کرم، مہربانی

یہ ہمجولی کی خوش قسمتی ہے کہ ایسے دریا دل، عالی ہمم اور علم دوست امیر کبیر کی توجہات عالی کا مرکز بن جانے میں وہ اس قدر جلد کامیاب ہوگیا ہے جو اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ ہز اکسلنسی کو قوم کے نونہالوں اور نوجوانوں کی فلاح وبہبودی کا کس درجہ خیال ہے اور آں محترم اپنے لطفِ عمیم سے ایک ایسے ہونہار ماہ نامے کو محروم رکھنا پسند نہیں فرماتے جس کے پاکیزہ ادب اور ستھرے مذاق کی ملک میں دھوم مچ گئی ہے۔

اس موقع پر ہم ہز اکسلنسی لیڈی فخرالملک بہادر کو کسی طرح نہیں بھول سکتے جو ہماری ان کوششوں کو طبعًا بے انتہا پسند فرماتیں لیکن افسوس ہے کہ وہ آج دنیا میں موجود نہیں اور اپنے روشن کارناموں کے باعث نسوانی دنیا میں شہرت دوام حاصل فرماکر ایک ایسے عظیم اور پُرشوکت مقبرہ میں راحت کی نیند سو رہی ہیں جو ان کے شوہر محترم کی بے عدیل محبت کی ایک لاثانی یادگار ہے۔

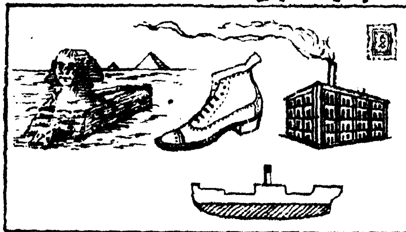
ہم عنقریب اس عجوبہ روزگار عمارت کی تعمیری اور آرائشی خصوصیات پر ایک دلچسپ اور باتصویر مضمون پیش کریں گے جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ نواب صاحب ممدوح نے اس کی تعمیر اور موجودہ طرزِ آرائش میں حسب حوصلہ کس انہماک اور فراخ دلی کا اظہار فرمایا ہے اور یہ صرف اس لئے ہے کہ آئندہ نسلیں "محبت باہمی" کی اس

پُر شوکت اور نتیجہ خیز یادگار کو دیکھ کر ایک ایسا اخلاقی سبق حاصل کر سکیں جس کی استواری میں فی نفسہٖ بقائے عالم کا راز پوشیدہ ہے:

تمھیں کہتا ہے مردہ کون تم زندوں کی زندہ ہو
تمھاری نیکیاں قائم تمھاری خوبیاں باقی

ہم گزشتہ دو نمبروں میں اُن تمام کرم فرماؤں کا درجہ بدرجہ شکریہ ادا کر چکے ہیں جن سے ہجولی کی نشر و اشاعت میں کچھ بھی مدد مل سکی ہے لیکن افسوس ہے کہ محکمہ ڈاک خانہ کا ابتک ذکر خیر نہ آسکا جس کے تعاون پر صحافت کی ترقی کا بہت کچھ دارومدار ہے۔ ممکن ہے کہ آپ نے تمدن کے اس اہم ادارے کی "ہوشمندی" یا "بدحواسی" کی داستانیں سنی ہوں لیکن آج ہم اس کے جن کارناموں پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں وہ نہ صرف دلچسپ ہیں بلکہ اس بات کے بھی شاہد عادل ہیں کہ فرض شناسی کی مثالوں میں ذیلی مذاکرات کا پایہ بہت بلند ہے!

لندن کے خوش باش جو آئے دن اپنی تفریح طبع کے لئے نت نئے مشاغل تراشتے رہتے ہیں ایک دن ڈاک خانہ سے صرف اس بات پر الجھ گئے کہ اس نے اپنی سالانہ رپورٹ میں اپنے کارناموں کے متعلق ضرورت سے زیادہ کیوں گیت گائے۔ چنانچہ قرار پایا کہ اس کی عملی آزمائش کی جائے اور جانچا جائے کہ لندن



کا عظیم الشان ڈاک خانہ کتنے پانی میں ہے۔ غرض ایک خط لکھکر بند کیا گیا اور پتہ کی جگہ چیستاں Rebus میں کچھ لکھکر اسے لٹر بکس کے حوالے کر دیا گیا اور اس کا انتظار کیا جانے لگا کہ صرف ایک آنے کے ٹکٹ میں ڈاک خانہ کیا تماشہ دکھاتا ہے!

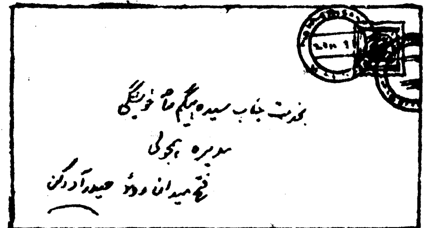
خط اپنے مدار پر گردش کرتا ہوا سارٹر صاحب کے ہاتھ میں پہنچ گیا لیکن وہ بادی النظر میں اس

غیر معمولی تحریر کو پڑھ کر سوچ میں پڑ گئے اور آنکھیں مل کر پھر جو پتہ پر نظر جمائی تو مذکورۂ بالا نقشہ نظر آیا۔

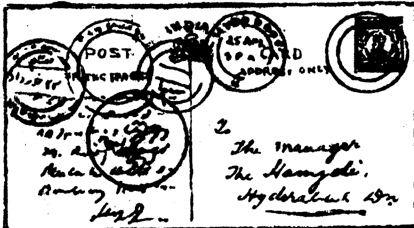
"کیا مزخرافات ہے!" کہتے ہوئے انھوں نے خط کو میز کے کنارے رکھ لیا اور پھر کام میں مشغول ہو گئے مگر اس غیر مانوس اور عجوبہ زا خط نے انھیں کچھ ایسا مبہوت کر رکھا تھا کہ وہ تو دل دہی سے اپنا مفوضہ کام انجام نہ دے سکے اور بار بار کن انکھیوں سے اسے دیکھ لیتے تھے گویا معلوم ہوتا تھا کہ تفتیش کی غرض سے آپ معہ جوتوں کے اس خط میں سما جانے والے ہیں۔ آخر نہ رہا گیا اور وفور خلجان کے باعث پھر خط کو اٹھا لیا اور اب کے اسے ڈِڈ لیٹر آفس سپرد کرنے والے تھے مگر قومی اسپیچ آڑے آگئی اور اب انتہائی متانت سے اس معمے کو حل کرنے پر آمادہ نظر آرہے تھے۔ وہ سوچنے لگے کہ اس کا پتہ ہیروغلیفک تحریر میں لکھا گیا ہے اور اس کا مکتوب الیہ طوطنخ آموں معلوم ہوتا ہے لہذا اسے الاقصر بھیجدیا جائے مگر یہ ایک فضول سی بات تھی لہذا وہ اپنی جگہ سے اٹھ ڈاک خانے کے بوجھ بجھکڑ کے پاس چلے گئے جس کا یہ نتیجہ ہوا در چوبیس گھنٹے کے اندر ہی اندر یہ خط "شہر ہل" پہنچکر مکتوب الیہ کو مل گیا جو فنکس بوٹ فیکٹری کا مالک تھا۔

اب تو ڈاک خانے کی اس کارگزاری کا یورپ بھر میں چرچا ہو گیا اور کوئی اخبار ایسا نہ تھا جس نے اس پر اسرار خط کی تصویریں نہ چھاپی ہوں۔

اب ہمارے ہاں کے ڈاک خانوں کا کارنامہ ملاحظہ ہو۔ ہجولی کے دفتر میں ذیل کے دو خطوط وصول ہوتے ہیں:۔



یہ پہلا خط



دوسرا خط

ان میں سے پہلا خط مقامی ہے جو مغلئی ڈاک کے ذریعے محلہ شاہ گنج سے روانہ کیا گیا ہے جو ہماری قیام گاہ سے شاید چار میل دور ہو، اس کا پتہ نہایت صاف اور واضح ہے جو ڈاکٹر محی الدین قادری کے زور قلم کا نتیجہ ہے

مگر ہمارے سارٹر صاحب "مدیرہ" کے لغت کو دیکھ کر چراغ پا ہو گئے اور حیدرآباد دکن کو بہت ہی غیر اہم سمجھتے ہوئے اسے بے تکلف "مدہرہ" بھیجدیا۔ وہاں کے عقلاء نے اسے مارا مار حیدرآباد واپس کیا تو اس ہیراپھیری میں کہیں نویں دن جاکر ہمیں یہ خط وصول ہوا۔

دوسرا خط' ملابار ہل بمبئی سے چلتا ہے اس کا پتہ بھی انگریزی میں نہایت صاف لکھا ہوتا ہے مگر اب کے امپیریل پوسٹ آفس کے سارٹر صاحب لفظ "ہجولی" کو دیکھ کر بہک جاتے ہیں اور عالم بدحواسی میں اسے "ہنگولی" بھیجدیتے ہیں۔ چنانچہ اسے وہاں سے بھی بیرنگ واپس کیا جاتا ہے اور بیچارے پوسٹ مین صاحب دبے پاؤں ہمارے کمرے میں داخل ہو اسے میز پر رکھ کر چپکے سے فرار ہو جاتے ہیں۔

اب آپ ہی بتلائیے اس ستم ظریفی کا کیا علاج کیا جائے' احتجاج کر نہیں کر سکتے اس لئے کہ خط ہمیں وصول ہو چکے ہیں۔ بہرحال "قہر درویش بجان درویش" کہتے ہوئے اس کارنامے کی تعریف ہی کریں گے اور ویسے بھی صبح کا بھولا ہوا اگر شام کو آ جائے تو اسے تو بھولا نہیں کہا جاتا اس لئے آئندہ احتیاط کی توقع پر یہ معاملہ یہیں ختم کر دیتے ہیں۔

مصر کے دارالسلطنت قاہرہ سے ایک عربی ماہنامہ "الرابطۃ الشرقیۃ" تنقید کے لئے وصول ہوا ہے جو اسی نام کی ایک مشہور انجمن سے ہر انگریزی مہینے کی پندرہ تاریخ کو مقام مذکور سے شائع ہوتا ہے۔ ہمیں رنج کے طور پر معلوم ہوا ہے کہ انجمن مذکور احمد شفیق پاشا سابق وزیر معارف مصر کی زیر قیادت نہایت کامیابی کے ساتھ اپنے دائرہ عمل کو وسیع کر رہی ہے اور یہ پاشائے موصوف ہی کی دلچسپی کا اثر ہے کہ الامیر یوسف کمال' غلام رسول بے اور مرزا مہدی بک جیسے ایثار پرست اور سرگرم اراکین اس انجمن کو میسر آ گئے ہیں جو عالم اسلام میں اتفاق اور اتحاد کی روح پیدا کرنے میں انتہائی ایثار سے کام لے رہے ہیں خدائے لایزال ان کی سعی مشکور فرمائے اور یہ پرانا خواب "اضغاث احلام" ثابت نہ ہو۔

پیش نظر رسالہ تیسری جلد کا ساتواں نمبر ہے جو ظاہری اور معنوی خوبیوں سے آراستہ ہے۔ اس کی طباعت نسخ Moveable Type ٹائپ کی ہے جو کسی مصری Type Foundry کا ساختہ اور خوبی میں جرمنی کے برتھولڈ عربی ٹائپ سے کسی طرح کم نہیں۔

اس کا پہلا مضمون زکی بن مغافر کا لکھا ہوا ہے جو قسطنطنیہ کے لجنۂ تالیف و ترجمہ کے ایک رکن ہیں۔ اس میں عربی لغت پر بڑی تفصیل سے بحث کر کے دکھایا ہے کہ ترکوں نے سالہا سال تک عربی رسم الخط کے ٹائپ میں سہولتیں پیدا کرنے کی کیسی پیہم کوششیں کیں لیکن جب بدقسمتی سے انھیں حسب دلخواہ طریقے پر کامیابی نصیب ہوئی تو ضروریات زمانہ کا لحاظ کرتے ہوئے انھوں نے لاطینی رسم الخط اختیار کر لیا۔

اس مضمون کی طرز ادا غمازی کر رہی ہے کہ فاضل مضمون نگار کے دل و دماغ پر یورپین تہذیب و تمدن کا پوری طرح قبضہ ہو چکا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ عربوں کو نہایت شد و مد سے مشورہ دے رہے ہیں کہ وہ بھی ترکوں کی تقلید پر آمادہ ہو جائیں۔

دوسرا مضمون مسقط کے وزیر مالیات کے ایک لیکچر کا ترجمہ ہے جو "الربع الخالی" کے عنوان سے شائع کیا گیا ہے اس میں صحرائے عرب کے اس دشوار گذار اور پرخطر حصۂ زمین کے حالات لکھے ہیں جس کے متعلق ان کا بیان ہے کہ وہاں انسان کا گزر اگر محال نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ نیز یہ کہ قوم عاد کی تباہی اور بربادی کا یہی مرکز تھا جسے سموم نے فنا کر دیا وزیر موصوف اس حصۂ ملک کی تقریباً نو سو میل طولانی مسافت طے کر کے ابھی حال میں لندن واپس آئے ہیں اور اسی لکچر کے ذریعے اپنے تجربات پیش کر رہے ہیں جو دلچسپ ہیں۔

ایک اور اہم مضمون ہے جس میں انگریزوں کے اس طرزِ عمل پر سخت نکتہ چینی کی ہے جو آج کل انھوں نے فلسطین میں اختیار کر رکھا ہے اور اس پر بہت کچھ اظہار ناراضگی کیا ہے کہ یہودیوں کو اس ارض مقدس میں نہ بسایا جائے۔

"الاخبار" کے تحت عالم شرقیہ کی چیدہ چیدہ خبریں درج کی گئی ہیں جو پر معلومات ہیں۔

ہمیں حیرت ہے کہ مصری صحافت میں دہلی کو بالعموم "دلہی" لکھا جاتا ہے جس کا اتباع اس ماہ نامے میں بھی نظر آ رہا ہے جو غالباً انگریزی طرز تحریر کی نقل ہے مگر یہ اس لئے درست نہیں کہ اگر اسی کی یہاں بھی تقلید کیجائے تو ان کو خود سمجھنے میں دقت ہوگی کہ "کائرو" کس شئے کا نام ہے۔

بہر حال رسالہ بہ حیثیت مجموعی نہایت قیمتی خدمات انجام دے رہا ہے جو بہت قابل قدر ہیں۔ اس کی قیمت غیر ممالک کے لئے ۔۹۰ قرش مقرر ہے اور "جمعیۃ الرابطہ الشرقیہ" شارع حوش الشرقاوی رقم ۱۰ بوستہ باب الخلق قاہرہ مصر سے طلب کیا جا سکتا ہے۔

کیا ازدواجی زندگی کی
مسرّت کے لئے
بچّوں کی ضرورت ہے؟

(مشہور انگریز مصنفہ ایتھل مینین کے خیالات)

(از جناب ظفر قریشی دہلوی)

ایتھل مینین Ethel Manin ایک مشہور انگریز مصنفہ ہیں ناول اور افسانہ نویسی میں آپ کو قابل رشک شہرت حاصل ہے حال ہی میں ایک مشہور ہفتہ وار انگریزی رسالہ کے ایڈیٹر نے آپ سے شرف ملاقات حاصل کیا اور سوال کیا کہ "کیا آپ کے نزدیک ازدواجی زندگی کی مسرتوں کے لئے بچوں کا ہونا ضروری ہے یا نہیں؟"

اس سوال کے جواب میں ایتھل مینین نے ایک مضمون لکھا ہے جو اس رسالہ میں شائع ہوا ہے ذیل میں ان کے خیالات کا خلاصہ دیا جاتا ہے۔

خود ہندوستان میں بعض نامعلوم اسباب کی بنا پر "بچوں کے جنجال" سے چھٹکارا حاصل کرنے کی رو عام ہو رہی ہے۔ مغربی اثرات کے تحت یہاں کے شادی شدہ جوڑے بھی بچوں کی اہمیت سے انکار کر رہے ہیں۔ گو یورپ کی طرح یہاں "برتھ کنٹرول" کی وبا تو ابھی عام نہیں ہوئی ہے مگر حقیقت ہے کہ اگر بچوں سے محبت اور پیدائش نسل سے یوں ہی عام بے تعلقی کا اظہار ہوتا رہا تو وہ دن دور نہیں ہے کہ

ہندوستان بھی اس ہی لعنت میں مبتلا نظر آئے گا۔

ہندوستان نے اپنی ماؤں کو ہمیشہ بچہ پرور پیدا کیا ہے۔ ہندوستانی ماں کی مامتا ضرب المثل ہے اس لئے ہمیں ابھی اس خطرہ سے ڈرنے کی چنداں ضرورت نہیں جب یہاں کی مائیں بچے پیدا کرنے سے "انکار" کردیں گی اور خلاف فطرت اصول کی جانب بڑھیں گی تاہم پھر بھی ایسے قرائین نظر آرہے ہیں اور جراثیم پیدا ہوچکے ہیں کہ جس سے یہ خدشہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ کہیں ہندوستانی مائیں بھی نسل بڑھانے سے نفرت نہ کرنے لگیں۔

اس مضمون کے پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی ماؤں کے سامنے ایک مشہور مفکرہ اور مصنفہ کے خیالات بچوں اور ازدواجی زندگی کے متعلق پیش کیئے جائیں تاکہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ سارا یورپ نسل کشی یا امتناع پیدائش بچگاں کے خلاف ہے۔ اس سے معلوم ہوگا کہ وہاں کا سمجھدار طبقہ اور اعلیٰ درجہ کی مائیں اس باب میں کیا رائے رکھتی ہیں۔

موصوفہ بیان کرتی ہیں کہ وہ اس وقت چار بچوں کی ماں ہیں اور ان کی ازدواجی زندگی بہت شیریں ہے اور وہ سرمدی محبت جو بچوں اور خاوند کی معیت میں ایک گھر میں حاصل ہوسکتی ہے انہیں حاصل ہے امید ہے کہ اس ضروری مسئلہ پر غور کیا جائے گا اور ہندوستان کی مائیں یورپ کی اچھی باتیں حاصل کریں گی اور ان بری چیزوں سے اجتناب کریں گی جن کی زہریلی تعلیم (مثلاً میری سٹوپس وغیرہ اسکول کے لوگ) سے خود وہاں کا اعلیٰ اور سمجھدار طبقہ بھی بیزار ہے اور اسے انسانیت و دانشمندی کے خلاف سمجھتا ہے۔

ظفر قریشی دہلوی

انگلستان میں ایک مثل مشہور تھی کہ ایک شادی شدہ خاندان کے لئے پانچ یا چھ بچوں کی ضرورت ہوتی ہے اس کے بغیر پر مسرت زندگی سے سرور ہونی محال ہے اگر کسی گھر میں بچے نہ ہوں تو وہ گھر گھر ہی نہیں اور اس جوڑے کی شادی بے کار ثابت ہوئی۔

گذشتہ دس سال کی مردم شماری سے میں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ہمارے ملک میں پیدائش میں ایک زبردست انحطاط ہوا ہے اور یہ کمی برابر بڑھ رہی ہے جس سے

خدشہ ہے کہ کہیں ہمارا ملک کچھ عرصہ کے بعد بیرونی لوگوں کو بلانے کی ضرورت محسوس نہ کرے اور یہ جزیرہ کہیں غیر ملکی مہاجرین کی نوآبادی نہ بن جائے۔

اس زبردست انحطاط کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ لوگوں کو بچوں سے اب وہ دلچسپی اور محبت نہیں رہی جو پہلے تھی۔ گھر کی مسرت بچوں سے ہے مگر موجودہ دَور کے شادی شدہ جوڑے اس مقولہ کو بے اعتنائی سے دیکھتے ہیں ان کی نظر میں بچے کچھ اہمیت نہیں رکھتے بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ میاں بیوی کے تعلقات محبت میں وہ رخنہ انداز ہوتے ہیں اس لئے غیر فطری طور پر انھیں روکنا چاہیئے تاکہ ہم بچوں کے جھگڑوں بکھیڑوں میں پڑکر اپنی لاابالی زندگی کی مسرت آفریں راحت کو نہ کھوبیٹھیں

میں اس قسم کے خیالات کی دشمن ہوں کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ کوئی شادی خواہ وہ کیسی ہی محبت کا نتیجہ کیوں نہ ہو بچوں کے بغیر پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی کیونکہ شادی سے مراد اگر ازدواجی مسرت ہے تو وہ بچوں کی پہلی پہل ہے۔

مگر میں بچوں کے مستقبل کی طرف سے بالکل مایوس بھی نہیں ہوں کیونکہ دیکھ رہی ہوں کہ بچوں کے باب میں جتنی دلچسپی اور محبت کا اظہار اس زمانہ میں لوگوں نے کیا ہے کسی سے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ "نفسیات اطفال" اور "جدید نظریۂ تعلیم" اور اسی قسم کے دیگر موضوعات جو روز بروز ہمارے سامنے آرہے ہیں وہ ظاہر کرتے ہیں کہ لوگوں نے ابھی بچوں سے اپنی دلچسپی بند نہیں کی ہے اور دانشمند طبقہ ابھی بچوں کی موجودگی کا دل سے متمنّی ہے کیونکہ ان کے بغیر گھر جنگل معلوم ہوں گے اور وہ گریباں پھاڑ کر دیوانے ہوجائیں گے!!!

ایک زمانہ تھا جب لوگ "برتھ کنٹرول" (ضبط اولاد) کا نظریہ عام پبلک کے سامنے پیش کرتے ہوئے ڈرتے تھے مگر خیر وہ مبارک زمانہ تو ختم ہوگیا اب تو اس کا چرچہ عام ہوگیا ہے۔ اب لوگ بچے پیدا کرنے میں قدرت کے محتاج نہیں رہے ہیں۔ وہ جس طرح اور جیسے اور جتنے بچے چاہیں پیدا کرسکتے ہیں۔ روز بروز بچوں کی پیدایش پر امتناعات قائم ہورہی ہیں اور اس سے ڈر ہے کہ کہیں کلیتاً نسل کی پیدایش بند نہ ہوجائے مگر کچھ ہی ہو بچوں کی مسرت آگیں زندگی سے کون ہے جو انکار کرے۔

میاں بیوی کی شکر رنجی اور بچوں کی ذمہ داری

میرے اکثر احباب کہتے ہیں کہ ان کی ازدواجی زندگی کے تعلقات برباد کرنے والے یہی بچے ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتی کہ ایسا کیوں ہے؟

گو اس میں شک نہیں کہ میاں بیوی کی اکثر لڑائیاں بچوں ہی کے سلسلہ میں ہوتی ہیں اور وہ اکثر اوقات بچوں سے پناہ مانگنے لگتے ہیں مگر پھر بھی یہی کہوں گی کہ بہت سے ٹوٹے ہوئے تعلقات جوڑنے والے یہی تتلاتے ہوئے بچے ہوتے ہیں!

بچوں میں ماں باپ کے اثرات یقیناً منتقل ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ماں کی فطرت زیادہ منتقل ہوتی ہے اور کبھی باپ کے خصائل۔ مگر ان دونوں کے رجحانات طبع کا اولاد پر اثر ضرور پڑتا ہے۔ پس اگر کسی بات پر میاں بیوی کے تعلقات میں شکر رنجی پیدا ہو اور بچہ اس کا سبب ہو تو دیکھا جائے کہ بچہ میں ماں کا اثر زیادہ ہے یا باپ کا۔ اگر ماں کا زیادہ اثر ہے اور وہ باتونی، لڑاکا یا چڑچڑا ہے تو پھر سمجھ لیجئے کہ بچہ سے زیادہ اس کی ماں قصوروار ہے!

علاوہ ازیں فرض کیجئے کہ ایک بچہ ہے جس کا نام ناصر ہے اور وہ صفائی پسند نہیں ہے۔ اس کی ماں اسے گھڑی گھڑی جھڑکتی رہتی ہے۔ بہت ممکن ہے یہ یہ عادت اس نے اپنے باپ سے ورثہ میں پائی ہو اور وہ خود صاف ستھرا نہ ہو اس لئے وہ قدرتی طور پر ناصر کی حمایت لیگا۔ بس اگر حمایت کی اور بیگم صاحبہ اس پر ناراض ہوئیں تو تعلقات میں انتشار پیدا ہونے لگیگا۔

غرض شکر رنجیوں کی اور بھی بہت سی وجہیں ہیں۔ بچوں کا قصور اکثر بہت کم ہوتا ہے اور اگر ہوتا بھی ہے تو قابل اجتناب۔

بعض اوقات بچہ بیمار ہوتا ہے اور رات کو روتا ہے۔ باپ جو دن بھر کی کاروباری جھک جھک کے بعد آرام کرنے گھر آتا ہے اس سے سخت پریشان ہوتا ہے اور بعض اوقات غصہ میں گالی بھی دے بیٹھتا ہے۔ بیوی بھی حمایت پر اتر آتی ہے اور پھر باقاعدہ جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ میرے اکثر دوست کہتے ہیں "ننھے کے ہونے سے پہلے ہم بہت خوش تھے!" مگر میں دیکھتی ہوں کہ ان کی لڑائیاں بچوں سے زیادہ خود ان کے باہمی رویہ پر منحصر ہوتی ہیں۔ بچے خواہ مخواہ قصوروار ٹھہرتے ہیں۔

بچوں کی ضرورت کا سبب

ایک طرف تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بچے تعلقات میں رخنہ پیدا کرتے ہیں مگر دوسری طرف ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ باوجود ان شکر رنجیوں کے ہونے کے ہم بچے جان بوجھ کر پیدا کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ان کے وجود سے ہمارے گھروں میں رونق اور باہمی محبت سے زیادہ کچھ اور چیزیں بھی پیدا ہوتی ہیں

جنھیں ہم مجموعی طور پر برکت کہہ سکتے ہیں۔

ہم بچوں کے کیوں حامی ہیں اس کی وجہ محض ایک لفظ دلچسپی ظاہر کر دیتا ہے۔ اگر ہمیں بچوں کے ساتھ کوئی ہمدردی اور "دلچسپی" نہ ہو تو شاید ایک ہی لڑائی کے بعد گھر کی سب رونق اور محبت ختم ہو جائے، اور ہم ایک بچہ کا گلا گھونٹ کر پھر کبھی بچہ پیدا کرنے کے خواہشمند نہ ہوں!

اولاد کی طبعی خواہش کو ہم طرح طرح کے ناموں سے موسوم کر رہے ہیں۔ متمدن دنیا اسے "محبت کے جذبہ" سے معنون کرتی ہے۔ "تعلقات جنسی" کہہ دیتے ہیں مگر ان سب کی جڑ ایک ہی ہے یعنی نسل پیدا کرنے اور بڑھانے کی فطری خواہش۔ کیا بچے اس خواہش کی تکمیل کے لئے پیدا کئے جاتے ہیں یا وہ بطور "نتیجہ" کے ہوتے ہیں جس پر ہمارا قابو نہیں ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس کا جواب ذرا مشکل ہے۔

بہر نوع جنسی تعلقات کی تسکین کے لئے ہم بچوں کے منتظر رہتے ہیں اور اس کے بغیر کوئی ازدواجی زندگی پُرمسرت نہیں ہوتی خواہ فریقین میں کتنی ہی محبت کیوں نہ ہو۔

وہ شادی بالکل ناکام ہے جس میں بچے نہ پیدا ہوں یا پیدا نہ ہونے دئے جائیں۔ کیونکہ شادی کچھ نہیں ہے مگر افزائش نسل اور ایک ارضی فردوس جو بچوں کی پُرمسرت زندگی سے گھر میں بنا کرتی ہے۔

دنیا میں سب سے زیادہ جاذب توجہ اور دلچسپ ترین مشغلہ اگر کوئی ہے تو وہ والدین کا اپنے بچوں سے شغف ہے۔ وہ اپنے بچوں کی دیکھ بھال۔ ان کی تربیت اور تعلیم میں جس گہرے انہماک کا اظہار کرتے ہیں وہ وزیر اعظم اپنی حکومت کے کاروبار میں بھی نہیں کرتا! یہی دلچسپی ہے جو زوجین کی باہمی محبت کی تطویل اور استقلال کا باعث ہوتی ہے کون نہیں جانتا کہ بڑھاپے میں جب شعور جنسی میں اضمحلال آجاتا ہے اور اگلی محبتیں بھی سرد پڑنے لگتی ہیں یہی اولاد ہوتی ہے جو ہماری ابدی مسرت اور باہمی محبت کو برقرار رکھنے اور ایک رشتہ میں منسلک رکھنے میں ممد و معاون ہوتی ہے۔

بہت سی ایسی شادیاں جو طلاق کی خوفناک چٹان سے ٹکرا کر زندگیوں کے برباد کرنے کا باعث ثابت ہوتیں کسی بچے (یا بچوں) کی پیدائش سے پھر از سر نو پُربہار ہو گئیں اور پھر ان کے تعلقات میں خوشگواری پیدا ہو گئی۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم بچوں کی خاطر سے اپنے دل کی رنجشوں کو جلد دور کر دیتے ہیں اور ان کے

سہمے ہوئے چہروں کو پرجوش دیکھکر والدین بھی باہم ملاپ کرلیتے ہیں۔ آہ! کیسی معصوم تعلیم ہوتی ہے ان ننھے ننھے فرشتوں کی!

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ بچوں کے پیدا ہونے سے زندگی کا رومان فنا ہوجاتا ہے اور وہ تیز بیں محبت جو اولاد پیدا ہونے سے پہلے تھی وہ جاتی رہتی ہے میں سمجھتی ہوں کہ یہ رائے بھی بالکل غلط تجربہ پر مبنی ہے یا لوگ ہٹ دھرمی سے کام لیتے ہیں۔ کم از کم میرا تو یہ تجربہ نہیں ہے! میں خیال کرتی ہوں کہ اگر رومان میں کسی حد تک کمی ہو بھی جاتی ہے (جس کی بظاہر کوئی قوی دلیل نہیں) تو بچوں کی پیدائش سے جو گھر میں رونق، برکت اور جذبۂ مسرت و محبت پیدا ہوجاتا ہے وہ ان سب کا ازالہ کردیتا ہے۔ اولاد کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ زوجین میں بھی محبت کی پینگیں زیادہ بڑھنے لگتی ہیں یہ ایک ایسا تجربہ ہے جو ہر صاحب نظر دیکھ سکتا ہے اور آئے دن ہمارے مطالعہ میں آتا رہتا ہے۔

گو وہ رومانی زندگی میں انحطاط محسوس کرنے لگتے ہیں (کیونکہ ان کی زیادہ توجہ اب بچوں کی جانب مبذول ہوجاتی ہے) مگر یہ حقیقت ہے کہ انھیں اس انہماک سے وہ مزا آتا ہے کہ اس سب کی تلافی ہوجاتی ہے اور وہ مستقل مسرت حاصل ہوتی ہے جو "جذبات کی آندھی" سے زیادہ پائیدار اور مسرت بخش ہوتی ہے۔

بیسوں تلخ زندگیاں، سیکڑوں ناکام شادیاں پیدائش اولاد سے از سر نو تروتازہ ہوگئی ہیں۔ اب ان کی زندگی بالکل نئے انداز سے نئی شروع ہوتی ہے اور وہ بچہ کے مرکز پر اپنی ساری محبتیں مبذول کردیتے ہیں۔ رومان اور محبت جس حقیقی مسرت کے پیدا کرنے سے قاصر رہی تھی بچے اس کمی کو پورا کرتے ہیں۔

پھر میں نہیں سمجھ سکتی کہ بچوں کے وجود اور انکی اہمیت سے کون انکار کرسکتا ہے!

رومان کا اثر مستقل نہیں ہوتا

ایڈیٹر صاحب آپ پوچھتے ہیں کہ جب بچے پرمسرت زندگیوں میں رخنہ انداز ہوتے ہیں اور بعض اوقات زوجین کے تعلقات کو خراب کردیتے ہیں پھر ان کی ضرورت کیوں ہے اور کیوں ہم اپنے رومان کو بچوں پر قربان کردیں اور ایسے وسائل و ذرائع استعمال نہ کریں جن سے بچوں کی پیدائش بند ہوجائے۔ علاوہ ازیں بعض ایسے

شادی شدہ جوڑے بھی آپ کو ملیں گے جن کے تعلقات خوشگوار نہیں ہیں مگر پھر بھی وہ بچوں سے خائف ہیں اور اولاد پیدا کرنی نہیں چاہتے۔

حضرات! میرا جواب صرف وہی ہے جو اوپر کہہ آئی ہوں یعنی یہ کہ میرے نزدیک کوئی ازدواجی زندگی کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک اولاد نہ ہو۔

ایک وقت آتا ہے جب جذبات محبت کی پرشور آندھی اتر جاتی ہے اور زوجین احساسات کی چوٹی پر سے اتر کر معمولی انسانوں کی پرسکون زندگی کے میدان میں آجاتے ہیں ـــــــ اس وقت وہ بچوں کے متمنی ہوتے ہیں ورنہ ان کی زندگیاں ایسی تلخ اور خراب ہوجاتی ہیں کہ بالآخر تعلقات کشیدہ ہی ہوجاتے ہیں اور اگر بچے دل کے بہلانے کے لئے ہوئے تو پھر انھیں زندگی بھی گذارنے کے قابل معلوم ہونے لگتی ہے ورنہ وہ اپنے آپ کو بے یار و مددگار سمجھتے ہیں۔ وہ پریشان ہوتے ہیں کہ ان کی جائداد خیرات خانہ کی فہرست پر چڑھیگی یا سرکار میں داخل ہوگی یا کیا حشر ہوگا۔ اگر اولاد ہو تو ان کی یہ تمام خلش جاتی رہے۔

اولاد کی خاطر سے جو لوگ محنت کرتے ہیں اور دولت پیدا کرتے ہیں اس میں جو انحطاط ہوگا اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔

بچے مثل گل شب بو کے ہوتے ہیں۔ آخر عمر میں وہ محبت کی آواز بازگشت متصور ہوتے ہیں۔ وہ ہماری رومانی زندگیوں کی یاد تازہ کرتے ہیں اور زوجین میں اولاد کو دیکھکر جو حیات افزا مسرت پیدا ہوتی ہے وہ ناقابل بیان ہے۔

غرض بچے شخصی رومان کے لئے ازبس ضروری ہیں!

طبیعت کی پراگندگی یعنی محبت کی موت

اگر اولاد نہ ہو تو شادی ایک پراگندگی میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ طبیعت کا انتشار زوجین کی طبیعتوں میں خلیج مفارقت کو وسیع کرتا جاتا ہے زوجین ایک دوسرے میں اب کوئی دلچسپی محسوس نہیں کرتے۔ کیونکہ گھر جو مرکز ہوتا ہے ازدواجی زندگی کی مسرتوں کو کاٹ کھانے دوڑتا ہے۔ در و دیوار بے کیف ہوجاتے ہیں۔ طبیعت اچاٹ ہونے لگتی ہے۔ مرد عورت سے کنارہ کشی اختیار کرنے لگتا ہے ـــــــ کلب کو اپنا مامن و مسکن بنالیتا ہے عورت بھی دل ہی دل میں کڑھتی ہے اور اپنی دلچسپی کی نئی راہیں پیدا کرنے لگتی ہے۔ غرض انتشار

بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ وہ محبت جاتی رہتی ہے اور ایک مرکز اتحاد نہ ہونے کی وجہ سے زندگیاں برباد ہو جاتی ہیں۔ بلکہ بعض اوقات صورت حال بہت ہی ناگفتہ بہ ہو جاتی ہے۔

اب یہ دلیل کہ بچے رومان کی بربادی کا باعث ہوتے ہیں کہاں تک حق بجانب ہے اس کا آپ خود غور کرکے فیصلہ کریں۔

تعلقات زن و شوی کے لئے ازبس ضروری چیز ایک مرکز خیال ہے۔ مرکز خیال محبت کا ضامن ہے۔ بے اولادی کی حالت میں مرکز خیال کا ہونا محال ہے مرکز خیال کے فقدان کی وجہ سے محبت کا محور نہیں ہوتا اس لئے زوجین میں کوئی ابدی تعلق کوئی مستقل رشتہ کوئی دیرپا مفاہمت نہیں قائم رکھی جاسکتی۔ صرف اولاد ہی دنیا میں ایک ایسی چیز ہے جس سے ہم محبت کی جڑیں مضبوط کر سکتے ہیں اور دنیا میں ایک ارضی فردوس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

پس انتشار طبع، محبت کے لئے سم قاتل ہے کیا جذبات پرور زوجین اور کسی کی خاطر نہیں اپنی "محبت" ہی کی خاطر بچوں کی طرف توجہ مبذول فرمائینگے۔

پس بچے ہماری ازدواجی زندگی کی مسرت کے لئے محبت ہی کی طرح ضروری ہیں وہ ایک دوسرے کے ممد ہیں۔ ان کے بغیر کوئی شادی شدہ جوڑا حقیقی مسرت سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔

تہذیبِ جدیدہ و اسلافِ قدیمہ

"نئی روشنی کی عینک سے"

از محترمہ نوشابہ خاتون صاحبہ قریشی۔ بی۔ اے

جہاں مستِ کیفِ بادۂ تہذیبِ باطل ہے ۔۔۔ کھلی ہیں گرچہ آنکھیں۔ آہ لیکن قلب غافل ہے

ہوئے ظاہر پرستِ دہر۔ خالی نورِ عرفاں سے ۔۔۔ خدا کی شان! اس پر اِدعائے عقلِ کامل ہے

"نئی تہذیب کی عینک" سے جسکی آنکھ روشن ہے ۔۔۔ وہ محرومِ بصیرت۔ مائلِ ظلماتِ باطل ہے

ہے وقفِ اعتراضِ بے سروپا محوِ خودبینی ۔۔۔ مجھے اپنی زباں سے آہ۔ "نقلِ کفر" مشکل ہے

علومِ مشرقی سے فائدہ؟ تحصیلِ حاصل ہے ۔۔۔ خطابِ عالمیت کا وہ حامل ہے جو جاہل ہے

ہو قطبی یا کہ شمسیہ؟ ہو منطق یا کہ ہیئت ہو ۔۔۔ نتیجہ خرَدماغی کا ہے۔ یہ ایجادِ باطل ہے

پُرانا علمِ طب مہمل۔ کلام و فلسفہ باطل ۔۔۔ یہ لٹریچر ہے بوسیدہ جلادینے کے قابل ہے

احادیثِ رسول اللہ ہیں تقویمِ پارینہ ۔۔۔ معاذ اللہ فقہ بھی درسِ لاحاصل میں شامل ہے

یہ کٹ مُلّا یہ مُلّانے مقطّع ڈاڑھیوں والے
بنا رکھا جنھوں نے دین کو مذہب کو مشکل ہے

کڑی شرطیں لگائی ہیں شریعت میں انھوں نے ہی
ترقی میں ہماری ہے یہی دِقّت جو حائل ہے

نئی تہذیب سے ہو آشنا وہ مولوی کیوں کر
جو بسم اللہ کے گنبد میں مَا فِیہا سے غافل ہے

صلوٰۃ و صوم کے پابند تو ہم ہو نہیں سکتے
اُٹھا دیں قید یہ مُلّا تو بس آسان منزل ہے

زکوٰۃِ مال کیوں دیں مفلسی کا پیش خیمہ ہے
اسے تریاق کہتے ہیں جو سچ مچ سمِّ قاتل ہے

صعُوباتِ سفر حائل ہیں راہِ حجِ کعبہ میں
تمازت مہر کی، صحرا لق و دق اور محمل ہے

ہو کیوں کر طے یہ وادی اہلِ تہذیب و تمدن سے
بھلا کب راستہ ایسا قدم دھرنے کے قابل ہے

نہیں کم بندشِ تقلید بھی پھانسی کے پھندے سے
روش ہے قابلِ نفرت جو پابندِ سلاسل ہے

یہ تہذیبِ جدیدہ ہے وہ اسلافِ قدیمہ تھے
گیا دورِ کہن یہ روشنیٔ نو کی محفل ہے

پرستارِ نمودِ رنگِ باطل محوِ ظاہر ہے
حقیقت آشنا کب جلوۂ فانی پہ مائل ہے

سخن سنجی کا دعویٰ کیا تجھے نوشابۂ محزوں
کرے گا فیصلہ اس کا جو فرزانہ ہے عاقل ہے

مجہول کیڑا

از جناب حسن اصغر صاحب

ننھی تتلی۔ دبدہ زیب تتلی باغ کی ملکہ تھی۔ پتے پتے پر اس کی حکومت تھی۔ بوٹا بوٹا اس کی رنگینیٔ حسن کا ثنا خواں تھا۔ باغ کی خاموش مخلوق اسے رونق بزم سمجھتی تھی۔ خوش الحان پرند اس کی تعریف کے گیت گاتے تھے۔ بغرور بلبل تک اس کے خوشرنگ و نازک پروں پر جان دیتی تھی اسے اقرار تھا کہ اس کے زرّیں پروں اور پھولوں کی رنگین پنکھڑیوں میں کوئی نسبت نہیں۔ پھول ہمیشہ اس کے متمنی رہتے تھے کہ یہ ملکۂ حسن آئے اور اس آسمانی شراب کو پیئے۔ جو رات بھر کی بیداری کے بعد انھوں نے اپنے ساغر نما آغوش میں جمع کی ہے۔ اگر وہ کسی درخت پر بیٹھ جاتی تو وہ یہ محسوس کرتا کہ اس میں ایک ایسا پھول کھل گیا جو عام پھولوں کے بہ نسبت کہیں زیادہ رنگ و روپ میں پائدار ہے غرض حسین تتلی، نازک تتلی باغ کی بہار تھی کسی کی مجال نہ تھی کہ اس کی ہمسری کا دعویٰ کرے اور رہر ایک اس کے رنگ و روپ پر جان دیتا۔

مگر ہاں باغ میں ایک ایسی ہستی بھی موجود تھی۔ جو تتلی سے بیزار تھی۔ اس کی زیادتیوں سے نالاں تھی۔ اس کی رعونت کی شاکی تھی۔ اس کی حقارت آمیز نگاہوں کی گھائل تھی۔

یہ خاموش اور بے ضرر دشمن ایک مجہول کیڑا تھا۔ جو تتلی کے پڑوس میں ایک پتے سے لپٹا غذا حاصل کیا کرتا تھا۔ اس ملکۂ حسن کو اس کا پڑوس ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے اسے صلواتیں سناتی، لعن طعن کرتی، آئے گئے سے اس کا ضحکہ اڑاتی اور اس پر نفرین کرتی تھی۔

یہ کیوں ـــــ ؟

وہ تتلی سا حسین نہ تھا۔ اس کے بازوؤں پر دو زرّیں

پر نہ تھے اس کی صورت ملگجی تھی۔ اس کے جسم پر بدرنگ کینچلی تھی۔ وہ خودغرض مخلوق کے لئے کوئی جاذبیت کوئی دلکشی نہ رکھتا تھا۔ اس کا وجود باغ کے لئے باعث ننگ تھا ـــ اور باغ کے سکان کے لئے وہ وبال تھا ـــ لہذا

وہ ہرگز مستحق نہ تھا کہ زندہ رہے اور زرّین پر مخلوق کی طبع نازک پر بار ہو۔

کیڑا! اپنی حقیقت سے ناواقف کیڑا ـــ سب کچھ سنتا ـــ اپنی کثافت، اپنی پستی کا خاموشی سے اقرار کرتا ـــ نادان اپنے وجود اور ان عیوب میں چولی دامن کا ساتھ سمجھتا۔

۲

زمانہ انقلاب پسند ہے۔ ہر نیا دن کیڑے کی زندگی کی ایک کثیف منزل طے کرتا اور تتلی کی پُر بہار عمر طبعی کا ایک دن قطع کرتا ـــ مگر عمر کے ساتھ تتلی کی خودپسندی ـــ اس کا جذبۂ حقارت اس کا غرور بڑھ رہا تھا اور کیڑے کے لئے ناقابل برداشت صورت اختیار کرتا جاتا تھا۔

اب اس کے پیش نظر صرف ایک تدبیر ان نت نئے مظالم سے بچنے کی تھی۔ وہی تدبیر جو ہمیشہ پست و حقیر مخلوق کی مشکل کشا رہی ہے۔

یعنے ـــ خودکشی ـــ سر پھوڑ کر اس جان عزیز کا خاتمہ کرنا ـــ

مگر نہیں اس کے ذہن میں ایک اور دُھندلی سی تدبیر بھی تھی جو ہلکی سی روشنی اس کی تاریک دنیا میں ڈال رہی تھی۔

"باغ کی خودغرض مخلوق سے پوچھے"؟

ـــ تتلی کے ہلاک کرنے کی تدبیر نہیں۔ رنگ و روپ میں اس سا حسین بننے کی ترکیب نہیں ـــ بلکہ

اپنی مجہولیت کا علاج ـــ اپنی کثیف زندگی سے نجات کا ذریعہ ـــ اگر اس سے کچھ حاصل نہ ہوا تو پھر وہی' سر پھوڑ کر اس جانِ عزیز کا خاتمہ۔

باغ کا مالی سامنے سے گزرا ـــ مگر یہ کمبخت کیا چارہ جوئی کرے گا عمر گزر گئی۔ وہی کھرپا ہاتھ میں ہے۔ وہی لنگوٹی بدن پر ہے۔ کوئی تغیر نہیں۔ کوئی تبدیلی نہیں۔

مالی نظروں سے اوجھل ہوگیا

[کیڑا دیوانہ وار ہر ایک سے پوچھتا ہے]

اے درخت اور پتو! تم ایک زمانہ سے میرے مونس و ہمدم ہو ـــ بتاؤ ـــ خدا کے لئے جلدی بتاؤ۔

اے خوش رنگ و نازک پھولو! تمہاری نرم دلی

مشہور ہے ـــ بتاؤ ـــ تم ہی کچھ بتاؤ ـــ
اچھا غنچو! تم بتاؤ ـــ معصوم ہو۔ پاک دل ہو، رحم کرو۔ آؤ۔ آؤ۔ خوش رنگ و خوش آواز پرندو تم ضرور بتاؤ گے.........(خاموشی)
نہیں نہیں، زمین بتائے گی ـــ تو بھی نہیں آسمان تو بتائے گا........(خاموشی)
ہاں ـ ہاں......کیا.......سمجھا ـ یہ ایک مشترک آواز ہے تمام ذی حیات کی ـــ اُف ـــ وہی ہوا نہ
"مجہول کیڑے تیرا علاج موت ہے"

ـــ ۳ ـــ

تتلی کے واپس آنے کا وقت قریب آگیا ہے زندگی سے بیزار کیڑا تصویر یاس و حسرت بنا پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہر طرف دیکھ رہا ہے۔ موت کی خوفناک تصویر سامنے ہے۔ چاروں طرف سے آوازیں آ رہی ہیں ـــ "تیرا علاج موت ہے"۔ ـــ "تیرا علاج موت ہے" ـــ موت! ـ موت!! مگر یہ آواز کس کی۔ کدھر سے؟ ـ چاروں طرف کی آوازیں اسے دبائے دے رہی ہیں ـــ بہت ہلکی ہے ـــ مگر، کہاں سے؟ ـ
زمین سے؟ ـ نہیں، آسمان سے؟ ـ نہیں، دور سے؟ ـــ نزدیک سے؟.......خود مجھ سے ـ ہاں ہاں کہیں سے آمزور آ رہی ہے ـــ اچھا کیا کہا؟ غلط ہے! ـــ ہاں ہاں ـ کیا؟ ـــ
آواز آئی:
"تیرا علاج ممکن ہے!"
کیونکر؟ کیونکر؟
بتاؤں؟
"خدا کے لئے جلدی بتا" کیڑے نے گھبرا کر کہا۔
"تو نہ مانے گا"۔ آواز آئی۔
"مانوں گا"
"نہ مانے گا"
"مانوں گا اور ضرور مانوں گا"
"اب پریشان نہ ہو"
کیا مذاق ہے؟
"نہیں مذاق نہیں کیڑے!"
"ہائے قسمت کا لکھا پورا ہو رہا ہے۔ مرتے وقت بھی مضحکہ اُڑایا جا رہا ہے ـــ اے آواز خدا کے لئے جلد بتا دیکھ تتلی آتی ہوگی"۔
"تو اب تتلی سے کیوں ڈرتا ہے؟"
"پھر وہی؟"
"تو اب تتلی سے کیوں ڈرتا ہے؟"

"دل آزار آواز! مضحکہ خیز آواز! ___ خاموش ہوجا........ مجھے سر پھوڑنے دے، اس دل آزار دنیا سے، اس مضحکہ خیز دنیا سے، رخصت ہونے دے!"

"تو اب سر نہیں پھوڑ سکتا ___ تو اب رخصت نہیں ہوسکتا۔"

"تو پھر بتا آخر کیا ہوگا؟"

"لے غافل سن!" "مگر"..........

کیا؟ کیا؟؟

"اب وہ وقت دور نہیں کہ تو بھی تتلی بن کر ہوا میں مچلتا پھرے گا!"

"خدا کی مار تجھ پر۔ عقل کی دشمن ___ پھر وہی مذاق!"

"یقین مان اے کیڑے"

"ناممکن! ناممکن!" کیڑے نے جھنجلا کر کہا۔

"بدعقل تجھے کیا معلوم، ممکن و ناممکن کیا چیز ہے"

آواز آئی:

"بدعقل تو۔ جسے عقل قبول کرے وہ ممکن۔ اور جسے نہ قبول کرے وہ ناممکن"

"نادان کیڑے۔ تیری عقل محدود۔ تیری معلومات محدود تیری دنیا محدود!

اچھا تو یہ میری ٹانگیں کیا ہونگیں۔ یہ ملگجی کینچلی کہاں جائے گی؟ ___ آہ! وہ دو زرّین پر کہاں سے آئیں گے۔

"یہ سب کچھ ہوجائے گا"

"کیسے، کس طرح، کیونکر؟"

"تیرے احساس سے، تیری اُس بےچینی سے، تیری اس جستجو سے!"

کیا کہا؟ ذرا صاف کہنا ___ اب کیوں نہیں جواب دیتی [آواز غائب ہوچکی۔ جہاں سے آئی تھی وہیں چلی گئی جس رنگ و بو سے پیدا ہوئی تھی اسی میں تحلیل ہوگئی] کیڑے کی نظر تتلی کے بسیرے پر ہے۔

آواز! آواز!۔ واپس آجا۔ تو کچھ سچی ہے دیکھ وہ تتلی کے انڈوں سے بھی مجھ جیسے کثیف کیڑے نکل نکل کر پتوں سے چمٹ رہے ہیں .... یا اللہ ___ یہ میری کھال کون کھینچ رہا ہے۔ یہ میری ٹانگیں کون کاٹ رہا ہے۔ یہ مجھے کون اوپر اُٹھا رہا ہے۔ یہ اپنے کندھوں پر لے کر مجھے کون اُڑنا چاہتا ہے ___ نہیں نہیں ___ میرے خود دو پر، ویسے ہی پر، رنگین پر، خوش نما پر ___ اس میں تو خود تتلی بن گیا ___ وہ کینچلی کیا ہوئی وہ ٹانگیں کہاں گئیں؟ ___ آواز تو سچی تھی ___ میں یہ دو زرّین پر اب بڈھی تتلی کو دکھاؤں گا ___

۴

کیڑا تتلی بن چکا ہے۔
تتلی وہی باغ کی ملکہ تتلی جو عمر طبعی کو پہونچ چکی تھی۔ اسی درخت کے نیچے مری پڑی ہے۔
نہ اس نے کیڑے کو اس شکل میں دیکھا اور نہ کیڑا اپنا رنگ و روپ اس کو دکھا سکا۔
"زندگی کا بہت بڑا راز یوں ہی پوشیدہ رہا۔"

تالاب کے کنارے

از محترمہ بلقیس جمال بریلوی

بادل کے نرم ٹکڑے بادِ صبا کے جھونکے
پانی کے صاف چشمے لہروں کے سر جھالے

کچھ سیم گوں شگوفے سیمیں کی ڈالیوں میں
جھک جھک کے گر رہے ہیں پانی کی جنبشوں میں

جوہی کا ایک پودا دلکش لطیف و رنگیں
موجوں کے آئینوں میں مصروفِ ناز و تزئیں

بادِ صبا کے جھونکے آ آ کے چھیڑتے ہیں
جوہی کے پھول ہنس ہنس کر دامن سکیڑتے ہیں

پھولوں کے سرخ لب ہیں فطرت کا اک تبسم
پتوں کا سرسرانا۔ اُمید کا ترنّم

موجوں کے گیت میں ہے اک نغمۂ تمنّا
لہروں سے مل کے یعنی سازِ وفا ہے چھیڑا

عکسِ فلک سے موجیں ہیں نیلگوں تخیّل
اک جذبۂ پریشاں لہروں پہ شوخ کاکُل

کچھ لڑکیاں کھڑی ہیں معصوم و شوخ و کافر
قوسِ قزح تصدق ہے ان کی ساڑیوں پہ

آنکھیں ہیں اُن کی یعنی شاعر کا اک تخیل
مرغولۂ تمنا ہے اُن کی زلفِ سنبل

ان کی جبینِ سیمیں اک خنجرِ کشیدہ
ان کی جبین پتلی ہے آہوئے رمیدہ

پیتل کے اُن کے لوٹے گاگر وہ چھوٹے چھوٹے
بجلی چمک رہی ہے تالاب کے کنارے

بے ساختہ تبسم ان کے لبوں پہ رقصاں
نازک سے قہقہوں سے موجِ رواں بھی حیراں

نازک سے سرخ وہ لب وہ نازنیں تبسم
پانی اُچھالنے میں وہ دل نشیں ترنم

میں ان کو دیکھتی ہوں اور خود کو دیکھتی ہوں
گاہے نگاہِ حیراں پانی پہ پھینکتی ہوں

معصوم دل ہیں اُن کے وہ مسکرا رہی ہیں
میری نگاہِ غم پر بجلی گرا رہی ہیں

افسوس ایک میں ہوں محرومِ زندگانی
مجبورِ نوحہ خوانی مجروحِ خوں فشانی

اے وائے میرا دل ہے اک بسملِ طپیدہ
آہوئے صیدِ قاتل! یا مرغِ خوں چکیدہ

میں بسملِ الم ہوں مجروح و صرفِ غم ہوں
پابندِ صد ستم ہوں پروردۂ الم ہوں

میری نگاہِ حسرت اک درد کی کہانی
پامالِ یاس و ارماں غمناک زندگانی

واماندۂ تمنا یہ چشمِ درد ساماں
افسردۂ ستم ہے یہ چشمِ خوں بداماں

بیگانۂ مسرت محرومِ عیش و عشرت
مایوس لطفِ قسمت مرہونِ درد و حسرت

میری نگاہِ غم میں آنسو چمک رہے ہیں
یا ابرِ غم چکاں سے قطرے ٹپک رہے ہیں

اے میری آہِ سوزاں میرا پیام لیجا
بے ہوش سونے والوں تک عرضِ عام لیجا

جو سو رہے ہیں اُن کو اے آہ تو جگا دے!!
ساکن سماعتوں کو نغمے مرے سنا دے!!

رضاعت

دُودھ پلانا

ڈاکٹر عبدالرحمن ایم۔ بی۔ سی۔ اچ۔ ڈی۔ ٹی۔ ایم اینڈ ایچ (اڈنبرا)

گذشتہ اشاعت میں یہ بتلایا گیا تھا کہ بچّہ کو ایک ماہ کی عمر تک ڈیڑھ اونس سے ڈھائی اونس تک دودھ پلانا چاہیئے۔ عام اصول اس کے متعلق اس طرح قایم کیا جاسکتا ہے کہ بچہ کے ہر پونڈ وزن کے لحاظ سے اس کو ڈھائی اونس دودھ ہر روز پلانے کی ضرورت ہے۔ مثلاً آٹھ پونڈ وزن والے بچہ کو کم و بیش بیس اونس دودھ یومیہ ملنا چاہیئے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ماں کی چھاتیوں سے بچہ نے کتنا دودھ کھینچا اس کا اندازہ کیونکر کیا جائے اس کا عملی طریقہ حسب ذیل ہے:-

(الف) بچہ کا وزن پہلے تین ماہ میں پانچ یا چھ اونس فی ہفتہ کے حساب سے بڑھتا ہے (سوائے اس کی عمر کے پہلے ہفتہ کے جس میں کہ وزن کم ہوجاتا ہے) اس کے بعد تین ماہ تک وزن میں چار اونس فی ہفتہ کے حساب سے وزن بڑھتا جاتا ہے۔

(ب) بچہ خوش رہتا ہے۔ روتا کم ہے۔ سوتا بہت ہے۔ یہ کافی دودھ ملنے کی نشانیاں ہیں۔

(ج) اُس کو اجابت صحیح طور پر ہوتی ہے اور دن میں دو یا تین مرتبہ ہوتی ہے یہ بھی اچھی علامت ہے۔

امور بالا کے مشاہدہ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ بچہ کو دودھ ٹھیک مقدار میں مل رہا ہے لیکن ٹھیک مقدار دودھ کی جو بچہ پیتا ہے اُس کے جانچنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ بچّہ کو ہر مرتبہ دودھ پلانے سے پہلے اور بعد ایک عمدہ اور صحیح ترازو میں تولا جائے تو تفاوت صاف ظاہر ہوجائے گا۔ اس طرح دن بھر کے وزن لینے سے بچے کے دن بھر کی دودھ کی مقدار

معلوم ہو سکتی ہے۔ ماں یا اناکے دودھ پلانے میں بعض مشکلات درپیش آتی ہیں جن کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ وہ حسب ذیل ہیں:۔

بچے کو ضرورت سے کم دودھ ملنا

یہ حالت اکثر دیکھنے میں آتی ہے اور لطف یہ ہے کہ ماں کو علم نہیں ہوتا کہ بچہ کو دودھ کم مل رہا ہے۔ بچہ دن رات روتا ہے اور ماں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرنا چاہئے۔ بعض اوقات وہ خود سمجھتی ہے کہ دودھ کم نہیں ہے کیونکہ چھاتیوں سے ٹپکتا ہے۔ لیکن صرف چھاتیوں سے خود بخود دودھ ٹپکنے کی بنا پر ماں کا یہ خیال کر لینا کہ دودھ بہت ہے ایک غلط اندازہ ہے۔ بچے کو روزافزوں قبض کی شکایت ہوتی جاتی ہے اور اس کا وزن نہیں بڑھتا۔ یا بعض اوقات بجائے قبض کے فاقہ اور ناتوانی سے پیچش ہو جاتی ہے۔ اگر ایسے بچے کو تولا جائے تو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ اسکا وزن اوسط سے کم ہے اور اگر اس کو دودھ پلانے کے پیشتر اور بعد جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے تولا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ دودھ کی مقدار جو وہ پی رہا ہے بہت کم ہے۔ ان حالات میں کوشش کرنی چاہئے کہ ماں کی چھاتیوں میں زیادہ دودھ آئے۔ ورنہ بچے کو اوپر کا دودھ دینا چاہئے۔

دودھ زیادہ بڑھانے کے لئے چھاتیوں کو حسب ذیل طریقوں سے تحریک دیجا سکتی ہے:۔

(الف) ماں کو چاہئے کہ پانی زیادہ مقدار میں پئے۔ بلکہ یہ معمول بنا لینا چاہئے کہ دودھ پلانے کے بعد ماں ہر بار ایک یا آدھا گلاس پانی پی لے۔ اس طریقہ سے دودھ کے ذریعہ جو پانی کا اخراج ہوتا ہے اُس کی تلافی پانی کر دیتا ہے۔

(ب) ماں کو ہر طرح اپنی صحت کا لحاظ کرنا چاہئے۔ غذا اس کی کافی زود ہضم اور طاقت بخش ہو جسمانی ورزش کافی ہو جس سے دوران خون صحیح حالت میں قائم رہے۔ وہ بند کمروں میں بھی نہ رہے اور حتی الامکان کھلی تازہ ہوا میں پھرتی چلتی رہے۔

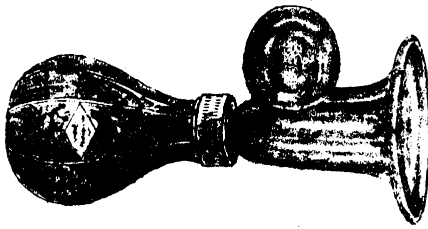
افسوس ہے کہ یہ ذرایع پردہ نشین مستورات کے لئے ایک حد تک کم حاصل ہیں۔

(۲) پستان کو گرم اور سرد پانی سے یکے بعد دیگرے پے در پے دھونا چاہئے۔ پانی اتنا گرم ہو جتنا برداشت ہو سکے اور سرد بھی پورا سرد نہو۔ پہلے گرم پانی میں کپڑا بھگو کر پستان پر ایک منٹ تک رکھیں اور پھر دوسرا کپڑا سرد پانی میں بھگو کر ایک منٹ تک رکھیں اس طرح متواتر کئی مرتبہ گرم اور سرد پانی لگائیں۔ روزانہ پندرہ منٹ تک اس عمل کو جاری رکھنا چاہئے۔ اس سے پستان کے غددوں کو تحریک پہنچتی ہے اور دودھ

زیادہ مقدار میں پیدا ہونے لگتا ہے۔

(۳) پستان کی مالش روزانہ دس منٹ تک کریں۔ اس سے بھی غدود کو تحریک پہنچتی ہے اور دودھ میں اضافہ ہوتا ہے

(۴) سب سے بہتر تحریک یوں پہنچتی ہے کہ پستان کو دودھ سے بالکل خالی کر دیا جائے۔ اس لئے ہر مرتبہ دودھ پلانے کے بعد ہاتھ سے یا پمپ کے ذریعہ مکمل طور سے انھیں خالی کر دیا جائے۔ پمپ کا نقشہ حسب ذیل ہے:←



(۵) بعض اشیاء ایسی ہیں جن کے استعمال سے دودھ زیادہ مقدار میں پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً اولٹین Ovaltine یا ملن فوڈ Mellin's Food۔ اس کے تیار کرنے کی ترکیب یہ ہے کہ ایک یا دو بڑے چمچے کی مقدار کے برابر گرم پانی میں ڈالیں (لیکن پانی اُبلتا ہوا نہ ہو) اور اس کو خوب اچھی طرح ملائیں۔ جب خوب ملجائے تو اس میں اور گرم پانی ملائیں۔ یہاں تک کہ اس کا مزہ حسب ذائقہ ہو جائے۔ اس طرح دن میں ایک مرتبہ استعمال کریں۔ ملن فوڈ بچوں کو بھی بجائے دودھ کے

دیا جاتا ہے جس کا بیان کسی دوسرے موقعہ پر کیا جائیگا

(۶) حتی المقدور بچے کی ماں کو رنج۔ فکر۔ پریشانی اور دوسرے تفکرات سے بچائیں۔ ان طریقوں پر عمل کرنے سے اکثر اوقات دودھ کی مقدار میں اضافہ ہو جاتا ہے اور پھر شکایت باقی نہیں رہتی۔ لیکن بعض اوقات باوجود پورے انتظام کے بھی دودھ کی آمد کافی مقدار میں نہیں ہوتی۔ ایسی صورت میں اوپر کا دودھ دینا پڑتا ہے جو دو طریقوں سے دیا جاسکتا ہے۔

(۱) یا تو بچے کو بالکل اوپر کے دودھ پر رکھا جائے اور ماں کا دودھ بالکل نہ دیا جائے یا (۲) کہ اوپر کا دودھ دن میں ایک یا دو مرتبہ دیا جائے اور بقیہ اوقات میں ماں کا دودھ دیا جائے۔ اول الذکر حالت میں خرابی یہ ہے کہ پہلے تو جانور کا دودھ بہت ثقیل ہوتا ہے اور دوسرے ماں کا دودھ بالکل موقوف کر دینے سے دودھ سوکھ جانے کا احتمال ہے۔ اس لئے کہ دودھ کے برابر جاری رہنے کے واسطے پستان کے خالی کرنے سے جو تحریک پہنچتی ہے اُس کی ضرورت ہے۔ آخرالذکر حالت میں خرابی یہ ہے کہ اُس کا علم نہیں ہوتا کہ بچہ

ماں کا کتنا دودھ پی رہا ہے۔ اس لئے اس میں بچے کے بے ضرورت زیادہ دودھ پینے کی خرابی کا احتمال ہے۔

بچے کا ضرورت سے زیادہ دودھ پینا

اسکا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ دودھ پلانیکے بعد بچہ قے کردیتا ہے یا دودھ اس کے حلق سے الٹ آتا ہے۔ اگر دودھ ضرورت سے زیادہ پینے کی عادت پڑجائے تو گو بچے کا وزن ابتدائی زمانہ میں بہت زیادہ بڑھے گا لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد بچے کا معدہ اس بار کا متحمل نہیں ہوسکے گا اور معدہ خراب ہوجائے گا۔ اس خرابی کے روکنے کی ترکیب یہ ہے کہ یا تو دودھ زیادہ دیر تک نہ پلایا جائے یا یہ کہ دودھ زیادہ وقفہ کے بعد دیا جائے۔ مثلاً بجائے تین گھنٹے کے چار گھنٹے کے بعد۔

دودھ کے ساتھ ہوا کا پہنچنا

تمام بچے دودھ پیتے وقت تھوڑی بہت ہوا ضرور نگلتے ہیں۔ اس لئے اصولاً ماں کو یہ کرنا چاہیئے کہ دودھ پلانے کے بعد بچے کو تھوڑی دیر تک سیدھا کر کے بٹھائے رکھے تاکہ تھوڑی سی ہوا جو معدہ میں چلی جاتی ہے وہ پھر خارج ہوجائے۔ بعض بچے بہت ہوا نگل لیتے ہیں جو ان کے معدہ میں جاکر تکلیف دیتی ہے اور بچے اس کے نکالنے کی کوشش میں قے کردیتے ہیں۔ اس لئے جب بچہ دودھ پینے کے بعد قے کرتا ہو تو اس امر کا لحاظ رکھنا چاہیئے کہ کہیں وہ کثیر مقدار میں ہوا تو نہیں نگلتا ہے ہوا نگلنا ایک حد تک روکا جاسکتا ہے۔ بچے کو خالی چھاتی چوسنے نہیں دینا چاہیئے اور نہ اس کو دودھ بہت جلدی جلدی پینے دینا چاہیئے چھاتی چھوڑنے کے اختتام سے پہلے بچے کو سیدھا کردینا چاہیئے۔ کیوں کہ ایسے وقت میں ہوا زیادہ اندر جاتی ہے۔ فقط

پانچ درویش موٹر میں

دوسری قسط

نوٹ:- سلسلہ کے لئے گزشتہ نمبر ضرور ملاحظہ فرمایا جائے جس میں ایک اصلی فوٹو شامل ہے ۔

مسٹر قصیر نے خاص ہجولی کے لئے انگریزی میں لکھا

یہ دیکھ کر کہ ہمارے ساتھیوں میں سے فلسفی صاحب کو "مرحوم" کی ڈگری مل جارہی ہے ہم میں بڑی سراسیمگی پھیل گئی ۔ مسٹر خوش نصیب سے یہ منظر دیکھا نہ گیا، انھیں ایک پھریری آئی اور "لو میں آیا!" کہتے ہوئے پانی میں کودتے کودتے ٹھٹک کر رہ گئے۔ پھر ہمت کی اور آگے بڑھے مگر پانی کے ریلے نے آپ کے پائے استقلال کو ڈگمگا دیا۔ ان کے ہاتھ میں ابھی تک وہ چھڑی موجود تھی جس سے آپ نے پانی کا عمق ناپ کر ہماری موٹر کو زندہ درگور کردیا تھا۔ اس نازک موقعہ پر بھی آپ نے پھر اُسی سے پانی کی پیمایش کی اور کچھ اطمینان کر کے کیچڑ پانی میں سینے کے بل رینگ کر بطخ کی طرح پھچر پھچر کرنے لگے لیکن جوں ہی آپ پانی میں داخل ہوئے ایک زور کا ریلا آیا اور آپ کی قلابازیاں شروع ہوگئیں۔

حضرت فلسفی کو جب کبھی اپنے غوطوں سے فرصت مل جاتی ایک نظر ہم پر بھی ڈال لیتے تھے اور نہایت استقلال اور پامردی سے سیلاب کا مقابلہ کئے جا رہے تھے مگر موٹر میں سے سمیٹا ہوا سامان آپ کی بغل میں حسب سابق موجود تھا ۔ لڑھکتے پڑھکتے مسٹر خوش نصیب بھی آخر وہاں جا پہنچے پہلے موٹر کے لیمپ روشن کئے اور اس میں سے رینگ کر دوسری طرف آ نکلے جہاں حضرت فیلسوف کو "نروان" حاصل ہو رہا تھا اور للکار کر بولے ہاتھ لائیے

؟ ؟ ؟

لائیے ! !

؟؟ ؟؟

اجی جناب "دیجئے" !

؟ ؟ ؟

یہ دیکھ کر کہ راستہ صاف ہے اور شہید ہونے کا کوئی امکان نہیں خاکسار بھی پانی میں کود وہاں پہنچ گیا اور کیونکہ حضرت فیلسوف کی عادت سے واقف تھا اس لئے مجھے ضرورت معلوم ہوئی کہ یہ اہم سوال دوسرے پہلو سے اٹھایا جائے چنانچہ میں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر انھیں فوراً مخاطب کیا :۔

ہاتھ لیجئے!

! ! !

ارے بھئی یہ لو !

فوراً فیلسوف کا ہاتھ میرے ہاتھ میں آگیا اور اب ہم تینوں سورما کنارے پر پہنچ گئے تھے گر فیلسوف صاحب کو دلی ملال تھا کہ ان کی موٹر نہ نکل سکی۔ حضرت پیر طریقت نے ہمارا بڑا گرم جوش استقبال کیا اور اس کارنامے پر اظہار خوشنودی فرماتے ہوئے میری خوب کمر ٹھوکی۔ میری مسرت کی بھی اس وقت انتہا نہ تھی کیونکہ میں سمجھ رہا تھا کہ آج مجھے ڈو آدمیوں کی جان بچانے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ مسٹر دراز قد نے میری شاندار کامیابی پر دلی مبارکباد دی اور اس کے صلہ میں ایک سگریٹ عنایت کرنے کے لئے میری ہی جیب میں ہاتھ ڈال میری ڈبیا سے سگریٹ کی تواضع کرنی چاہی، مگر جیب جیب میں کچھ نہ ملا تو دوسری جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر پھر ہاتھ خالی نکلا کیونکہ سگریٹ کی ڈبیا موٹر میں رہ گئی تھی اس پر میں نے فیلسوف صاحب سے دریافت کیا کہ آپ میری ڈبیا بھی لائے یا وہیں چھوڑ آئے۔

سب لے آیا ہوں کہتے ہوئے بغل میں سے ڈبیا نکالنی چاہی گر وہ غائب تھی۔

"شاید آتے ہوئے گر گئی" میں نے پوچھا

اس پر سب نے موٹر کی طرف پلٹ کر دیکھا اور اس کی روشنی میں معلوم ہو رہا تھا کہ ڈبیا کنارے کے قریب تیر رہی تھی۔ خوش نصیب صاحب فوراً لپک کر وہاں گئے اور جوں ہی اسے جھک کر اٹھایا تو موٹر کی روشنی کا عکس آپ کے فرق مبارک پر اس طرح پڑا جس سے آپ کی سپاٹ چندیا جگمگا اٹھی۔ غرض ڈبیا آگئی اور جب اسے کھولا گیا تو ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی کہ سب سگریٹ محفوظ تھے اور کوئی بھیگا ہوا نہ تھا، اسی وقت ایک ایک عدد سگریٹ تبرکاً تقسیم ہوا اور بے صبری سے پیا گیا۔

اب ذرا جان میں جان آئی اور اپنا تفصیلی جائزہ جو لیا گیا تو معلوم ہوا کہ سب کے سب سرتاپا پانی میں بھیگے ہوئے ہیں۔ جوتے بھیگ کر دو دو سیر کے ہو گئے تھے علاوہ اس کے کپڑوں کا پانی بہ بہ کر جوتوں ہی میں جا رہا تھا جس کے باعث چلنا دوبھر ہو رہا تھا۔ اس وقت عجیب منظر آنکھوں کے سامنے تھا چاروں طرف سخت تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ہوا زوروں سے چل رہی تھی اور دور دور تک کوئی چراغ کی روشنی تک نہ معلوم ہوتی تھی جس سے ڈھارس بندھتی کہ یہاں انسان رہتے ہیں۔ نالہ زوروں پر تھا اس کی ہیبت ناک آواز اس بلا کی تھی جس سے خیال ہو رہا تھا کہ موٹر کے پرخچے اڑ جائیں گے۔ جو جو سامان موٹر سے نکل سکا تھا وہ ایک جگہ ڈھیر کر دیا تھا جو سب تر بتر ہو گیا تھا کچھ سوجھائی نہیں دیتا تھا کہ ہم دنیا کے کس خطے میں ہیں اور اب کدھر جائیں۔ تکیے، بستر، کمبل، بندوق اور ــــ سب بھیگ گئے تھے آخر تھوڑا بہت سامان بغلوں میں دبا کیچڑ پانی میں گرتے پڑتے اور اللہ کا نام لیتے ہوئے نکل کھڑے ہوئے گر جگہ جگہ ہی معلوم ہوتا تھا کہ اب ٹھوکر کھائی اور اب گرے۔ غرض ہم پانچوں درویش اپنا اپنا راستہ ڈھونڈتے ساتھ ساتھ اور کچھ دور دور آگے کی طرف بڑھ رہے تھے کہ ہماری دائیں طرف کسی جانور کے دوڑنے کی آواز آئی خوش قسمتی سے اس جانب ہمارے خوش نصیب صاحب کاندھے پر بندوق لئے اپنا راستہ ٹٹول رہے تھے اور اس آواز سے لرزہ براندام ہو گئے اور فوراً نشست لئے بندوق داغ دی۔

کیا ہے!! کیا ہے!!! ہم لوگوں نے ایک دم گھبرا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں" ہوش حواس مجتمع کرتے ہوئے مسٹر خوش نصیب نے کہا۔ "میری نظر نے اگر غلطی نہیں کی تو میں نے ابھی ابھی ایک شیر دیکھا"۔

یہ سنتے ہی ہماری پلٹن میں بدحواسی چھا گئی ہر ایک نے دل میں دعا مانگی اے کاش خدایا میں اس وقت نالے والی موٹر ہی میں ہوتا۔

حضرت پیر طریقت بولے "میرا کمبل دو مجھے سردی معلوم ہو رہی ہے"۔

مسٹر لم تڑنگ نے کارتوسوں کی پیٹی سنبھال لی اور چند باسپاٹ صاحب نے حضرت فیلسوف کو بندوق دیتے ہوئے کہا کہ شیر مر چکا ہے میرے پیٹ میں اس وقت بڑی گڑبڑ ہو رہی ہے میں ابھی دو منٹ میں آتا ہوں۔

ابھی کہاں چلے؟ مسٹر لم تڑنگ ڈپٹ کر بولے

"اس وقت اس حلقہ سے آپ کا باہر جانا خطرے
سے خالی نہیں۔ صبر کیجیے صبر۔ اور ہمت کر کے ہمارے
ساتھ چلے آیئے۔"

میں نے دیکھا تھا کہ جب ہماری موٹر پانی میں
پھنس گئی تھی تو اس میں سے فرار ہوتے وقت حضرت
پیر طریقت نے ہماری رہنمائی فرمائی تھی اس لئے میں نے
کہا یا حضرت! اب آپ ہی خضر بنکر رہنمائی فرمایئے۔

"ہاں! ہاں! آؤ گھبرانے کی بات ہی کیا ہے
وہ تو غنیمت ہے کہ شیر مر چکا ہے ورنہ اس وقت سخت
مصیبت میں جان آجاتی تاہم دیکھو میں جسطرح رہنمائی کروں
اس طرح آگے بڑھو۔" سامنے چندیا سپاٹ صاحب آپ
رہیے اور بتاتے جایئے کہ آپ نے فیر کس طرف کیا تھا
اور شیر کہاں مرا پڑا ہوگا۔ مسٹر طویل ہمارے دست
راست ہیں لہذا میرے سیدھے ہاتھ پر رہینگے اور میاں
ٹلو (مجھ سے مخاطب ہوکر فرمایا) تم بائیں ہاتھ کی طرف
رہو۔ حضرت فیلسوف موٹر میں سے بھی سب کے بعد
ہی آئے تھے لہذا اب بھی سب کے پیچھے رہیں۔" چنانچہ
اس ترتیب سے ہمارے فوجی دستے نے نقل و حرکت
شروع کی۔

اس وقت درحقیقت ہم سب خوف سے ہراساں
تھے اور خدا سے دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہے تھے
کہ اگر کوئی پناہ کی جگہ مل جائے تو وہیں دبک جائیں مگر
وہاں نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن، کا معاملہ درپیش
تھا کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ مینڈکوں
اور جھینگروں کی آواز نے جنگل کو سر پر اٹھا رکھا تھا
جس سے ہماری وحشت میں اور اضافہ ہورہا تھا یا
بعض اوقات ہوا کے جھونکے سیلاب کی ہیبت ناک
آواز کانوں تک پہنچا دیتے تھے۔

لم ترڑنگ اور فیلسوف صاحبان کی ڈھارس اور
ہمت دلانے سے قدم خود بخود اٹھ رہے تھے ورنہ میں
تو درحقیقت الف لیلہ میں غوطے کھا رہا تھا:-

"کاش اس وقت الہ دین کا چراغ مل جاتا تو
اس مصیبت سے بڑی آسانی کے ساتھ نجات
مل جاتی۔ میں اسی وقت اسے رگڑتا اور جن
نمودار ہوجاتا!"

خیالی جن کے خوف سے میں دہک سے ہوگیا
اور ہوش میں آکر دیکھا تو ہم پانچوں یاران طریقت آہستہ
آہستہ اندھیرے میں قدم بڑھا رہے تھے اور عین
اسی وقت دراز قد بول اٹھے:

"دیکھو سیدھے ہاتھ کی طرف ذرا فاصلے پر ایک
بڑا گنجان درخت معلوم ہو رہا ہے پہلے ہمیں وہاں
پہنچ جانا چاہیے اور اس کے بعد مشورہ کریں گے اگر

ضرورت ہوئی تو مردہ شیر کو تلاش کریں گے ورنہ آج رات کو بسیرا اسی درخت پر ہوگا۔

"مگر میرے پیٹ میں بڑی گڑبڑ ہو رہی ہے" خوش نصیب نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا:

"کچھ پرواہ نہیں" دراز قد بولے "ضبط سے کام لو ضبط سے۔ تم نے بڑا کام کیا ہے اور اگر یہ واقعی شیر نکلا تو کل حیدرآباد میں دھوم مچ جائے گی دور دور سے لوگ اس کو دیکھنے آئیں گے" "تو پھر کل ہی اس کا فوٹو بھی کھینچنا چاہیئے" خوش نصیب صاحب نے رائے دی۔

"بیشک کل ہی اس کا فوٹو کھینچیں گے" فیلسوف بولے "مگر اس فوٹو میں شیر کے اوپر پاؤں رکھ کر اور بندوق ہاتھ میں لیکر میں اکیلا کھڑا ہوں گا" خوش نصیب نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "ورنہ کون کہے گا کہ میں نے شیر مارا ہے"

"تو پھر شیر کا چمڑا میرا ہوگا" میں نے کہا

"اور ناخن میں لوں گا" دراز قد بولے

پیر طریقت نے کہا "اس کی چربی میرے حصے کی ہے"۔

"اچھا اچھا یہ سب بعد میں طے ہوگا" فیلسوف بولے "فی الحال ہمیں درخت کے نیچے پہنچ جانا چاہیئے" اور اب ہم خاموشی سے درخت کی طرف بڑھنے لگے

اب میں پھر الف لیلہ میں تھا:۔

وہ جن میرے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا ہوگا

اور میں تمکنت سے کہوں گا ارے دیکھو جی پہلے

نالہ میں سے موٹر نکال کر اور صاف کر کے

گھر پہنچا آؤ پھر ہم سب کو معہ اس شیر کے افضل گنج

کے پل کے پاس موٹروں کے اڈے کے

قریب چھوڑ دو .... مگر ہاں......

اس حال میں وہاں جانا ٹھیک نہیں......

"میں نے اسی طرف بندوق چلائی تھی۔ خوش نصیب بول اٹھے آپ لوگ اب ذرا ہشیاری سے قدم اٹھائیے

اس پر ہم سب کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی اور بس درخت کی طرف گھسٹنے لگے۔

اب میں دل سے دعائیں مانگ رہا تھا کہ یا اللہ اپنی رحمت کا فرشتہ بھیج دے یا کم از کم وہ جن ہی آجائے تو مشکل حل ہو جائے۔ میں اس سے کہوں گا ارے دوست اب تو گھر ہی پہنچا دو افضل گنج جانے کی ضرورت نہیں بلکہ یہ موٹر بھی بعد میں آسکتی ہے اور یہ الیسوف فیلسوف بھی بعد ہی میں آتے رہیں گے اس وقت سب سے اوّل مجھے ہی گھر پہنچ جانا چاہیئے.....

اڑ اڑا اڑ ادھم

ہیں! ہیں!! ہیں!!! ارے یہ کیا ہوا سب چیخ اٹھے

اور اب میں کسی جانور سے ٹکرا کر قلابازی کھا چکا تھا جنات صاحب غائب تھے اور خوش نصیب صاحب مجھ پر بندوق تانے کھڑے ہوئے تھے۔

ارے میں ہوں میں ہوں کہیں بندوق نہ چلا دینا اور دیکھو یہاں سے کوئی چیز اٹھ کر درخت کی طرف بھاگی ہے۔ اب ہم دیوانہ وار درخت کی طرف لپکے اور وہاں سے بھی کئی شیر دھبڑ دھبڑ کرتے ہوئے نکل بھاگے۔

ٹھائیں! ٹھائیں!! بندوق کی نالیوں میں سے آواز آئی:

"ارے کارنوس لاؤ کارتوس! مارلیا ہے!! جانے نہ پائے!!!"

"جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو!!" پیر طریقت صاحب فرما رہے تھے اور فیلسوف صاحب بندوق بھرنے میں مدد دے رہے تھے کہ بیس پچیس قدم کے فاصلے پر ایک صدا بلند ہوئی:۔

ہینچوں.... ہینچوں.. ہینچوں.. ہینچوں.... ہینچوں

"اے سبحان اللہ کیا شیر مارا ہے رے میرے بندوقچی!" میں نے جھنجلا کر کہا

تفو بر تو اے شیخ چلی تفو!!

یہی آپ کی نظر تھی جس نے شیر کو گدھا بنا دیا۔"

دراز قد بولے "اے میاں یہ تو کسی کمہار کے گدھے ہیں چلو بھاگو یہاں سے ورنہ خیر نہیں" ہمیں بے اختیار ہنسی آ رہی تھی اور پیٹ پکڑے پھر رہے تھے اور ساتھ ہی یہ بھی خیال تھا کہ کمہاروں سے کہیں ٹھہ پٹائی نہ ہو جائے اور حیدرآباد کے اخباروں میں یہ خبر درج ہو۔

ایک سنسنی خیز معرکہ

> محبوب نگر سے بذریعہ تار اطلاع موصول ہوئی ہے کہ کل رات وہاں سے دس میل کے قریب ایک سخت فرقہ وارانہ فساد رونما ہو گیا جس کے سبب کئی آدمی منضرر ہوئے۔ دو گدھے ہلاک ہوئے حالت پر امن کہی جاتی ہے۔ مزید تفصیلات کا انتظار ہے۔

خیر گدھوں کو چیخ پکار مچا کر کچھ دیر نہ ہوئی تھی اور ہم راہ فرار کے متعلق تدابیر سوچ رہے تھے کہ دور سے ایک چراغ کی روشنی نمودار ہوئی جو ہماری طرف بڑھتی چلی آ رہی تھی ہم نے خاموشی کو غنیمت جانا گروہ چراغ والا ہماری طرف ہی بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ جس کے کندھے پر اب ایک لٹھ رکھا ہوا بھی معلوم ہو رہا تھا۔ وہ چیختا چلا آ رہا تھا کہ کس نے بندوق چلائی مگر ہم ابھی خاموش تھے جب وہ ہمارے قریب آگیا تو ہم بھی

آگے بڑھے اور بڑھتے ہی ہم نے پوچھا "ہم کہاں ہیں، گاؤں کتنی دور ہے اور کیا ہمیں بدلنے کو کچھ کپڑے لتے مل جائیں گے؟ مگر اس دہقانی نے ایک بات کا بھی جواب نہ دیا البتہ بیٹھے بیٹھے پلٹا کر الٹے قدم واپس جانے لگا۔

میں نے دیکھا کہ وہ ہمارے سوال پر کترا کے بھاگا جا رہا ہے تو میں اس کی طرف لپکا مسٹر طویلؔ نے بھی میرا ساتھ دیا اور اب ہم دونوں اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ اور وہ پوری تیزی سے قدم اٹھا رہا تھا۔ اندھیرے میں بھاگ دوڑ سے اسے کچھ محسوس نہیں ہوا اور اس نے تھوڑی دور جا کر ٹھوکر کھائی اور گر پڑا ہم سب کو بڑا افسوس ہوا اور اس کی طرف ہمدردی کو بڑھے مگر جوں ہی اس نے ہماری ہیبت کذائی پر نظر ڈالی چیخیں مارنی شروع کر دیں :-

"ارے چلیو! ڈاکو آ گئے مار ڈالا! مار ڈالا"۔

میں یہ حال دیکھ کر فوراً آگے بڑھا مگر اس نے بیٹھے ہی بیٹھے ایک لٹھ رسید کیا میں نے پینترا بدل کر اس کا وار خالی جانے دیا اس پر وہ کھڑا ہو گیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہم سب کو دیکھنے لگا ہم نے اسے سمجھایا کہ ہم حیدرآباد سے آ رہے ہیں اور ہماری موٹر نالے میں پھنس گئی ہے تو ہمیں بتا کہ ہم کہاں ہیں اور یہاں کوئی مدد بھی مل سکتی ہے یا نہیں؟

اس پر اس کے کچھ ہوش ٹھکانے ہوئے اور اس نے کہا کہ گاؤں یہاں سے کوئی میل بھر کے فاصلہ پر ہے اور وہیں کوئی مدد مل سکے گی۔ مگر مجھے خدارا آپ حضرات معاف کریں مجھے چوروں کا دھوکا ہوا تھا کیونکہ گزشتہ ہفتے اس گاؤں میں ڈاکہ پڑ چکا ہے اور میں سمجھا تھا کہ آج بھی یہی بلا نازل ہوئی ہے اس پر ہم نے اسے دم دلاسا دیا اور یہ اطمینان کر کے کہ اس کے چاروں گھڑے صحیح سلامت ہیں اور سب نشانے خالی گئے ہم اس آدمی سے گاؤں کی سمت دریافت کر کے اس کی طرف روانہ ہو گئے۔

میں نے پیر طریقت سے مخاطب ہو کر کہا "کہ حضرت اب رہنمائی فرمائیے۔ اس پر انھوں نے ہم سب کی ہمت بڑھائی اور آگے آگے ہو لئے۔ فلسفی جیسا نے ہوا کے سرد تھپیڑوں سے بچنے کے لئے گیلے کپڑوں کے ماسوا گیلا کمبل بھی اوڑھ رکھا تھا تھوڑی دور جانے کے بعد وہ اس بوجھ کو نہ سنبھال سکے اور آخر یہ کالی بلا ایک صاحب کے حوالے کی گئی۔ ہمارے خضر راہ اب کیچڑ پانی میں چلتے چلتے تھک گئے تھے فرمانے لگے کہ صاحبو! آہستہ آہستہ چلئے ورنہ خاکسار تو ہمیں ڈیرا ڈنڈا ڈال دیتا ہے۔ ان سے بہتیرا کہا گیا

کہ اب گاؤں قریب آگیا ہے قدم بڑھاتے چلے چلو تو مصیبت تیز ہو جاتی ہے مگر وہ کس کی سننے والے تھے نہ ماننے پر نہ مانے آخر جب ہم نے دیکھا کہ اگر انہیں تیز قدم چلنے کے لئے ذرا بھی مجبور کیا تو آگے چل کر یا تو وہ زمین بوس ہو جائیں گے یا ناپانک سجدہ شکر بجالانے میں دریغ نہ فرمائیں گے تو ہم بھی اٹھتے بیٹھتے کوئی دیڑھ گھنٹے میں گاؤں کے قریب پہنچ گئے۔ یہاں درخت بہت گنجان تھے اس لئے بہت زیادہ اندھیرا تھا جہاں پاؤں پڑتا تھا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی نرم نرم چیز پاؤں کے نیچے دب گئی ہے اور جب پاؤں اس میں سے نکالا جاتا تو فضلہ کی بو سے دماغ پھٹا جاتا تھا۔ دراز قد ہماری رہنمائی کر رہے تھے اور تھوڑی ہی دور چلے ہوں گے کہ دہم سے ایک خندق کے اندر غائب ہو گئے یہ مصیبت نازل ہوتے ہی ہم بوکھلا گئے۔ ایک صاحب بہت پھرتی سے آگے بڑھے مگر درخت سے سر ٹکرا گیا اور انھوں نے واویلا مچانی شروع کر دی۔ حضرت روشنضمیر کو دراز قد صاحب کی فکر لاحق تھی اس لئے پکار اٹھے

"آپ کہاں تشریف فرما ہیں؟"

"کیچڑ اور گوبر میں لت پت ہو گیا ہوں مجھے نکالو!"

دراز قد صاحب نے مطالبہ کیا۔

اس پر حضرت رہنما نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اوپر کھینچنا چاہا مگر جھونک نکل گیا اور آپ بھی وہیں پہنچ گئے۔

یہ حال دیکھ کر ہم تیغِیان یارانِ طریقت نے ان دونوں کو بدقت باہر نکالا۔ اور ان کی جھاڑ پونچھ کر کے پھر آگے بڑھے۔ خدا خدا کر کے ایک چراغ ٹمٹماتا ہوا دکھائی دیا مگر جب ہم ہنستے بولتے ہوئے اس کی طرف بڑھنے لگے تو معلوم ہوا کہ کسی نے دروازہ بند کر لیا۔ بہتیرا دروازہ کھٹ کھٹایا اور جھنجوڑا مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی آخر آگے بڑھے ایک اور مکان نظر آیا وہاں جو پہونچے تو اس کا دروازہ بھی بند تھا۔ ہم سمجھ گئے کہ اب یہاں بھی پناہ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی کیونکہ یہاں کے ہر ایک باشندے کو گزشتہ ڈاکے کی مصیبت یاد ہے۔

اب ہم گاؤں کے اندر داخل ہو گئے تھے۔ اس کی گلیوں میں لید گوبر اور پانی کا فرش ہو رہا تھا جسمیں ہمارے جوتے پھنسے جا رہے تھے اس وقت حیدرآباد اور اس کی صفا سڑکیں یاد آرہی تھیں اب ہم اپنے اپنے جوتے ہاتھوں میں لے کر قدم بڑھا رہے تھے اس خیال سے کہ کہیں گلیوں میں وہ چپک کر نہ رہ جائیں خدا خدا کر کے ایک ٹوٹا پھوٹا مکان نظر آیا معلوم ہوتا تھا کہ وہ گاؤں کی چوپال یا کوئی خانقاہ تھی۔ اس میں



سیدھی جانب سے : نواب علی محمد خان بہادر ایم-اے-ایل ایل-بی-ایف-او-یو-ایم-آر-اے-ایس (لنڈن)
(۲) ڈاکٹر عبدالجبار ایم-بی-بی ایس-ڈی-پی ایل او (لنڈن) (۳) ڈاکٹر کریم عباس ایل-ایم اینڈ ایس
(۴) میجر عنایت علی خان ایم-بی-سی ایچ بی-(اڈنبرا)-(۵) ڈاکٹر عبدالرحیم بی-اے-ایم-بی-بی
ایس اینڈ ڈی-ایم-او-ایس (لنڈن) مسٹر روبنس (فرش پر)-

دو چار آدمی سو رہے تھے کچھ سکڑے سکڑائے بیٹھے نظر آرہے تھے اور حقہ کا دور چل رہا تھا۔ ہم پانچوں آدمیوں کے داخل ہوتے ہی ان میں کھلبلی مچ گئی۔ ایک شخص فوراً اٹھا اور دیوار کے سہارے ایک ڈھیر سا تھا اس پر چادر ڈال ٹیکا دے کر بیٹھ گیا۔ دوسرے بزرگوار نے اپنا حقہ ایک کونے میں رکھدیا بقیہ دو چار آدمی گھبرائے ہوئے ہماری طرف لپکے۔ ہم نے ان کو دم دلاسا دیا۔ مگر وہ کچھ مطمئن نہ ہوئے ہمارے رہنما صاحب سردی اور پانی سے اکڑے جا رہے تھے لہذا ہم نے گاؤں والوں سے کہا کہ اس وقت ہمیں کچھ کپڑے دو اس پر انہوں نے ایک پرانی دھوتی اور پھٹی ہوئی شطرنجی عنایت فرمائی جن سے حضرت رہنما کی مشکلات رفع کی گئیں اب ہمیں بھی اپنے بھیگے ہوئے کپڑے بدلنے کی ضرورت معلوم ہو رہی تھی۔ اس لئے اور کپڑے مانگے گئے اس پر وہ لوگ خاموش ہو گئے اور ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اپنا جسم پونچھنے کے لئے اس چادر کو کھینچ لیا جو قریب کے ڈھیر پر پڑی ہوئی تھی۔ جوں ہی یہ چادر اتاری ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب معلوم ہوا کہ یہ نئی ساڑیوں کا ڈھیر تھا۔ اور جو آدمی اس کو ٹیکا دئے ہوئے بیٹھا تھا وہ پھیری والا سوداگر تھا جو گاہے ماہے اس گاؤں میں کپڑے فروخت کرنے آتا جاتا رہتا تھا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ اس غیبی امداد پر ہمیں بڑی مسرت ہوئی اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اس مسبب الاسباب نے ہمیں اس نازک موقع پر کم از کم نئی ساڑیوں سے ستر پوشی کا موقعہ عطا فرمایا۔

فوراً اس سے مطالبہ کیا گیا کہ رنگ برنگ کی پانچ ساڑیاں ہمیں دی جائیں مگر وہ ہمیں ابھی حیرت سے دیکھ ہی رہا تھا کہ دراز قد صاحب نے پچیس روپے اس کے ہاتھ پر رکھدیئے۔

"سرکار میرے پاس دھوتیاں بھی ہیں" بڑی لجاجت سے پھیری والے نے کہا۔

"اچھا تو پھر چار دھوتیاں اور ایک ساڑی دو دھوتیاں ہم لینگے اور ساڑی مسٹر قصیر کے باندھی جائیگی" دراز قد بولے۔

میں یہ سنتے ہی سٹ پٹا گیا اور اپنے بچنے کی بہت فکر کی مگر یاران طریقت کب ماننے والے تھے فوراً دھوتیاں زیب بدن کر کے اس خاکسار کی جان کو آگئے اور زبردستی ساڑی پہنا دی۔

میں اس وقت کیسا معلوم ہو رہا تھا اس کا مجھے اندازہ نہیں ہو سکا البتہ میرے ساتھیوں نے میرے حال قال پر اداکاری کے جو جو کمالات دکھائے ہیں

یں کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ غرض مجھے بے انتہا وق کیا گیا اور آخر میں نے بھی ساڑی اتار سب کی طرح آدھی دھوتی باندھ کر آدھی اوڑھ لی اور اب ہم پانچوں مست قلندر بیراگی معلوم ہو رہے تھے۔

غرض رات چٹکی بجاتے انہی دلچسپیوں میں گذر گئی صبح کو اسی حال سے ہم اپنے چوڑے چکلے میزبان کے ہاں پہنچے جو ہیں "سودیشی بھوت" سمجھ کر پہلے تو بہت سٹ پٹائے مگر جب انھیں یقین آگیا کہ ہم پانچوں ان کے معزز مہمان ہی ہیں تب تو آکر خوب گلے ملے۔ سارا ماجرا سنا اور سب سے اوّل کیمرے سے تواضع کی اس کے بعد کپڑوں کا صندوق منگوا کر اپنے ڈھیلے ڈھالے کپڑے ہمیں پہنوائے۔ یہ رنگ بھی قابل دید تھا۔ مجھے ان کی قمیص سے ڈیرے میں سماجانے کا لطف آرہا تھا۔ اور آج جبکہ گھر آگیا ہوں اور ہمجولی کے لئے یہ سرگذشت قلمبند کر رہا ہوں تو اس کا رہ رہ کر خیال آرہا ہے کہ اگر لیا جاتا تو ڈھیلے پتلون کا فوٹو بھی عجیب چیز ہوتا!

اخلاقی نتیجہ:۔ برسات میں سفر کرنا ہو تو کچھ کپڑے ضرور ساتھ رکھو۔
غیر کی موٹر میں اگر سفر کرنے کا اتفاق ہو تو چھوٹے سے چھوٹے نالے کو بھی ہرگز عبور نہ کرو۔
کم از کم گرما گرم چائے ضرور ساتھ رکھو۔
کسی فیلسوف، دراز قد، چندیا سپاٹ یا پیر طریقت کو رفیق سفر نہ بناؤ۔
لیکن پستہ قامت شخص (مسٹر فقیر) کو اس موقعہ پر ہمیشہ اپنے ساتھ رکھو۔
تاکہ دین و دنیا کی ہر دو نعمتوں سے مالا مال ہو سکو۔ (ترجمہ)

سہانی برسات آگئی

آپا بیگم سے

از محترمہ بیگم سیّد اسد الزّماں خاں رضوی دہلوی

جنابہ مکرمہ! آداب عرض ہے

یہ عجیب بات ہے کہ بعض رسالے مضمون نہ بھیجو تو تقاضوں کے مارے جینا دشوار کر دیتے ہیں لیکن بھیجو تو چھاپتے نہیں یہ مضمون ——— کو بڑے اصرار پر بھیجا تھا۔ جو آج تک چھپ رہا ہے۔ یہ بھی نہیں کہ مضمون کارکنان ——— کو وصول نہیں ہوا یا پسند نہ آیا۔ رسید و پسند کی اطلاع بھی مل چکی ہے مگر اس کے بعد ان حضرات نے کچھ ایسی گھنی سادھی کہ بس تو یہ ہی بھلی ہے۔ بہرحال اس نازیبا خاموشی سے زچ ہو کر اب ذیل کی چند سطریں آپ کی خدمت میں مرسل ہیں۔ ساتھ ہی یہ دعا ہے کہ خدا کرے: ہجولی پر ——— کا پرچھاواں نہ پڑے!!

آپکی وقار

گرمی گئی۔ برسات آئی۔ کیسی سہانی رُت ہے۔ برس رہا ہے۔ ہوا میں برکت ہے پانی میں امرت ہے۔ چوطرف سبزی ہے۔ شادابی ہے۔ غرض آسودگی ہی آسودگی ہے۔

اور:—

"کیا زور سے مینہ آج گھٹا جھوم کے آئی!"

جدھر دیکھو۔ روم جھوم گھٹائیں چلی آتی ہیں۔ چھم چھم مینہ میں آج کل ٹوٹی جو کی ہوں۔ مبارک بنگلے میں

قیام ہے۔ یہ آبادی سے دور بڑی سیر کی جگہ ہے۔
سامنے اونچی اونچی پہاڑیاں ہیں۔ ان پر سبزہ لہلہا
رہا ہے۔ دامن میں ایک گنجان امرئی ہے۔ یہاں کبھی
کویل کوکتی ہے۔ پپیہا بول اٹھتا ہے۔ تو کبھی مور جھنگارتے
ہیں۔

کل کا ذکر سُنیے۔ میں، سلمیٰ، شکیلہ، اقبال
زمانی امرئی پہنچے۔ یہاں اور بیویاں بھی تھیں۔ اونچے
اونچے درختوں میں جھولے پڑے تھے۔ گیت گائے
جا رہے تھے۔ اتنے میں کیا دیکھتی ہوں کہ نشاط منزل
کی بیویاں آن اتریں۔ عقیلہ نے جو ہمیں دیکھا۔ تو
باچھیں کھل گئیں۔ جھٹ آکر لپٹ گئیں۔ اور ہمارے
ہی ساتھ ہو بیٹھیں۔ اب کہے جاتی ہیں۔ آپا وقار!
رسی، پٹریاں لائی ہوں۔ چلیے ہم بھی جھولا ڈالیں
جھولیں۔ میں نے ہنس کر کہا۔ بہن! جاؤ۔ جھولو۔
میں نے روکا ہے؟ کہتی ہو تو میں بھی چلی چلتی ہوں۔
گر جی امنڈتا ہے جھولوں گی نہیں لیکن عقیلہ کب ماننے
والی اسامی تھیں ایک نہ سنی۔ جب پیچھے ہی پڑ گئیں
تو مجھے بھی مُنہ پھوڑ کے کہنا پڑا کہ بیوی سنو۔ بات
اصل یہ ہے۔ میری آپا بیگم نہیں۔ تو میرا جی ٹھکانے نہیں
اس وقت بھی بیٹھی قطب صاحب میں جھولے کا مزہ
لوٹ رہی تھی۔ قطب صاحب کا نام سُن کے تو بی

اقبال زمانی کے بھی کان کھڑے ہوئے۔ کہنے لگیں۔
وقار! وہی نا جو اگلے برس ہم سب مل کے دلی گئے
تھے۔ اور خواجہ صاحب جا کے جھرنے پہ کڑھائی کی
تھی؟ اتنا سننا تھا کہ عقیلہ پنچلی ہو بیٹھیں۔ کیوں نہ ہو۔
دلی والی تھیں۔ ادھر سلمیٰ اور شکیلہ نے جان کھانی
شروع کی کہ اچھی وقار! وہی باتیں سنا دو۔ جھرنے
پہ کڑھائی کا نام سننے سے تو اللہ جانتا ہے جی لوٹ
گیا۔ ہم بھی تو آخر اُس سیر کا حال سنیں۔ میں نے کہا
بھئی! سیر کیا تھی۔ بچھڑے مل بیٹھے تھے! خیر سننا
ہی چاہتی ہو تو لو سنو:۔

اب کہاں کا قطب۔ کس کا شمسی
تالاب۔ کیسا جھرنا۔ ان کا بھی ایک زمانہ تھا۔ آج
وہ دلی ہے۔ نہ بادشاہی۔ ان کے ٹھاٹھ تو کبھی اگلے
وقتوں دیکھنے کے قابل تھے۔ خیر! ہم جو وہاں
پہنچے تو ایسا معلوم ہوا۔ کہ پرانا نقشہ آنکھوں کے
سامنے جما ہوا ہے۔ اس سے دل کی عجب حالت
ہو گئی۔ کتنی ہی دیر بیٹھے اگلے وقتوں کی یاد کیا کئے
پھر اٹھے۔ اور خیال کیا کہ جھرنے کے پہلو میں جو آم
کا درخت ہے۔ اس میں کبھی منجھلی بیگم بادشاہزادی
کا جھولا پڑتا تھا۔ لاؤ اس مبارک جگہ ہم بھی جھول لیں
اس خیال سے اس وقت پھر ایک دل میں دکھ کی

ٹیس تھی ۔ اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ لو صاحب! پھر سب نے مل کے جھولا ڈالا۔ کڑھائی چڑھائی۔ پکوان کیا۔ مہرولی سے کھویا منگایا۔ پراٹھے پکوائے۔ سرولی آم کا اچار ساتھ تھا۔ اندرسے۔ اندرسے کی گولیاں سہال خود تلے۔ اور خوب سیر ہو کر کھایا۔ اس وقت کبھی میٹھی میٹھی پھوار پڑتی تھی۔ کبھی بھنیاں بھنیاں برسنے لگتا تھا۔ بس ہم بھی کھا پی نچنت ہوئے۔ اور جھولے پہ آکے ملہار گانے لگے :—

جھولا کن ڈالو ہے امریاں!

باگ اندھیرے۔ تال کنارے۔ مورلا جھنگارے۔ باور کارے

برسن لاگیں بوندیں بھنیاں بھنیاں

سب سکھی مل گئیں۔ پھول بھلیاں۔ بھولی بھولی ڈوبس شونق نگریاں

جھولا کن ڈالو ہے امریاں !

ہائے! وہ سہانا وقت ۔ وہ بھیتری آوازیں ۔ ڈالی ڈالی پتے پتے سے ”جھولا کن ڈالو“ کی آواز آرہی تھی!—

بس بھئی! ان باتوں کو میں نے خوب نمک مرچ لگا کر سنایا۔ آدمی خیال کا تو بندہ ہوتا ہی ہے۔ اس سے سماں بندھ گیا۔ اور ایسا لطف آیا کہ کیا کہئے اصل پوچھو تو مجھے چاہئے بھی یہی تھا۔ نہیں تو مقبلہ کب چین سے بیٹھنے دیتیں۔ اتنے میں خاصی اویر ہو گئی۔ اور ہم سب اسی خیال میں مگن وہاں سے چلے آئے۔

مگر آپا بیگم! آپ جانتی ہیں۔ ان باتوں میں میرا دل نہیں لگتا۔ گو یہ سمجھتی ہوں۔ گزرا زمانہ خوشنما ہوتا ہے۔ لیکن میں پوچھتی ہوں۔ اگلی باتوں کا آخر کوئی کب تک راگ گائے۔ صاف بات ہے کہ زمانہ کا ہر قدم آگے کو ہے۔ اس لئے جو گزرا سو گزرا اب جو کچھ ہے۔ اُسے ہی آدمی کیوں نہ بہترین بنائے ۔ مگر یہ کہو وہ تو بات ہی اور تھی۔ آپ کی یاد ستا رہی تھی۔ جو میں نے اتنی رام کہانی بنائی۔ نہیں تو بھلا آج کا دن کہیں ایسا تھا کہ بغیر منہ بولے۔ جھولا جھولے۔ یوں روکھا پھیکا گزارا جاتا! لیکن آپ کے ہوتے ہی اس بہار کا کچھ مزہ آتا۔ یقین جانو۔ میرے لئے تو اس وقت کا ایک ایک لمحہ پوری بہار زندگی بن جاتا۔ اور آج جو زمین سے آسمان تک برکت ہی برکت ہے تو آپ دیکھتیں! اس میں ہماری روحیں ڈوب جاتیں!!

رسالہ ساقی دہلی

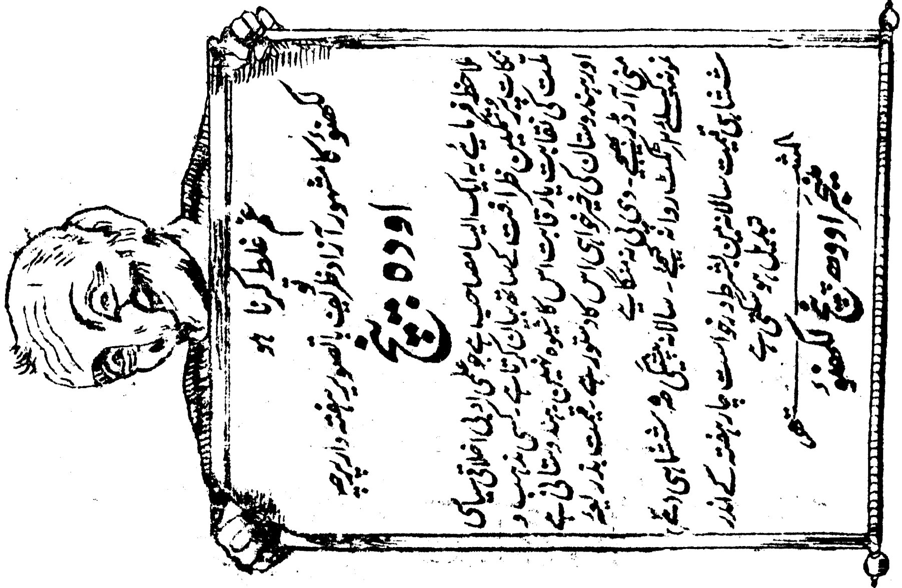
اپنی ادبی رعنائیوں کیساتھ ماہ بماہ نہایت پابندی سے شائع ہو رہا ہے مستقل خریداروں کو مندرجہ ذیل **چار خاص نمبر بالکل مفت** دیئے جاتے ہیں

(۱) سالنامہ (۳) افسانہ نمبر
(۲) ظریف نمبر (۴) دلی نمبر } سالانہ ضخامت (۱۵۰۰) صفحات

ساقی کا شاندار "دلی نمبر" عنقریب شائع ہونیوالا ہے نئے مستقل خریداروں کو "دلی نمبر" کیساتھ سنہ ۳۶ء کا "افسانہ نمبر" بھی بالکل مفت دیا جائے گا +

شرح چندہ:- سالانہ (ہے) ششماہی (عہ) نمونہ مفت

ملنے کا پتہ:- مہتمم رسالہ "ساقی" دہلی



شائع ہوگئی

شائع ہوگئی

اس زمانے کی بہترین تصنیف

مَتاعِ دَرد

یعنے

دیوان سحر طراز مولوی سیّد ابو محمد ثاقب کانپوری

اگر آپ کو اردو شاعری سے دلچسپی نہیں ہے، اگر آپ کا دل دنیاوی افکار و پریشانیوں سے افسردہ و مضمحل ہو چکا ہے، اگر آپ شاعری کا حقیقی معیار اور ارتقائی درجہ دیکھنا چاہتے ہیں تو

مَتاعِ دَرد

پڑھیے

جس کی اشاعت نے اُردو ادب میں ایک مبارک انقلاب پیدا کر دیا ہے اس کی پرجوش و ولولہ انگیز نظمیں آپ کی روح کو بیدار کر دیں گی، اس کی پُرکیف و وجدآفریں غزلیں جذبات و احساسات کا آئینہ ہیں اس کی مخمور رباعیاں عمر خیام کے رنگ میں ڈوبی ہوئی معرفت کا درس دے رہی ہیں۔

سرورق خوشنما، ضخامت ۲۰۰ صفحات، کاغذ، لکھائی، چھپائی بہترین

قیمت فی جلد غیر مجلد ۱۲؍ ـ قیمت فی جلد مجلد دو روپیہ

دفتر "متاعِ درد" خانقاہ شریف کانپور

سنگِ مرمر کی ایک زبردست کان

ابھی حال میں مولوی محمد نظام الدین صاحب اے۔ ایم۔ ٹی۔ پی۔ ایچ۔ ای وظیفہ یاب انجنیئر نے علاقہ سرکارِ عالی
قاضی بیٹھ بجواڑہ لائن کے ریلوے اسٹیشن یا پٹ پلی سے دس میل کے فاصلے موضع جاشہ ٹپلی میں دریافت کی ہے
جس کا سنگ مرمر استحکام و صفائی و خوبصورتی میں اپنا نظیر نہیں رکھتا
اس کان کے کھودنے اور سنگ مرمر حاصل کرنے کے لئے آپ ابھی یورپ جا کر واپس
تشریف لائے ہیں۔ اور پانچ لاکھ روپیہ سکہ کلدار کے مجوزہ سرمایہ سے ایک کمپنی بنام

دی دکن ماربل اینڈ مائننگ کمپنی لمیٹڈ

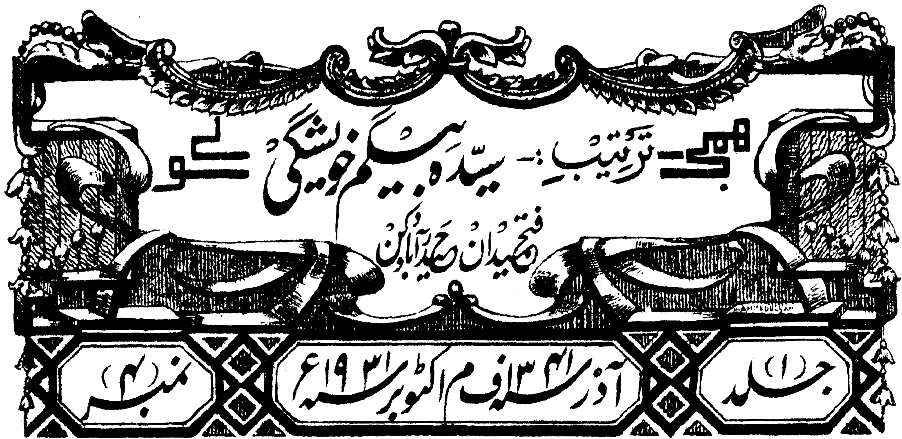
قائم کی ہے جو سو سو روپے کے پانچ ہزار حصص پر منقسم ہے ملک کے مشہور امراء و اعلیٰ عہدہ دار اس کے ڈائرکٹر ہیں اگر
آپ کو اس کمپنی سے دلچسپی ہے اور اس دریافت سے آپ معقول فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انگریزی یا اردو پراسپکٹس
اور درخواست کے فارم پتہ ذیل سے طلب فرمائیے

دی دکن ماربل اینڈ مائننگ کمپنی لمیٹڈ

نارائن گوڑہ حیدر آباد دکن

مرزا جی

ادبی ذوق رکھنے والے ناظرین و ناظرات کیلئے یہ چیز باعث دلچسپی ہوگی کہ میاں ایم۔ اسلم صاحب نے اپنے مزاحیہ افسانوں کا لاجواب مجموعہ "مرزا جی" کے نام سے شائع کیا ہے اس میں مرزا مینڈکی۔ مرزا جی لوکی والے۔ مرزا بندوقچی۔ مرزا بجریا۔ مرزا جمن مس ماڈلین۔ دعوتی رقعہ۔ مرزا تقریری۔ چھوٹے مرزا۔ بیمہ ایجنٹ۔ مچھلی کا شکار اور مرزا جی نہایت دلکش اور روح پرور افسانے ہیں۔ اور یادش بخیر۔ مولنا۔ ایڈیٹر۔ پناہ قرض۔ حلوائی اور دھوبن بڑے دلفریب مضامین ہیں۔ کتاب کی سج دھج اپنا جواب نہیں رکھتی مرزا جی کا سائز ۲۷×۱۷/۸ ہے۔ ۳۱۲ صفحے اور دبیز ولایتی چکنا کاغذ ہے اور رنگ رنگ کا مصور سرورق اس قدر دلفریب ہے کہ نظر ہٹانے کو جی نہ چاہے۔ قیمت صرف عہ



تاج پریس میں چھپکر دفتر رسالہ ہمجولی سے شایع ہوا



ایک اشرفی

ایسے صاحب قلم کو دیجائیگی جو جنوری کے سالگرہ نمبر کے لیے "ہمدردی" پر
بہترین مضمون لکھ کر دفتر ہذا میں بھیج سکیں گے۔ اسکے لکھنے میں
یہ امر ضرور ملحوظ رہے کہ مضمون سلیس دلکش اور
پر اثر ہو تاکہ ہر متنفس اسے پڑھکر سبق حاصل کر سکے
مثالیں بہترین ہوں جنکے لئے کسی زمانہ و قوم و
ملت کی کوئی قید نہیں اگر وہ

ذاتی مشاہدات میں ہوں تو فہو المراد۔ جملہ مضامین ۵ دسمبر تک وصول ہو جانے چاہئیں مضمون فلسکیپ کے پانچ صفحوں سے کم نہ ہو۔ ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہمجولی

آج ہمجولی کا چوتھا نمبر آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہے اور ہم کمال مسرت سے یہ اعلان کر رہے ہیں کہ ان ابتدائی منزلوں ہی میں اس کی شہرت کا آوازہ چار دانگ عالم میں پہنچ چکا ہے۔ یورپ اور افریقہ تو ایک طرف امریکہ تک میں اسے بڑی دلچسپی سے دیکھا جا رہا ہے۔ بہت سے قدرشناس اور خوددار بھائی بہن ایسے بھی ہیں جنھوں نے **ہمجولی** کی صرف تعریف اور شہرت سن کر اپنے یا اپنے بچوں کے لئے اسے جاری کرا لیا ہے۔ بہت سے قدردانوں نے تو خط لکھنے کی بھی زحمت گوارا نہ فرمائی بلکہ منی آرڈر کے "کوپن" پر ہی لکھ دیا کہ "ایک جگہ ہمجولی دیکھا گیا خوب پرچہ ہے ہمارے نام جاری کر دیا جائے" بعض بھائی بہن ایسے بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ "ابھی کیا ہے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے پرچہ کیا خریدیں، ایسے سیکڑوں حشرات الارض کی طرح آئے دن نکلتے جاری ہوتے رہتے ہیں اور کچھ دن آب و تاب دکھا کر یا تو ماند پڑ جاتے ہیں یا بند ہو جاتے ہیں اور روپیہ ہمارا مفت میں ضائع ہوتا ہے۔"

ایک بڑا طبقہ ایسا ہے جو ہمجولی کی شہرت سن چکا ہے، اسے دیکھ چکا ہے، اس کی قدر و قیمت سے واقف ہو چکا ہے مگر اپنی کاہلی یا بہ الفاظ دیگر عدم حوصلگی کے سبب اسے خرید کر پڑھنا نہیں چاہتا ہاں اگر مفت ہاتھ آئے تو اسے مال غنیمت سمجھ کر چپکے سے جیب میں اُتار لیتا ہے اور مزے لے لے کر پڑھتا ہے، اپنی میز کی زینت بنا کر گویا لوگوں سے اپنی خوش مذاقی کی داد لیتا ہے کہ وہ ایسے پاکیزہ اور ستھرے رسالوں کا خریدار ہے لیکن اس سے چندے کا ذکر

آجاتا ہے تو ناک بھوں چڑھاکر کہدیتا ہے کہ ہاں چند دن بعد ضرور خرید یں گے ۔
بہت سے ایسے نمونہ باز حضرات بھی ہیں جو پرچہ تو خوشی خوشی ہڑپ کر چکے ہیں لیکن اس بات کے ابھی تک خواہاں ہیں کہ سال بھر تک پرچہ نمونتًا ہی بھیجا جائے ۔ بہت سے خوشحال اور تعلیم یافتہ بہن بھائی ایسے بھی دیکھے گئے جو یورپ "تک" تعلیم حاصل کر چکے ہیں لیکن مانگے کے تانگے پر گذر کرنا اپنا شعار سمجھتے ہیں ۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ مغربی ممالک میں اخبار مانگ کر پڑھنا سخت بدتہذیبی میں داخل ہے اور وہاں کا ادنیٰ کسان بھی اتنا خود دار ہوتا ہے کہ اپنا ذاتی اخبار خریدتا ہے لیکن وہ کسی دوست سے یہ کہنے میں ذرا شرم محسوس نہیں کرتے کہ "لاؤ یہ پرچہ دیکھ کر واپس کر دیں گے" اور پھر وہ قیامت تک واپس نہیں کیا جاتا ۔ ہمارے پاس لوگوں کی کئی شکایتیں ایسی بھی آئی ہیں کہ ان کی میز سے دوستوں نے پرچہ اڑالیا اب براہ کرم فائیل مکمل کرنے کے لئے اور پرچے بھیجے جائیں اس میں ہمارا تو فائدہ ہوجاتا ہے مگر یہ کوئی انسانیت ہے کہ دوسروں کی چیز اس بیدردی سے غائب کر دی جائے اور بیچارا شوقین ٹاپتا رہجائے ۔

بعض ایسے شوقین بھی پائے گئے ہیں کہ پرچہ تو خریدتے ہیں مگر اسے پڑھ کر چکنے سے فائیل میں ٹانک لیتے ہیں اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی کہ ہمجولی ان کے پاس بھی آتا ہے ۔ بعض منچلے کتب فروشوں اور نیوز ایجنٹوں سے آس لگائے رہتے ہیں کیونکہ وہاں ادھار کھاتے پر کام چل جاتا ہے اور اسی وقت جیب سے کچھ دینا نہیں پڑتا کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ختم مہینے پر جو کچھ ہوگا بھگت لیا جائے گا ۔ سردست تو ایک فیشن ایبل اور مفید پرچہ ہاتھ آتا ہے ۔ اور ویسے بھی نیوز ایجنٹ بڑا بھلا آدمی سمجھا جاتا ہے اس لحاظ سے بھی یہ ضروری نہیں کہ اگلی تنخواہ ہی پر اس کے دام ادا کر دئے جائیں دو تین مہینے کی ٹال کوئی تنادیجائے ۔ بہت ہوگا تو چند مہینے تک اس کی دکان کی طرف سے نہیں گذریں گے اور اگر کبھی گذرنا ہی پڑا تو کسی جھٹکہ یا تانگہ کا انتظار کرتے رہیں گے اور اس کی آنکھ اس کی دکان کے سامنے سے بے تکلف آیا جایا کریں گے اور اگر خدا نخواستہ کہیں مڈبھیڑ ہی ہوگئی تو اگلے مہینے کی تنخواہ کا چکمہ تو گویا نوک زبان پر رکھا ہی ہوگا ۔ اور اگر اس کا ایک آدھ روپیہ ڈوب بھی جائے تو کیا ہرج ہے وہ مسٹر حبیب احمد صدیقی کی طرح بھلائے تھوڑا ہی بھولے گا جنھوں نے اب کے ہمجولی میں صاف لکھدیا ہے کہ اگر قوم ترقی کر سکتی ہے تو اس طرح کہ یا تو بالکل قرض نہ لے اور قرض لے تو پائی پائی ادا کر دے تو ہم بھی انشاء اللہ کسی موقع سے اس کی

پائی پائی ادا کر دیں گے مگر کیا کریں کہ ہمجولی قرض لینے میں گویا ایسا معلوم ہوتا ہے اس کے منیجر صاحب نے نیازمندانہ طریقے پر اسے ہماری بھینٹ چڑھا دیا ہے اور گویا انھیں اس کی سج دھج اور مفید بنانے پر ایک حبہ بھی خرچ کرنا نہیں پڑتا ۔

اس طرح متفرق خریدنے والے حضرات اپنی دانست میں ممکن ہے کہ فائدے میں رہتے ہوں مگر سچ تو یہ ہے کہ سب سے زیادہ ٹوٹے میں یہی رہتے ہیں ایک تو پرچہ انھیں تازہ نہیں ملتا اور اس وقت ملتا ہے جبکہ وہ سارے ہندوستان میں پہنچ جاتا ہے اور پھر نسبتاً گراں بھی پڑتا ہے اس لئے کہ پرچہ پریس سے آتے ہی سب سے اول مستقل خریداروں کو بھیجا جاتا ہے جو بچ رہتا ہے وہ نیوز ایجنٹوں کو دیا جاتا ہے تاکہ اسے اونے پونے نکال دیا جائے جو اصل قیمت سے بہرحال زیادہ قیمت میں فروخت ہوتا ہے اور یہی چیز اشتہار کا کام بھی دے جاتی ہے ۔ اور انھیں اتنا خیال نہیں آتا کہ مستقل خریداری میں چاہے وہ چھ مہینے ہی کی کیوں نہ ہو وہ فائدے میں رہیں گے ۔

ایک طبقہ ایسا ہے جو ہر مہینے اس خوشخبری کے سننے کا مشتاق رہتا ہے کہ کب کسی اخبار کا دیوالہ نکلا اور اگر پرچہ شائع ہونے میں دو تین دن کی بھی دیر ہو جاتی ہے تو بغلیں بجنے لگتی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ ہم تو پہلے ہی کہتے تھے کہ یہ کاغذی ناؤ چلنے والی نہیں آخر لٹیا ڈوب گئی نا! مگر جب تازہ پرچہ ان کے ہاتھ میں پہنچ جاتا ہے تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب وہ دیکھتے ہیں کہ ہر نمبر اپنے سابق نمبر سے بڑھا چڑھا ہوا ہوتا ہے ۔

ایک طبقہ ایسا ہے جو نہایت اعلیٰ مذاق رکھتا ہے اور صحافت کی جدت طرازیوں اور کوششوں کو نہایت شوق اور شفقت دیکھتا ہے وہ اس کی حوصلہ افزائی کی تدابیر پر سنجیدگی سے غور کرتا ہے اور جہاں تک اس کے امکان میں ہوتا ہے یہی چاہتا ہے کہ ملک کے گوشے گوشے سے مفید اور کارآمد اخبار اور ماہنامے جاری ہوں، وہ خود ترقی کریں اور ساتھ ہی ساتھ قوم میں تدبر اور روشن خیالی پیدا ہو، علم ترقی کرے ادب میں اضافہ ہو اور متمدن قوموں میں آج اسی لئے صحافت کو آنکھوں میں جگہ دی جاتی ہے کہ ان کی ساری رفعت سارا نکھار اسی صحافت کی بدولت ہے یہ طبقہ سمجھ بوجھ کر اپنی مراعات میں صحافت کی اضافی قدر و قیمت کے مراتب کا بھی خیال رکھے تو گویا اس فن کو چار چاند لگ سکتے ہیں ورنہ غیر مستحق اور گمنام جو فروش اخبار چیوں کی تو بن آتی ہے لیکن ان حوصلہ مند اور اولوالعزم اخبار نویسوں کی امنگیں غارت ہو جاتی ہیں جن کے دل میں اصلاح کی سچی تڑپ اور وطن پرستی کے غیر فانی جذبات کی ایک ٹھوکسی

اٹھتی رہتی ہے اور جس روشن ضمیر نے صرف اس نکتہ کو سمجھ کر پاکیزہ صحافت کی دستگیری کی تو وہ صحافت کے نقطہ نظر سے علم و ادب کا محسن اعظم کہلاتا ہے۔

ایک اور طبقہ سے ہمیں واسطہ پڑا ہے جو فن صحافت کی اصطلاح میں طبقہ "نمونہ بازاں" کہلاتا ہے۔ اس کی کوشش اور تلاش یہ ہوتی ہے کہ وہ ہر روز نئے جاری ہونے والے اخباروں اور ماہناموں سے واقف رہے اور جہاں اس نے اس قسم کی کوئی سن گن پائی فوراً اپنا پستہ نکال کر وہ شاندار اور دلفریب کاغذ نکالا جس کے سرنامہ پر اس قسم کی عبارت چھپی ہوئی ہوتی ہے:-

"از دفتر پرائیویٹ سکرٹری متعلقہ عالیجناب علامہ حضرت مولانا ابو الھول بطلیموسی السقراطی والبزرجمہری دام ظلکم وغیرہ وغیرہ"

اور پھر یوں لکھنا شروع کردیا کہ حضرت علامہ موصوف کا مجھے ارشاد ہوا ہے کہ میں آپ کا پرچہ دیکھوں چنانچہ اگر مناسب ہو تو ایک پرچہ نمونتاً بھیجدیا جائے تاکہ اسے فوراً جاری کرالیا جائے"۔ بیچارہ اخبار کا منیجر اس ٹیپ ٹاپ کو دیکھ کر کھلا جاتا ہے اور فوراً اگلے اور پچھلے اخباروں کا ایک گٹھا بذریعہ رجسٹری حضرت پرائیویٹ سکرٹری کی خدمت میں بھیجدیتا ہے اور پھر نہیں جانتا کہ اس کے جگر پاروں کا کیا حشر ہوا۔ بعض دل جلے اور آزمودہ کار منیجر ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اس "شاندار خرافات" کے دو ٹکڑے کرکے ردی کی ٹوکری میں ڈالدیتے ہیں لیکن عموماً یہ جادو چل ہی جاتا ہے اور نمونہ باز حضرت اس ترکیب سے مختلف پرچے وصول کرتے ہوئے اپنی دلچسپی کا "دوامی بندوبست" فرماکر سال بھر تک اینڈتے رہتے ہیں۔ ہماری دانست میں یہ طبقہ طبقۂ اسفل السافلین کہلانے کا شرف رکھتا ہے اور اس قابل ہے کہ کوئی اخبار اسے منہ نہ لگائے۔

غرض اس قسم کے اور بیسیوں طبقے ایسے ہیں جن کا پتہ لگاکر ضرورت ہوئی تو پبلک میں پیش کردیا جائیگا تاکہ اس سے ہر طرح کی احتیاط برتی جاسکے۔ اور سب سے آخر میں سب سے زیادہ دلچسپ طبقہ کا ذکر خیر کرکے اس افتتاحیہ کے سلسلے میں ایک ایسی چیز پیش کرتے ہیں جو آپ اپنی نظیر ہے یہ وہ متوسط الحال طبقہ ہے جو اخباروں اور رسائل کا حقیقی معنوں میں سرپرست کہلائے جانے کا مستحق ہے اور اسی کی گاڑھی کمائی پر صحافت زندگی بسر کرتی ہے اس کی "ہاں" اور "نہیں" میں قیامت کا زور پنہاں ہوتا ہے اور جس اخبار نے اس کا اعتبار حاصل

کرلیا۔ بس سمجھ لو کہ اس کے ولدر دور ہو گئے ایسی حالت میں اسے پوری نشو و نما کا موقعہ ملتا ہے، اس کی رگ رگ اور ریشے ریشے میں زندگی کی لہریں دوڑ جاتی ہیں اور یہی وہ مقبولیت ہوتی ہے جو صدہا "نارتھ کلف" پیدا کر سکتی ہے جس کے نام کو صحافت قیامت تک نہیں بھول سکتی۔ اس طبقے میں اچھے اور برے ہر طرح کے مذاق کے لوگ پائے جاتے ہیں جو ماحول کا اثر کہا جا سکتا ہے۔ بعض حضرات اور خواتین کو ذیل کا رنگین مضمون بہت پسند آتا ہے جسے "ادب لطیف" کہا جاتا ہے اور ٹیگور خود نہیں سمجھ سکتا۔

"ہاں! ہاں!! تیری سراب آگین ہستی جو تخلیساتی زندگیوں کے ارتعاش پذیر ہاتھوں کی جنبش مستانہ سے میرے مضراب دل کی گہرائیوں میں سما جانے کی آئینہ دار ہے ـــــ اور پھر تیرا اضطراب اس محشرستان عنکبوتی کے پردوں میں نیرنگیاں دکھاتا مچلتا چلا جاتا ہے ـــــ آہ! ـــــ کون وہی ـــــ جس کی دلدوز زمزم پاشیاں روحانی آسمانوں اور سیمابی زمینوں کے قلابے ملاتی ـــــ کف بداماں ـــــ اینٹھتی تلملاتی ـــــ زلف عنبریں کی نکہت بیز عریانیوں میں طرب انگیز ہو کر یکسر نقاب الٹ دیتی ہے ـــــ اور ـــــ میں۔ آہ ـــــ میں تیرے مرغولۂ تمنا کے بحر بیکراں کی لطیف ہواؤں میں ـــــ نظر فروزاں ہو کر حباب آسا قنوطیت کی طاغوتی بساطین الٹتا ہوا ـــــ قلب کی گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہوں ـــــ

حیرت! حیرت!!

حیرت ہے سرفروش سخن نغمہ زا ہنوز
قاتل کی جیب در دل کو چلیپہ کئے ہوئے"

بعض لوگ اس رنگ کو "خفقانیات" کہتے ہیں اور اس سے سخت بیزار ہیں۔ ان کا دل ایسا پاکیزہ ادب ڈھونڈتا ہے جس کے مطالعہ سے دماغ میں جلا آئے۔ قلب میں سرور پیدا ہو اور باتوں ہی باتوں میں انھیں ایسے پتہ کی چیزیں مل جائیں جن سے وہ خود اپنی اور اپنے لواحقین کی زندگی سدھار سکیں۔ یہی وہ طبقہ ہے جو ہر نئے اخبار اور ماہنامے کو بیتابی سے دیکھنے کا منتظر رہتا ہے کہ شاید اس میں کوئی پسندیدہ چیز نظر آ جائے اور اگر وہ اس امید میں کامیاب ہو جاتا ہے تو ایسے پرچے کی ہر ممکنہ اعانت کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے لیکن پھر بھی کچھ دن رنگ دیکھتا ہے اور مستقل خریداری سے گھبراتا ہے کہ شاید پرچہ بند ہو جائے اور اسے مفت میں خسارہ اٹھانا پڑے۔ یہی وہ طبقہ ہے جس کی مستقل سرپرستی

اور بے لوث توصیف سے غریب اور امیر سب مائل ہو جاتے ہیں ورنہ جو لوگ کہ اپنی کھال اور اپنے مال میں مست ہوں انھیں بھلا کسی پرچے کے نکلنے یا بند ہونے کی کیا فکر ہو سکتی ہے۔ آپ یورپ کے کسی بڑے سے بڑے اخبار یا رسالے کی ارتقائی تاریخ پر نظر ڈالیئے تو ہر جگہ یہی نظریہ جلوہ افروز ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ حکومت کی امداد سے بھی ابتدائی دور میں کسی پرچہ کو بہت کچھ تقویت پہنچ سکتی ہے اور جب تک اس کا زنگ جمے یہ امداد نہایت قابل قدر ثابت ہو سکتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ پرچہ وہی کامیاب سمجھا جاتا ہے جو اپنی بساط اور بل بوتہ پر مصائب کا مقابلہ کرتا ہوا مذکورہ طبقہ کا اعتبار حاصل کرلے اور پھر وہ خارجی امداد سے بے نیاز ہو کر صدیوں زندہ رہتا ہے۔

مولوی سلام اللہ صاحب اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور علی گڈھ کے پرانے گریجویٹ ہیں گھر میں کچھ زمینداری کا سلسلہ بھی ہے اور ڈھائی سو پنشن ملتی ہے گھر کا رکھ رکھاؤ نہایت سلیقہ کا ہے اور ہر چیز سے امارت ٹپکتی ہے جو ان کی بیوی کی توجہ کا نتیجہ ہے جنھوں نے اگرچہ کسی اسکول میں باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی مگر ان کے والدین کی اچھی تربیت نے ان کے دل میں کچھ ایسی نفاست پیدا کردی ہے کہ وہ اپنے گردو اطراف کی ہر شئے کو اسی رنگ میں دیکھنا چاہتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے خاوند سے لیکر نوکروں چاکروں میں بھی یہی خوبو اثر کر گئی ہے۔ ان کی بڑی لڑکی جمیلہ ماشاءاللہ جوان ہے جسے ہائی اسکول کی تعلیم دلاکر مدرسہ سے اٹھالیا ہے اور اب مولوی صاحب موصوف اپنی فرصت کے اوقات میں خود مذہبی تعلیم دیتے ہیں چنانچہ جمیلہ نے اب قرآن شریف ختم کرلیا ہے اور وہ طوطے کی طرح اسے نہیں پڑھتی بلکہ اس کے معانی پر پورا عبور رکھتی ہے۔ محمود اس کا چھوٹا بھائی ہے جو پندرہ سال کا ہے اور گزشتہ مہینے انٹرنس پاس کرچکا ہے اور اب چھٹی منا رہا ہے مگر بڑا کھلاڑی ہے۔ یہ سارا گھرانہ اخباروں اور رسائل کا بڑا شوقین ہے کئی اردو اور انگریزی پرچے ان کے ہاں آتے ہیں اور جو نیا پرچہ شائع ہوتا ہے سب سے اول انھیں کے ہاں نظر آتا ہے۔ ہمجولی بھی انکے ہاں پہنچ چکا ہے اور اس کی جدت طرازیوں نے سب کو محو حیرت کر رکھا ہے۔ اس کے پاکیزہ اور دلچسپ مضامین بڑے شوق سے پڑھے جاتے ہیں اور سب کو اچنبا ہوتا ہے کہ ایسے اچھے انشا پرداز جنگلی بچاتے کہاں سے پیدا ہو گئے۔

مولوی سلام اللہ جب کبھی کوئی چیز بست خریدنے بازار آتے ہیں تو گھر لوٹتے وقت نیوز ایجنٹ کے ہاں اپنی گاڑی ٹہرا کر ضرور پوچھ لیتے ہیں کہ بھئی تازہ ہمجولی آیا یا نہیں اور اگر جواب نفی میں ملتا ہے تو کہتے ہیں کہ

ہمارے پڑوس میں تو یہ چار پانچ روز پہلے ہی آگیا ہے پھر کیا وجہ ہے کہ ابتک یہاں نہیں آیا۔ کتب فروش کہتا ہے کہ وہ مستقل خریدار ہوں گے اور ابھی آپ کو ایک آدھ دن اور انتظار کرنا پڑے گا.......... مگر ہاں دیکھئے وہ آدمی آرہا ہے اور نئے ہمجولی کا بنڈل اس کے پاس ہے۔ بنڈل بڑی بے تابی سے کھولا جاتا ہے اور ایک بھیڑ لگ جاتی ہے۔ مولوی سلام اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ بھئی یہ پرچہ تو بڑے ٹھاٹھ کا اور عجیب و غریب ہے مگر دام بہت کڑے وصول کرتے ہو اور رسالے بھی تو ہیں ایک آنہ دو آنے یا زیادہ سے زیادہ چھ آنے۔ اتنے قیمتی پرچے کون خریدتا ہوگا۔ آپ سے شوقین ہاتھوں ہاتھ لے جاتے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ پانچوں انگلیاں ایک سی نہیں"۔ کتب فروش نے کہا۔ "نولاؤ ہمیں بھی ایک پرچہ دیدو اور فرمایا کہ اب کے مہینے سے ہم بھی مستقل خریدار ہو جائیں گے ورنہ نومبر نمبر کے لئے پھر ایک روپیہ خرچ کرنا پڑے گا سُنا ہے کہ اس میں حضرت اقدس و اعلیٰ کی بڑی لاجواب تصویر آرہی ہے پھر یہ روز کا انتظار اور آنے جانے کی مصیبت کون پیٹے۔ مگر جناب اس میں میرا کمیشن مارا جائے گا دکان دار نے کہا۔ تو بھئی تم ان لوگوں سے یہ وصول کرو جو تم سے ادھار قرض لیتے ہیں اور ہم تو یہ بخ ہی نہیں پالتے نقد معاملہ رکھتے ہیں پھر کیوں مہنگا پرچہ خریدیں اور پھر وقت پر بھی نہ ملے۔

اب مولوی صاحب خوش خوش گھر روانہ ہو جاتے ہیں اور راستے بھر سوچتے رہتے ہیں کہ بیگم اور جمیلہ نے ناک میں دم کر رکھا تھا کہ ہمجولی لاؤ ہمجولی اب اسے دیکھکر سب بشاش ہو جائیں گے مگر محمود نے ابھی تک اس کی طرف توجہ نہیں کی ہے اپنے مطلب کا نقشہ نکال کر اس میں رنگ بھر کر خراب کر دیتا ہے۔ بچہ ہے رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہو جائیگا

بنگلہ آگیا اور مولوی صاحب ہمجولی ہاتھ میں لئے ہوئے زنانہ میں داخل ہوئے۔ جمیلہ کھڑی ہوئی گھڑی میں کوک دے رہی تھی کہ باپ گھر میں داخل ہوئے انھیں دیکھ کر وہ سلیقہ سے کھڑی ہوگئی اور جھک کر سلام کیا اور آگے بڑھ کر باپ سے ہمجولی لے لیا جنھوں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے مسکرا کر اس کی ایک جھلک دکھا دی تھی۔

بیگم سلام اللہ موہنہ دھو رہی تھیں، سارے چہرے کو صابن لتھڑا ہوا تھا۔ خاوند کو میچی آنکھوں سے دیکھا اور جلدی جلدی چھپکے مار ایک قیمتی ترکی تولیہ سے ہاتھ موہنہ پونچھتے ہوئی ان کے پاس آکھڑی ہوئیں۔ خوشبو کے بھپکے اڑ رہے تھے جب وہ مولوی صاحب سے خوش خوش باتیں کر رہی تھیں آخر خاوند سے نہ رہا گیا اور پوچھ بیٹھے۔ "بیگم یہ کونسا عطر لگایا ہے اس کی عجب بھینی اور پُرکیف خوشبو ہے معلوم ہوتا ہے کہ تختہ گلاب کھل گیا ہے جس سے میری ساری کلفت دور ہوتی جارہی ہے۔" "بھول گئے!" بیگم نے ہنس کر جواب دیا" اجی یہ وہی **گولکنڈہ سوپ**

تو ہے جو آپ پرسوں لائے تھے اور کہتے تھے کہ یہ صابن ہمارے سرکار عالی کے کارخانے کا بنا ہوا ہے۔ میں اور جمیلہ کل سے استعمال کر رہے ہیں کیا بتاؤں کہ کیسا جی خوش ہوتا ہے اور اپنے حال پر افسوس ہوتا ہے کہ ہم اب تک کیوں فرانسیسی صابن استعمال کرتے رہے بھلا دیکھو تو اس صابن میں اور ان صابنوں میں کیا فرق ہے۔ مجھے بڑی حیرت ہے کہ حیدرآباد میں بھی ایسے بہتر صابن بننے لگے ہیں۔ اور اگر آپ مجھ سے کہتے تو میں تو کبھی تمیز نہ کر سکتی کہ یہ دیسی صابن ہے!"

"ہاں! ہاں!!" مولوی صاحب نے پورے وثوق سے کہا "یہ سب مسٹر **کالنز** کی توجہ کا اثر ہے جو ہمارے محکمہ صنعت و حرفت کے لائق معتمد ہیں اور دیکھو یہ انگریز کیسے بھلے مانس ہوتے ہیں کہ یہ جانتے بوجھتے ہوئے بھی ہمارے ملک کے خیر خواہ ہیں کہ اب ولایتی مال کو کوئی نہ پوچھے گا۔ ہیں **مسٹر محمدی** ناظم اور **مسٹر بشیر الدین** مہتمم کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ وہ ایسا بہتر اور سستا صابن ملک میں پیش کر رہے ہیں جو نفاست، پائداری اور خوشبو میں اپنی نظیر نہیں رکھتا.............. یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اتنے میں باہر موٹر کے رکنے کی آواز آئی اور جمیلہ کی ہمجولی مس راج کماری جارجیٹ کی بڑی وضعدار ہلکی فیروزی ساڑی پہنے ہوئے خراماں خراماں اندر آئیں جن کے ہاتھ میں ملک کے مشہور فسانہ نگار مہاشے سدرشن کا دلفریب ماہنامہ "**چندن**" اور دہلی کے مشہور "**نیرنگ**" کا خاص نمبر تھا جسے عشرت رحمانی صاحب نے ادبی تحفے کے نام سے بڑی محنت اور سلیقے سے شائع کیا ہے۔ (باقی دارد)

نوٹ:- بقیہ رسائل، کتب اور دیگر استعمالی اشیا کا ریویو بھی بروقت اسی انوکھی طرز میں آئے گا جو خاص ہمجولی کی جدت ہے۔ ہم سرکار عالی کے کارخانہ صابن سازی کے شکر گذار ہیں کہ انھوں نے مختلف صابن ہمارے ریویو کے لئے بھیجے اور ہم نے جس طریقے پر اپنا فرض ادا کیا ہے وہ اس قدر موثر اور دل نشین ہے جس کی حسب دلخواہ داد ایک ماہر نفسیات ہی دیسکتا ہے۔

ادارہ

جن بچوں نے خاکوں میں رنگ بھر کر بھیجے ہیں وہ سب وصول ہوئے ہیں آئندہ اشاعت میں تفصیل دیکھی جائے

صحن میں تپتے ہوئے فرش پر ننگے پاؤں کھڑے ہو کر نماز جمعہ ادا کرتے اور نماز سے فارغ ہونے کے بعد ہیں جلتے ہوئے پتھروں پر سر بسجود ہو کر نہایت عجز و انکساری کے ساتھ خدائے تعالیٰ سے اپنی کامیابی کی دُعا مانگتے اور اللہ میاں ہماری دُعا قبول کر لیتے اس کے بعد بھی اگر کسی کو ہمارے ایماندار ہونے میں شبہ ہو تو ہر کہ شک آرد ......

۱۹۳۱ء کے ایک گرم مہینہ کا ذکر ہے کہ امتحان قریب آگیا تھا اور ہم بھی اس کے مقابلہ کے لئے نمازی بن چکے تھے۔ سال بھر تو یہی کہتے گزار دیا کہ بس کل سے محنت شروع کر دیں گے مگر وہ کل کبھی آئی ہی نہیں۔ آخر جب امتحان سر پر آ ہی گیا تو حواس باختہ ہو گئے۔ ایک دو مضمون بھی نہیں تھے کہ کسی نہ کسی طرح رٹ رٹا کر پاس ہونے کی توقع کرتے۔ ماشاء اللہ نصاب کمیٹی کے جتنے اراکین تھے اُتنے ہی مضمون شریکِ نصاب تھے۔ جو کتاب اٹھاتے کاٹ کھانے کو دوڑتی دوست احباب کی خوشامد درآمد کرتے کہ ہماری مدد کریں مگر نفسی نفسی کا وہ عالم تھا کہ کوئی حامی نہ بھرتا۔ کلاس ٹیچر صاحب سے امداد کے طالب ہوئے کیونکہ یہ پرچے اُن ہی کے ہاتھ میں تھے تو انھوں نے بھی ٹکا سا جواب دیدیا کہ آج کل فرصت نہیں ہے اور یہ سچ بھی تھا کیونکہ جس طرح طاعون اور انفلوئنزا کے زمانے میں حکیم اور ڈاکٹروں کی بن آتی ہے اسی طرح امتحان کے زمانے میں کلاس ٹیچروں کی کمان چڑھ جاتی ہے ایسے موقعوں پر اُن کے وقت کی قیمت پندرہ روپیہ فی گھنٹہ سے کم نہیں ہوتی۔ ہم سے بھی کہا گیا کہ پندرہ روپے دے کر دوسرے ہم سبقوں کے ساتھ شریک ہو جایا کرو مگر بقول شخصے جیل کے گھونسلے میں ماس کہاں ہمارے پاس کیا دھرا تھا کہ اُستاد صاحب کو پندرہ روپے ماہانہ دیتے۔ یہاں تو دونوں وقت کا گذارا کرنا بھی مشکل تھا اور اُستاد صاحب کو کچھ ایسی غرض نہیں پڑی تھی کہ مفت میں ہمارے ساتھ مغز پاشی کرتے بالآخر جب کوئی راہ نہ سوجھی تو اللہ یاد آیا جھٹ سے نمازی ہو گئے اور حقیقت یہ ہے کہ سال بھر میں بس یہی ایک موقع آتا تھا کہ ہم خدا سے لو لگاتے تھے۔

ایک روز جمعہ کی نماز کے بعد چند دوستوں کے ساتھ ایڈورڈ پارک میں گئے شام تک کتابوں کے ساتھ دھینگا مشتی کرتے رہے وہاں سے اٹھ کر سامنے والی مسجد میں گئے اور عصر کی نماز پڑھی دیکھا کہ مولوی صاحب حسب دستور وعظ ختم کر کے بیٹھے ہیں ہم بھی ادب کے ساتھ ان کے سامنے جا بیٹھے۔ مولوی صاحب

بھی آخر زمانہ دیکھے ہوئے تھے سمجھے کہ مدرسے کے ان لونڈوں کا یہاں آنا خالی از علت نہیں۔ سنکر اکر پوچھنے لگے کہئیے جناب کیسے تشریف آوری ہوئی ہم نے عرض کیا کہ مولوی صاحب امتحان قریب آگیا ہے اور تیاری کی نہیں ہے۔ کوئی تعویذ ایسا دیجئے کہ پاس ہوجائیں یہ سنکر مولوی صاحب ہنسے اور کہنے لگے ”بھئی میں تو یہ کام کرتا نہیں البتہ کشمیری بازار میں ایک شاہ صاحب رہتے ہیں تم اُن کے پاس جاؤ وہ تمھاری مدد کریں گے“ یہ سننا تھا کہ ہم وہاں سے اٹھے اور کتابیں بغل میں دبا سیدھا کشمیری بازار کا رُخ کیا۔ دیر تک تو شاہ صاحب کی تلاش میں ٹاماک ٹوئیاں مارتے پھرے لیکن بالآخر جوئندہ یابندہ کے بمصداق پتہ چلا ہی لیا۔ ڈرتے ڈرتے اندر داخل ہوئے دیکھا کہ اوپر کی منزل پر منڈیر سے ملا ہوا ایک تخت بچھا ہے اور اُس پر ایک شاہ صاحب تشریف فرما ہیں۔ یقین ہوگیا کہ یہی ہمارے مطلوب ہیں۔ شاہ صاحب نے بھی ہم کو کنکھیوں سے دیکھا اور انجان ہو گئے۔ تھوڑی دیر تو ہم اسی انتظار میں کھڑے رہے کہ اب توجہ ہوگی مگر اس کے بجائے جب شاہ صاحب وہاں سے اٹھکر اندر چلے گئے تو ہماری سب امیدوں پر پانی پھر گیا اور ہم مایوس ہوکر واپس لوٹنے کی تیاری کرنے لگے اتنے میں اوپر سے ایک آواز آئی کہ ”تشریف لائیے شاہ صاحب یاد فرماتے ہیں“ اب تو سب کی باچھیں کھل گئیں۔

جوتے کے بند تو دروازہ کے باہر ہی سے کھول کر آئے تھے فوراً اوپر چڑھ گئے اور کمرہ میں داخل ہوئے شاہ صاحب ایک نہایت پر تکلف قالین پر تسبیح ہزار دانہ لئے یاد الٰہی میں مصروف تھے ہم کو اشارے سے بیٹھنے کا حکم دیا اور پھر گردن جھکا کر دنیا اور مافیہا سے بے خبر ہو گئے۔ جب اس عالم بے خودی میں جھکے ہوئے شاہ صاحب کو بہت دیر ہوگئی تو ہماری طبیعتوں میں انتشار شروع ہوا۔ ایسے موقع پر بولنا تو سوء ادبی میں شامل ہوتا اس لئے اشاروں ہی اشاروں میں باتیں ہونے لگیں۔ اتنے میں شاہ صاحب نے ایک دم گردن کو جنبش دی اور قہر آلود نگاہوں سے ہم گنہگاروں کی طرف دیکھا اور کڑک کر بولے۔

شاہ صاحب۔ ”روزے رکھنے کیسے ہیں؟“

ہم۔ ”بہت اچھے ہیں۔ شاہ صاحب۔ خدا کا حکم ہے“۔

شاہ صاحب ”تو پھر کیوں نہیں رکھتے؟“

ہم۔ (ہاتھ جوڑکر) ”حضت رکھتے تو ہیں“۔

شاہ صاحب۔ ”کہاں رکھے اس دفعہ پورے روزے؟“

شاہ صاحب کا یہ آخری فقرہ اس قدر جامع تھا کہ سب پر چپک گیا اور ہر ایک دل ہی دل میں شاہ صاحب کی کرامت کا قائل ہونے لگا۔ یہ سچ ہے کہ ہم نئی روشنی کے طالبعلم تھے کتابیں بغل میں دبی تھیں گرمیاں قیامت کی تھیں امتحان بھی سر پر کھڑا تھا۔ اور رمضانِ شریف کو گزرے ہوئے ابھی دس بارہ روز ہی ہوئے تھے مگر پھر بھی اس طرح دلوں کا حال معلوم کر لینا کسی معمولی آدمی کا کام نہیں تھا۔ بہرحال ہم نے ندامت سے سر جھکا لیا اور اپنے اگلے پچھلے گناہوں پر نظر ڈالنے لگے سر اٹھا کر دیکھا تو شاہ صاحب پھر مراقبہ میں جا چکے تھے ہم بھی اپنے اپنے خیالات میں غلطاں و پیچاں بیٹھے رہے۔ اس بحرِ تفکر میں غوطہ لگائے ہوئے شاہ صاحب کو زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ انھوں نے پھر گردن اٹھائی اور ہماری طرف متوجہ ہوئے مگر اس دفعہ آنکھوں سے تلطف کے آثار نمایاں تھے۔ محبت آمیز لہجہ میں فرمانے لگے۔

شاہ صاحب۔ بیٹا امتحان میں کامیابی و ناکامی سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ہم فقیر کیا کر سکتے ہیں؟

ہم ۔ آپ کی دُعا ہمارے حق میں رحمت ہو سکتی ہے۔

شاہ صاحب۔ اللہ فضل کرے گا۔

تھوڑی دیر کے لئے شاہ صاحب نے پھر اپنے ضمیر کو ٹٹولا اور اس طرح سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

شاہ صاحب۔ (ایک طرف مخاطب ہو کر) جا تیری تو فتح ہے اللہ نے تجھ پر فضل کیا۔

(دوسری طرف) تیرا معاملہ ذرا مذبذب ہے اللہ ہی مدد کرنے والا ہے۔

(ہماری طرف) ارے تیرے لئے دُعا کی ضرورت ہے۔

ہم ۔ تو شاہ صاحب اس خادم کے لئے دُعا فرمائیے نا۔

شاہ صاحب۔ اللہ فضل کرنے والا ہے اچھا کل آیو ایک کورے آبخورے میں چار لڈو اور سوا روپیہ لیتا آیو تعویذ لکھ کر دوں گا۔ مشک و زعفران سے لکھا جائے گا۔

اس کے بعد ہم وہاں سے رخصت ہوئے باہر آکر تبادلۂ خیالات کیا۔ شاہ صاحب کی کرامات کا سکہ ہر ایک کے دل پر جما ہوا تھا اور اُن کے روشن ضمیر اور خدا رسیدہ ہونے میں کسی کو بھی شک نہ تھا۔

دوسرے روز حسبِ ارشاد ہم لڈو لے کر وہاں گئے۔ اجازت پا کر کمرے میں داخل ہوئے۔ دیکھا کہ شاہ صاحب حسبِ عادت گردن جھکائے ذکرِ الٰہی میں محو ہیں۔ ہم خاموشی کے ساتھ دو زانو ہو کر بیٹھ گئے

اور شاہ صاحب کی توجہ کا انتظار کرنے لگے ہی انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے کہ شاہ صاحب نے یک بیک اس زور سے ایک نعرہ لگایا کہ سب چونک پڑے۔ شاہ صاحب پر جو نظر پڑی تو وہ سرتا پا جلالی نظر آئے چہرہ لال تھا۔ آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے اور منہ سے جھاگ اڑ رہے تھے یہ حالت دیکھکر ہم سہم گئے مگر شاہ صاحب اُسی جذبہ کی حالت میں ایک آں چند الفاظ دہرائے گئے یعنی (ہاتھ سے چاروں طرف اشارہ کرکے) "شش جہت قیصر۔ غضب۔ چڑھ آیا" گو یہ الفاظ بظاہر بے معنی معلوم ہوں مگر ہمارا ذہن فوراً جرمنی افواج کی طرف منتقل ہوگیا کیوں کہ اُس وقت جرمنی کے نام سے بڑے بڑے سورما بھی کانپ رہے تھے۔ تھوڑی دیر تک شاہ صاحب پر بھی کیفیت طاری رہی اس کے بعد طبیعت میں ذرا سکون ہوا۔ آنکھیں بند کرکے دیوار کے سہارے بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد آنکھیں کھولیں۔ ہم کو دم لاسا دیا۔ کچھ پند و نصائح کئے کہ بیٹا فقیروں کی باتوں میں کبھی دخل نہ دینا۔ اُن کو سمجھنا تمھاری عقل سے بعید ہے وہ جو کہیں اُس کو سچ سمجھنا۔ پھر کچھ پڑھ کر لڈوں پر دم کرکے اس میں سے ذرا ذرا سا ہم کو چکھایا باقی لڈو رکھ لئے اور تعویذ لکھکر ہمارے حوالے کیا۔

تعویذ کا ملنا تھا کہ ہم کو یقین ہوگیا کہ اب تو ضرور کامیاب ہو جائیں بلکہ اگر فیل بھی ہوتے ہونگے تو اس تعویذ کی برکت اور شاہ صاحب کی دعا کے اثر سے پاس ہو جائیں گے۔ اگر امتحان میں پانچ نمبر بھی ملیں گے تو مکھی کی ذیلی پیدا وار سے وہ پچاس بن جائیں گے۔ یہ خیال آنا تھا کہ بس اللہ پہ توکل کر بیٹھے یعنے محنت میں کمی ہوگئی اور تفریح میں اضافہ مگر دوسرے تیسرے روز جاکر شاہ صاحب کی دعائیں ضرور حاصل کر لیتے تھے۔

ایک روز حسب معمول شاہ صاحب کے پاس گئے۔ شاہ صاحب اِدھر اُدھر کی باتیں پوچھتے رہے اور ہم اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے رہے۔ جب رخصت ہونے کے لئے اجازت چاہی تو شاہ صاحب نے ہم میں سے ایک سے پوچھا۔

شاہ صاحب۔ ارے تیرا مکان کہاں ہے؟

وہ۔ جی۔ بلاقی بیگم کے کوچہ میں۔

شاہ صاحب۔ وہاں پان کی ڈھولیاں ملتی ہیں نا۔

وہ۔ جی ہاں ملتی ہیں۔

شاہ صاحب۔ اچھا کل دو ڈھولیاں لیتے آئیو۔

وہ۔ بہت خوب۔

چنانچہ ہمارے دوست نے اُسی روز شام کو

جاکر ڈھولیاں خریدیں۔ رات کو بیٹھکر ایک ایک پان دھویا اور دوسرے روز لیجاکر شاہ صاحب کے کی نذر کیا اس کے چند روز بعد ہم سے فرمائش ہوئی کہ ایک چھتری لیتا آئیو یہ سنکر ہم چکر میں پڑ گئے کہ یہ کیا مصیبت آئی۔ نماز بخشوانے گئے تھے روزے گلے پڑ گئے۔ باز آئے ہم ایسے تعویذ سے۔ ہمت کر کے پوچھنا چاہتے ہی تھے کہ قیمت اب عنایت کیجیگا یا بعد میں کہ شاہ صاحب تاڑ گئے کہ یہ گلنے والے آسامی نہیں۔ بگڑ کر بولے "ارے تو نہیں لاسکتا۔ تیرا دل بہت چھوٹا ہے نہ لائیو" ہم نے دل میں سوچا کہ چلو جان بچی لاکھوں پائے۔ گو خدانخواستہ شاہ صاحب ہمارے محتاج نہ تھے ہم جیسے دس کو خرید کر چھوڑ دیتے کئی ہزار کی مالیت کی تو ایک کوٹھی ہی بنوائی تھی مگر معلوم نہیں ان باتوں کی وجہ سے ہماری عقیدت میں ذرا کمی محسوس ہونے لگی مگر پھر بھی ہم نے ہمیشہ ظن المومنین خیرا سے کام لیا اور دل کو یہی کہہ کر سمجھاتے رہے کہ اللہ اپنے نیک بندوں کو چھپّر پھاڑ کر دیتا ہے۔

خیر صاحب یوں ہی تھوڑا زمانہ گزر گیا ایکدن نتیجہ شائع ہوا لیکن ہمارے رنج والم کی کوئی انتہا نہ رہی جب ہم کو یہ معلوم ہوا کہ اس سال ہم فیل ہو گئے۔ عقل کہتی تھی کہ یہ محنت نہ کرنے کا نتیجہ ہے مگر جوشِ عقیدت کہتا تھا کہ نہیں یہ چھتری کا غصہ ہے۔

بچپن اور بچّے

حضرت نکہت شاہجہانپوری بی۔ اے (آنرز)

کیا ہی دلکش ہے تبسّم ان کا! کیا ہی پر لطف ترنّم ان کا!
اللہ اللہ یہ تکلّم ان کا! موجِ عشرت سے تصادم ان کا!

غمِ دوشیں نہ غمِ فردا ہے!
ہائے بچپن کا زمانہ کیا ہے!

زیب و زینت ہیں یہ محفل کیلئے شمع ہیں زیست کی منزل کیلئے
حوصلہ طے مراحل کیلئے جانِ امید ہر اک دل کیلئے

ہائے بچپن کا زمانہ کیا ہے!
غمِ دوشیں نہ غمِ فردا ہے!

غمِ انساں کے بھلانے والے! رنج و افکار ہٹانے والے!
صید ایک عالم کو بنانے والے! دل کی دنیا کو بسانے والے!

ہائے بچپن کا زمانہ کیا ہے!
غمِ دوشیں نہ غمِ فردا ہے!

رونقِ عالمِ ایجاد ہیں یہہ مظہرِ حسنِ خداداد ہیں یہہ
خوش اللہ کہ دلشاد ہیں یہہ بارک اللہ کہ آزاد ہیں یہہ

ہائے بچپن کا زمانہ کیا ہے!
غمِ دوشیں نہ غمِ فردا ہے!

معنیٔ علم و سیاست ہیں یہی مرکزِ مذہب و ملت ہیں یہی
حاصلِ خرمن و دولت ہیں یہی یعنی سرچشمۂ عظمت ہیں یہی

ہائے بچپن کا زمانہ کیا ہے!
غمِ دوشیں نہ غمِ فردا ہے!

مادرِ ہند کے یہ طفلِ سعید ملک کو ان سے ہے کیا کچھ امید
زندگی ان کی ہے پیغامِ نوید ہو نہ کیوں دورِ کہن کی تجدید

ہائے بچپن کا زمانہ کیا ہے!
غمِ دوشیں نہ غمِ فردا ہے!

چشمِ بد دور یہ بچپن یہ شعور اور معصومیت و عالمِ نور
فیضِ فطرت سے رہیں یہ معمور یعنی آزاد ہمیشہ مسرور

اللہ اللہ یہ زمانہ کیا ہے!
غمِ دوشیں نہ غمِ فردا ہے!

نازِ عالم کے اٹھانا ہے انھیں اپنی ہستی کو مٹانا ہے انھیں
زیست کو زیست بنانا ہے انھیں رہ کے دلشاد دکھانا ہے انھیں

ہائے بچپن یہ زمانہ کیا ہے!
غمِ دوشیں نہ غمِ فردا ہے!

ڈوبا ہوا روپیہ

از جناب حبیب احمد صاحب صدیقی بی۔ اے (علیگ)

ابراہیم سے میری بہت پرانی دوستی ہے مگر وہ اب تک میرے ایک روپیہ کا قرضدار ہے۔ یہ قرضہ ایک سال سے واجب الادا ہے جس کے وصول ہونے کی اب کوئی امید نظر نہیں آتی۔ میں جب کبھی اس سے ملتا ہوں محسوس کرتا ہوں کہ وہ شاید اس حقیر رقم کو بھول گیا۔ مگر مجھ سے وہ اسی خلوص اور محبت سے ملتا ہے جیسے پہلے ملتا تھا۔ میرا قرضہ اس کے ذہن سے اتر گیا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ اب اس کے ملنے کی کوئی توقع نہیں۔ برخلاف اس کے میری حالت یہ ہے کہ مجھے عمر بھر یاد رہے گا کہ ابراہیم میرے ایک روپیہ کا قرضدار ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس سے میری دوستی خلوص اور محبت میں کوئی فرق پیدا نہ ہوگا لیکن میں کیا کروں یہ بات بھلائے نہیں بھولتی کہ ابراہیم میرے ایک روپیہ کا قرضدار ہے۔ دوسروں کی حالت تو مجھے معلوم نہیں لیکن اپنی نسبت میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی شخص مجھ سے ایک روپیہ قرض لے اور میں اُسے بھولنا چاہوں تو مرتے دم تک نہیں بھول سکوں گا۔ ابراہیم نے مجھ سے یہ قرض ۱۰؍ آذر ۱۳۲۹ف کو لیا تھا۔ (تاریخ اس وجہ سے لکھ رہا ہوں کہ شاید کبھی ابراہیم کی نظر پڑے اور اسے یاد آجائے) جب کہ وہ پانڈی چری جا رہا تھا میں اسے اسٹیشن پہونچانے گیا تھا وہ میرے بعد اسٹیشن پہنچا موٹر کا کرایہ دینے کے لئے اس نے بٹوہ نکالا جس میں دو روپیہ اور باقی نوٹ تھے تکمیل کرایہ میں

ایک روپیہ کی کمی تھی۔ میں سامنے کھڑا تھا اس نے مجھ سے روپیہ مانگا میں نے دے دیا اُس میں کوئی تصنع یا بناوٹ یا بدنیتی مضمر نہ تھی کیونکہ یہ ایک امر فطرتی ہے۔ میں نے روپیہ دیتے وقت تک محسوس نہیں کیا کہ کیا ہوا۔ اس نے مجھ سے صرف اسقدر کہا کہ حبیب ایک روپیہ دینا میں نے کہا لو اور دیدیا۔ مجھے یقین تھا اور میں جانتا تھا کہ ابراہیم کی نیت روپیہ واپس کردینے کی ہے۔ اس نے مجھے راستہ سے خط لکھا۔ خیال ہوا کہ شاید اس میں روپیہ کی ادائی کا کچھ ذکر ہوگا، مگر نہیں۔ اس میں لکھا تھا کہ اس جگہ ایک سو ایک (۱۰۱) درجہ گرمی ہے۔ ایک لمحہ کے لئے اس ہندسہ نے مجھے چکر میں ڈالدیا۔ ایک ماہ بعد ابراہیم واپس آگیا میں اسے اسٹیشن لینے گیا روپیہ وصول کرنے کی خاطر نہیں بلکہ واقعی ابراہیم سے مجھے انس ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ جب وہ ایک ماہ بعد سفر سے واپس آرہا ہے اگر اسٹیشن پر میں اسکا منتظر رہوں اور اس کا خیر مقدم کروں تو اسے ضرور خوشی ہوگی۔ میں نے کہا چلو موٹر ٹیکسی پر گھر چلیں ابراہیم نے کہا نہیں پیدل چلو۔ ہم پیدل ہی گھر آئے بہت رات گئے تک اس سے پانڈی چری کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی مگر میرے ذہن میں روپیہ چکر لگا رہا تھا اور میں نے عمداً اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔ میں کیا کوئی بھی ایسا نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے پوچھا کہ پانڈی چری میں کونسا سکہ رائج ہے اور ہمارے روپیہ اور وہاں کے روپیہ میں کتنا تفاوت ہے۔ لفظ ہمارے روپیہ پر میں نے زور بھی دیا اور صرف زور دیکر ہی رہ گیا مگر اس سے کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ مجھے یہ محسوس کرنے کے لئے کئی دن لگے کہ ابراہیم کو میرے روپیہ کا خیال نہیں رہا۔ حالانکہ میں اس سے تقریباً روزانہ ملتا تھا ایک دن میں نے اس سے پوچھا کہ تمھارے سفر میں کل کتنا روپیہ خرچ ہوا۔ اس نے جواب دیا کہ معلوم نہیں کیوں کہ میں کوئی حساب نہیں رکھتا۔ پھر چند دن بعد میں نے پوچھا کہ اب تو سفر کے بعد مستقل طور سے مقیم ہوگئے ہوگے؟ جواب دیا کہ سفر کو تو میں بالکل ہی بھول گیا۔ مجھے معلوم ہوگیا کہ یہ اب روپیہ کو بھی بھولا اب اس کے ملنے کی کوئی امید باقی نہیں۔ آخرش میں نے اسے بھی ان لوگوں کی فہرست میں لکھ لیا جنھوں نے مجھ سے قرض لیا اور ادا کرنا بھول گئے' یا ادا نہ کرسکے ان حضرات کی تعداد ماشاءاللہ کافی ہے میں ان لوگوں سے بھی ہنسی خندہ پیشانی اور کشادہ دلی سے ملتا ہوں اور آرزو کرتا ہوں کہ ان کو دی ہوئی رقموں کو بھی بھول جاؤں۔ ابراہیم سے تقریباً روزانہ شام کو ملاقات ہوتی ہے۔ ابھی پرسوں ہی بھائی فرید کی

دعوت میں ملاقات ہوئی ۔ ابراہیم ایک کرسی پر بیٹھا متاآن وغیرہ سے نواب اتفاق یار جنگ کے قرضے کی بابت بحث کر رہا تھا ۔ اس نے کہا " یہ نواب صاحب اگرچہ بظاہر دکن کے نہایت ذی اقتدار اور متمول امراء میں سے ہیں لیکن استقدر مقروض ہیں کہ ان کا سارا کا سارا اسٹیٹ ساہوکاروں کے قبضے میں چلا گیا ہے اور اب یہ بیچارے ایک ایک روپے کو ترستے ہیں ......" "ایک ایک روپے کو ترستے ہیں ؟" میں نے قطع کلام کرتے ہوئے اور زور دیتے ہوئے کہا اور منتظر رہا کہ اس " ایک ایک روپے " کی تکرار سے شاید میرے ایک روپے کی طرف ابراہیم کا ذہن منتقل ہو جائے مگر نہیں اسے میرے قرضے کا احساس ہی باقی نہیں تھا ۔ مجھے دفعتاً یہ بیچین کر دینے والا خیال پیدا ہوا کہ جس طرح ابراہیم نے مجھ سے ایک روپیہ لیا اور فراموش کر دیا اسی طرح ممکن ہے کہ میں نے بھی کسی سے کچھ لیا ہو اور خلاف توقع ادا کرنا بھول گیا ہوں تو کوئی تعجب نہیں ۔ جتنا میں اس مسئلہ کو سوچتا ہوں اتنا ہی ناپسند کرتا ہوں کیوں کہ جب میں نے لیا اور ادا کرنا بھول گیا تو اس دنیا میں اس کی ادائی کی صورت نظر نہیں آتی اگر ایسے حضرات موجود ہیں جن سے میں نے روپیہ لیا ہو اور ادا کرنا بھول گیا ہوں تو براہِ کرم وہ حضرات مجھے مطلع فرمائیں مگر شرط یہ ہے کہ سب حضرات ایک دم مطالبہ نہ فرمائیں بلکہ ایک ایک کرکے اور اگر ممکن ہو تو سلسلہ وار مطالبہ فرمائیں میں سب کا نام کاغذ پر بھی لکھ لوں گا ۔ مگر میں اُن حضرات کا شمار نہ کروں گا جنھوں نے کبھی دفتر آتے جاتے لوکل کے ٹکٹ کیلئے چار چھ آنے قرض دئے ہوں یا فٹبال کھیلنے کے بعد شربت کے گلاس کی قیمت نقد دی ہو کیونکہ موسم گرما میں فٹبال کھیلنے کے بعد شربت پینے کے لئے اگر کوئی دوست آٹھ بارہ آنے قرض دے بھی تو وہ محسوس کرے گا کہ پینے والے کو واقعی ضرورت تھی اور اگر اس نے شربت پلایا تو اسے خوشی ہوگی کہ اس کے پیسے چیز ہوئے لیکن اگر کسی شخص نے مجھے پانڈی چیری جاتے وقت (خواہ کبھی میں وہاں گیا نہ ہوں اور نہ جانے کا قصد رکھوں) ٹیکسی کے لئے ایک روپیہ قرض دیا ہو تو بیشک اس رقم کو میں فوراً بلا پس و پیش ادا کر دینا چاہتا ہوں ' نہ صرف یہ بلکہ میں اس کی عام تلقین کرنا چاہتا ہوں کہ فوری ضرورت اور مجبوری کے وقت جو روپے یا پیسے قرض لئے جائیں وہ ایمانداری سے ادا کر دئے جائیں ۔ یہ بات ہمارے ذہن نشین رہنی چاہئے کہ اب تک جتنی اُولوالعزم اور ترقی یافتہ

اقوام گذری ہیں ان کی کامیابی کا راز صرف یہ ایمانداری ہی تھی اور اگر ہماری قوم ترقی کر سکتی ہے تو ایسی ہی ایمانداری سے۔ آخر میں میری استدعا ہے کہ براہ کرم کوئی صاحب اس مضمون کو پڑھکر بے احتیاطی سے کسی ایسی جگہ نہ ڈال دیں جہاں دفتر آبرسانی والے محمد ابراہیم صاحب رضوی کی نظر پڑ جائے۔ فقط

عروسِ نو

از حضرت ساغر نظامی (علیگ)

آنکھ کے پردوں میں عورت کے ہی اک دلہن نہاں
روحِ عورت اس کی ہستی سے بنی ہے گلستاں

اس کے چہرے کے پسینے سے بہی ہیں خوشبوئیں
ہے رواں پھولوں کی اک کشتی حنا کی نہر میں

اک طرف بیٹھی ہے وہ سمٹی ہوئی سکڑی ہوئی
گدگدی کرتی ہے اس کو چھیڑتی ہے زندگی

وہ "عروسِ نو" مگر شرمندہ ہے روپوش ہے
اس کے ہونٹوں پر تبسم ہے مگر خاموش ہے

نام اس دلہن کا عصمت ہی حیا ہی شرم ہے
یہ گلابی پتیوں سے بھی زیادہ نرم ہے

دل پہ اس کی حکمرانی آنکھ پر اس کا ہے راج
اس کے ہاتھوں میں ہے عفت کا سنہری رنگ تاج

جنّت کا نمونہ

از جناب حکیم محمد یوسف صاحب نیّر (بیرٹ)

ذیل کا دلچسپ اور سبق آموز فسانہ ہمارے مکرم حکیم محمد یوسف صاحب نیّر نے اپنے عزیز دوست ڈاکٹر محمد عثمان خان صاحب نفضا کی صاحبزادی کی تقریب شادی پر اس لئے قلم بند فرمایا تھا کہ اسے "ہمجولی" میں طبع کرا کے اس کی ایک کاپی بوقت رخصتی دلہن کے جہیز میں شریک کیجا سکے۔ چنانچہ اسی ضرورت کے مدنظر اب اُسے شایع کیا جارہا ہے اُمید ہے کہ اس سے نہ صرف عزیزہ موصوف فائدہ حاصل کریں گی بلکہ اُن نئی دلہنوں کے لئے بھی یہ ایک مفید دستور العمل ثابت ہوگا جو سسرال کی فضا میں پہنچکر اپنی نئی دنیا بسانے کی فکر میں مختلف مشوروں کی خواستگار رہتی ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر اس "نسخۂ کیمیا" پر پوری طرح عمل کیا گیا تو ایک خوشحال گھرانے کی طرح ڈالنے میں کامیابی ضرور اُن کا ساتھ دے گی' انشاء اللہ

"ہمجولی"

باصرہ :- "بہن کچھ سنا ہمجولی سسرال پہنچی اور تھوڑے ہی دنوں میں گھر تو گھر سب گھر والوں کے دلوں پر بھی قبضہ کر لیا۔"

سامعہ :- "آپ نے کس سے سنا وہ تو گڑیاں کھیلتی میکے سے رخصت ہوئی تھی ہر ایک کا خیال تھا کہ الھڑ اور بہت کم سن ہے نباہ کیونکر ہوگا۔"

باصرہ :- "کہنے کی بات تو یہی ہے کہ ساری عمر کے نباہ کیلئے اس نے ایسی پگڈنڈی نکال لی جس میں کچھ ایر پھیر پڑ ہی نہیں سکتا بہن ناظرہ کل وہیں سے آئی ہیں وہ بھی تو ہمجولی کی خالہ ساس ہیں انھیں کی زبانی میں نے حالات سنے۔"

سامعہ :- "ہاں وہ تو خود بھی بڑی مبصر اور نیک ہیں ان کے بیان کے سند ہونے میں کیا کلام ہے تو پھر کیا کیا ذکر مذکور رہا"

باصرہ :- "انھیں کی زبان سے اس تذکرے کے سننے کا مزا ہے نام آتے ہی منہ سے تعریفیں اور

روئیں روئیں سے دعائیں نکلتی ہیں۔"
سامعہ :- "نیکی تو ہجو لی کی گھٹی میں ہی پڑی تھی ماں باپ بھی تو کیسے نیک ہیں۔"
باصرہ :- "بہن ناظرہ نے بیان کیا کہ ہجو لی سسرال پہنچی دو ایک دن تو گھر کا رنگ دیکھتی رہی پہلی بات جو سوچنے کی قابل تھی یہ تھی کہ اللہ رکھے ساس گھر کی مالکہ اور پھر کئی بچوں کی ماں موجود ہے شوہر کی حقیقی ماں نہیں لیکن ایسی سوتیلی ماں نے شوہر کو اپنے پیٹ کے بچوں سے زیادہ آنکھ کا تارہ بنا کر پالا ہے پہلے ایسی ساس کا دل مٹھی میں لینا چاہیئے۔"
سامعہ :- "یہ تو سننے کی قابل باتیں ہیں تو ہجو لی نے سسرال میں پہنچتے ہی کیا طریقہ اختیار کیا۔"
باصرہ :- "دیکھا کہ ساس کچھ بیمار بھی ہے اور اس کے کمزور کندھے گھر کا بوجھ بار سنبھالنے میں امداد کے محتاج ہیں اس لئے دل میں ٹھان لی کہ پہلے انہیں کی خدمت سے عظمت کا تاج سر پر رکھنا چاہیئے۔"
سامعہ :- "تو کیا دو چار دن کی دلہن نے ہی گھر سنبھالنے کا منصوبہ سوچ لیا؟"
باصرہ :- "سوچنا کیسا عمل کر کے دکھایا ساس کو دیکھا کام کاج کرتی ہیں مگر طبیعت کسمسا کر نڈھال ہو جاتی ہے اور رات کو تھک کر مردوں کی طرح پڑ جاتی ہیں ہجو لی نے بیجا شرم کی اوڑھنی کو اتار کر رکھ دیا اور ساس سے ادب کے ساتھ عرض کیا کہ میں آنکھوں دیکھتے آپکی یہ تکلیف نہیں دیکھ سکتی آپ اگر حکم دیں تو کچھ ہاتھ بٹانے میں سہارا دیتی ہوں۔"
سامعہ :- "تمہید تو بڑی سلیقہ کی تھی۔"
باصرہ :- "اس خیال سے کہ کہیں ساس برا نہ مان جائیں اور دل میں یہ وہم نہ آئے کہ ابھی سے گھر کی حکومت کو دو بالشت کی بچی اپنے قبضہ میں لینا چاہتی ہے۔"
سامعہ :- "تو پھر ساس نے کیا جواب دیا۔"
باصرہ :- "ساس بھی سمجھدار تھی بیان کا سلیقہ دیکھکر جواب دیا کہ ماشاءاللہ سے ابھی تمہارے دن کھیلنے کھانے اور آرام پانے کے ہیں میں بیماریوں سے اگر چور نہ ہوتی تو پلنگ سے تمہارا قدم اتارنے کی بھی روادار نہ ہوتی پھر بھی کسی نہ کسی طرح گھر کے انتظام کی مشین چل ہی رہی ہے تم نے تو محبت سے میری تکلیف کا احساس کیا لیکن یہ دنیا والیاں کیا کہیں گی آخر تو سوتیلی ساس تھی بہو کے گھر آنے کا انتظار ہی تھا آتے ہی گھر کی چکی میں کولھو کے بیل کی طرح جوت دیا۔"
سامعہ :- دنیا کی ریت کے خوف نے بھی جان جھکندن میں پھنسا رکھی ہے پہلا خیال جو دل میں آتا

ہے وہ یہ یہی کہیں ناک نہ کٹ جائے ۔"

باصرہ :۔ جب قوام ہی بگڑ جائے تو کیا کیا جائے ہم لوگوں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہی ذرا ذراسی بات ہیں نکو ہمجولی کی ساس نے بھی یہی خیال کیا کہ جہاں آوے کا آوا بگڑا ہوا ہو وہاں دنیا کو سرگوشیوں کا موقع کیوں دیا جائے ۔

سامعہ :۔ "بیشک" تو اس بیان کی خوبی کا نقش ہمجولی کی ساس کے دل پر اچھا پڑا ۔"

باصرہ :۔ "کیوں نہ پڑتا جو بات دل سے نکلتی ہے دلوں میں اتر جاتی ہے ساس پہلے تو اسی بات پر مرید ہو گئی اگلے دن سے ہمجولی نے گھر کے کاموں میں چپ چاپ حصہ لینا شروع کر دیا ۔"

سامعہ :۔ "کس طرح ۔"

باصرہ :۔ "بہن ناظرہ کا بیان ہے ہونہار لڑکی نے پہلے تو ساس ہی کے کمرے کو ٹھیک ٹھاک کرنے کی ٹھان لی اندر سے دروازے بند کر تمام در اور دیوار دروازے اور کھڑکیاں جھاڑ جھوڑ کر آئینہ بنا دئے ، تصویروں اور نقشوں کو موقع محل سے ٹانگ کر تمام سامان سلیقہ سے جما دیا اور حمام میں جا کر نہانے دھونے کے بعد صاف ستھرے کپڑے پہن چاند سی دلہن بنکر آ بیٹھی ۔"

سامعہ :۔ ساس اگر دیکھ لیتیں تو شاید میلا کچیلا کام کرنے سے روکتیں ۔"

باصرہ :۔ "روکتیں بھی تو ہمجولی سمجھا لیتی مگر اس نے اس کا بھی موقع نہیں دیا جب دیکھا وہ باورچیخانہ کے کام میں لگ گئی ہیں وہ اس طرف مصروف ہو گئی ۔"

سامعہ :۔ "تو وہ بڑی خوش ہوتی ہوں گی ۔"

باصرہ :۔ خوش کیا معنی باچھیں کھل گئی ہوں گی دل میں سمجھا ہوگا کہ مالکہ سے ابھی تو گھر کی ملکہ بن رہی ہوں ۔ ہمجولی ابھی حمام میں تھی کسی کام کو اپنے کمرہ میں قدم رکھا تو دیکھا کہ کمرے کا زمین اور آسمان ہی بدل گیا ایک بہار کا عالم ہے ۔ دلہن کو حمام سے نکلتے دیکھ کر بلاؤں پر بلائیں لیں اور ندامت کی آنکھ اٹھا کر معذرت کی کہ مجھے خبر ہی نہ تھی نگوڑا کمرا کب سے گرد آلود پڑا تھا تم اٹ گئی ہو گی ہمجولی نے ادب سے جواب دیا اماں جان میرے فرض کی یہ پہلی منزل ہے ۔"

سامعہ :۔ خدا تعالیٰ سب کو ایسی بچیاں نصیب کرے کہ سسرال جا کر یوں ماں باپ کا نام اُجالیں اور ان کی تربیت کو چار چاند لگائیں پھر کیا ہوا ۔"

باصرہ :۔ چند ہی روز میں گھر کیا تھا ایک جنت کا نمونہ صفائی ستھرائی نفاست اور پاکیزگی گھر کے در و دیوار سے چھننے لگی جس نے آکر دیکھا حیرت کی تصویر بن کر

رہ گیا اور ہجولی کی قابلیت کے چرچے گھر گھر ہونے لگے۔"

سامعہ :۔ "ساس ہی تنہا کیا سارے گھر بھر کے دلوں پر ان باتوں کا اثر پڑا ہوگا۔"

باصرہ :۔ ہجولی کے خسر تو بہت نیک انسان تھے اور ان کا انتخاب اس رشتہ کے متعلق اول ہی امید افزا تھا لیکن جب انھوں نے اپنی تمنا کے پھولوں کو اس طرح مہکتے دیکھا تو دل باغ باغ تھا اور بیوی سے بہو کی تعریفیں سنکر پھولے نہیں سماتے تھے۔ اب آگے سنو کہ ہجولی نے اپنی عزت کے گلدستوں کو کس کس طرح سجایا دوسرا کام یہ تھا کہ باورچیخانہ میں ساس کا دم گھٹتا دیکھ کر یہ بوجھ بھی اپنے سر لے لیا اور ایک دن ساس کو سر کے درد کا شکوہ کرتے سنا تو کہنے لگی اماں جان آپ مجھے حکم دیجئے کہ ماما اصیلوں سے باورچیخانہ کا کام میں لے لیا کروں آپ کے آرام سے گزارنے کے دن ہیں خدمت کی سعادت اگر ابھی نصیب نہ ہوئی تو وہ پھر کونسا زمانہ آئے گا۔ ساس کو ان باتوں سے جو خوشی حاصل ہوسکتی ہے اس کا اندازہ خود ہی کرلو۔"

سامعہ :۔ "اندازہ کیا قوم میں ایسی لڑکیاں پیدا ہوں تو میکے اور سسرال دونوں کی ناموری اور خوش قسمتی ہے۔"

باصرہ :۔ گھر کا گورکھ دھندا سدھارنا تو کچھ ایسی بڑی بات نہ تھی باورچیخانہ کا کام اس وجہ سے ٹیڑھی کھیر تھی کہ ماماؤں کو جم کر رہنے کی عادت بہت کم ہوا کرتی ہے نت نیا سابقہ بد مذاق آئیں نگا چوکی اور کھانا بے نمک ہو گیا یا آٹا پڑ گیا کہ منہ کڑوے ہو جائیں ان سب باتوں کی اصلاح میں ہجولی کو سچ پوچھو تو بڑی دردسری اٹھانی کی مصیبتوں سے ہشت مشت ہونا پڑا آخر جیت اسی کی رہی اور ایک ماما کو اپنی شیریں بیانی سے ایسا موہ لیا کہ مرکر ہی اس گھر سے نکلنے کا وعدہ کر چکی ہے۔"

سامعہ :۔ "محبت اور اخلاق بھی عجیب چیز ہے بیگانے بھی اپنے ہو جاتے ہیں۔"

باصرہ :۔ "یہی ایک میٹھی زبان تو تھی جس نے چندہی روز میں ہجولی کے تذکروں کو حلاوت بخشی ہمسائے اور پڑوس والیاں تک کاموں میں ہاتھ بٹانے لگیں اور اپنی لڑکیوں کو بھیجکر قاعدہ، قرآن شریف مسئلہ مسائل پڑھنے پڑھانے میں شکرگزاریوں کے لئے تیار ہوگئیں۔ لیکن انھیں دنوں ہیضہ کی وبا پھوٹ پڑی اور پڑوسنوں سے جو انتظام میں مدد ملنے کا راستہ نکل آیا تھا اس کے ابتر ہونے کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔"

سامعہ :۔ "ایسے ہڑ کے دنوں میں یہ شیرازہ کیا باقی رہتا۔"

باصرہ :۔ "بہن ناظرہ کہتی ہیں قابلیت کی سچی تصویر کا آئینہ تو یہی وقت تھا ہجولی نے اس نازک زمانہ میں ایسے

جو اس بچار کھے کہ باید و شاید گھر کی صفائی کا انتظام
موریوں اور پاخانے وغیرہ میں دوائیں ڈلوا کر ستھرا رکھنے
کا بندوبست کھانے ہلکے اور اچھے پکانے کی تدبیریں
اور پھر سب سے زیادہ جوش دئے ہوئے پانی استعمال کرنے
کرانے پر توجہ ان تمام باتوں نے محلہ والیوں کو بھی ریس
کرنے پر مائل کر دیا خربوزے کو دیکھکر خربوزہ رنگ پکڑتا
ہے اچھی ہو یا بری صحبت اثر کرے اور ضرور کرے ۔
ہجولی نے تو کچھ ایسا منتر پھونکا تھا کہ اس کا گن گانے والیاں
محلہ میں فیصدی ننانوے تو ضرور ہونگی ۔

سامعہ :۔ "تو ہیضہ کے زمانہ میں بھی ہجولی نے ہمت
نہ ہاری ؟"

باصرہ :۔ "اس کا کیا سوال اس کی ہمت تو ان
دنوں کچھ بڑھ گئی ڈاکٹروں اور طبیبوں کے گھرانے کی لڑکی
تھی دوائیں بھی ادھر ادھر سے منگا کر جمع کر لی تھیں ان
دواؤں کے وقت پر دینے دلانے سے تو ہجولی کو انسانیت
کی دیوی کا خطاب مل گیا ۔

سامعہ :۔ کہاں موجودہ زمانہ اور کہاں یہ ہمدردیاں
مجھے تو اچنبا ہے ہجولی کیسی نیک نہاد نکلی بڑا اثر اس کی تربیت
کا بھی ہے "

باصرہ :۔ خدائے تعالے نے جب اس موذی مرض
کا منہ کالا کیا اور وہ رفع دفع ہو گیا تو ہجولی کی ساس کو
مبارکباد دینے کے لئے شاید ہی کوئی محلہ میں رہی ہو جو نہ
آئی ہو ساس بھی ایسی نیک مزاج تھی کہ خوشی سے گلاب کے
پھول کی طرح شگفتہ ہو رہی تھی اور اس کے دماغ میں
یہ تصور بھی نہ تھا کہ "سوتیلی بہو ہے"

سامعہ :۔ "سگی بہوؤں میں کیا سرخاب کے پر لگ
جاتے ہیں وہ اگر بد مزاج ہوں تو زندگی دوبھر کر دیتی ہیں
گھمنڈ یہ ہوتا ہے کہ ہم کو غیر کون کہہ سکتا ہے پھر شوہر تا محرم
کے تصور کی لاج کہاں ۔

باصرہ :۔ "تھوڑے ہی زمانہ میں وہ بہت سے
دل تھے جو ہجولی کے ہاتھ میں تھے لیکن ابھی گھر میں اور بھی
ناگزیر اصلاحوں کی ضرورت تھی جو اس نے کیں اور فاتحانہ
طور پر یہی گھر میں چھوٹے بڑے کئی بچے "اپنی قدر وا اپنی قدر
وا اپنی قدر" پھر دیورانی کا نازک رشتہ اس پر بچوں کو شائستہ
بنانے اور تہذیب کے سایہ میں بڑھانے چڑھانے کا شوق
یہ ہجولی کے ایسے ولولے تھے جن کا پتہ دل کی گہرائیوں
کے سوا کہیں نہیں ملسکا لیکن عمل نے بتا دیا کہ اس کی آرزو
ایک خوش آئند زمانہ کی لَو میں لگی ہوئی ہے"۔

سامعہ :۔ "وہ عمل کیا تھا"

باصرہ :۔ "اس نے بچوں کو تھوڑے ہی زمانہ
میں ایسے ڈھرے پر لگایا کہ سب اسی کا کلمہ پڑھنے لگے
گھر کے دھندوں سے فرصت پائی اور بچوں کو کہیں

چٹکلے بیان کرکے خوش کیا، کہیں پہیلیاں بجھوائیں، کبھی گنتی یاد کرائی، اور رات کو کہانیاں کہکر ان کے دل بھلائے یہاں تک کے بچے جب دیکھیے بھاوج کے بغیر بے چین ہیں۔"

سامعہ:۔ "بچے تو پیار اور محبت ہی کے ہوتے ہیں بھوجی نے فطرت کے حرف حرف پر خوب غور کیا۔"

باصرہ:۔ "ان باتوں سے بھوجی کو بھی تو ایک خاصی مدد ملنے لگی بچے بھی ہونہار تھے جو کام ان کے بس کے ہوتے ہاتھ بٹانے کے لئے ہر قدم پر آگے بڑھتے گھر کا حساب کتاب دھوبیوں کے کپڑوں کی گنتی؛ اور مدرسہ کی فیس وغیرہ سب چیزیں روزانہ ایک کاپی میں لکھی جاتیں یوں کہئے کہ ساس کو صحیح معنوں میں راست خوشدامن کے لفظ کی تفسیر معلوم ہوئی تھی۔"

سامعہ:۔ "یہ باتیں سُن کو جی باغ باغ ہوا جاتا ہے یوں تو میکے میں بھی وہ نیکی کا پتلا سمجھی گئی مگر کس کو یقین تھا کہ سسرال میں ایسے گُن گائے جائیں گے۔ اور اخلاق کی مہک اتنی جلد پھیل جائے گی۔"

باصرہ:۔ "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات ذہانت اور اخلاق کی چمک تو اس کے ستارہ پیشانی کی پرچھائیوں میں موجود تھی لیکن غور کے قابل یہ بات ہے کہ اس نے پتا مار کر نئی دنیا کو تسخیر کیا ہوگا عزیزوں کے دلوں کو ہاتھ میں لے لینا گڑیوں کا کھیل نہیں ہے ایک دے ہی کا سلسلہ دلوں میں ایسی گتھیاں ڈال دیتا ہے کہ سلجھانے والے الجھ بیٹھتے ہیں پھر بھی نہیں سلجھتا۔"

سامعہ:۔ "کیا بھوجی کو ان کانٹوں میں سے بھی گھسنا پڑا؟"

باصرہ:۔ "وہ بیچاری کچھ انوکھی یا نرالی دلہن نہ تھی اس میں شبہ نہیں کہ بادرچیخانہ کا انتظام اور گھر بھر کے کام سنبھالکر باہمہ اور بے ہمہ بن گئی تھی محلہ والیاں بھی دلہن کو آکر پوچھتیں تو کسی ایک طرف مصروفیتوں کے پردے میں جا ٹٹولتیں۔ سسرالی عزیزوں اور رشتہ داروں کے لڑکے ہمیشہ کے گھر میں آنے جانے والے تھے جب بھی کون آیا اور کون گیا تک کی خبر نہ ہوتی تاہم یہ چرچے ہوتے ضرور تھے کہ بھابی تو مزدورنی کی طرح مصروف ہی رہتی ہیں کبھی ان کو چین سے بیٹھے نہ دیکھا۔"

سامعہ:۔ "کیا ساس نے بھی کبھی نہ سمجھایا کہ کس کس سے پردہ کرنا چاہئے اور کن کن کے سامنے آنے میں مضائقہ نہیں"

باصرہ:۔ اس میں شک نہیں فرض تو ساس ہی کا ہونا چاہئے کہ بہوؤں کو مشورہ دیں نئی دلہنیں معذور ہوتی ہیں احتیاط برتنے میں یہ مشکل پڑتی ہے کہ بعض رشتہ دار شکوہ شکایت کی زبانوں کے چوکے لگانے کو تیار ہو بیٹھے ہیں "وہم سے اور پردہ" اور احتیاط کا دامن ہاتھ میں نہ لیا جائے تو ذرا سی چوک میں بے حیائی اور بے شرمی

کے الزامات تھوپ دئے جاتے ہیں۔"

سامعہ :- "پردہ تو عورت کی فطرت میں اس طرح داخل ہے جس طرح شہد میں مٹھاس شاید ہی کسی کی سرشت اس کے خلاف ہو لیکن بہت سی جکڑ بندیاں ایسی بھی لگا دی جاتی ہیں جن سے تلخیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔"

باصرہ :- "سچ تو یہی ہے کہ ایک طرف تو ذرا گھونگٹ ہوا کے جھونکوں سے سرک گیا اور پردہ چیتھڑ میں آگیا اور دوسری طرف ہڑدنگیاں بنکر بھی جھکڑوں میں اڑاتی پھریں اور تہذیب تمدن کا آسرا ل گیا اسی افراط و تفریط نے خیالات میں قیامت برپا کر رکھی ہے اسلامی پردے کی حدود معین کر دی جائیں تو فتنے ہی کیوں اٹھیں خیر ہمجولی کو شاباش کہئے جس نے اس منزل کو بھی ہنستے کھیلتے طے کر لیا اور کام کاج کی مصروفیت کا ایسا نقاب ڈالا کہ نئی دلہن کے متعلق آنے جانے والوں کو سوال ہی پیدا نہ ہو سکا۔ آخر ساس اس معمے کو سمجھ گئی کہ ہمجولی کا ایک سو ہو کر رہنا بے معنی نہیں ہے۔ اور ایک دن باتوں باتوں میں یہ گر سمجھا دیا کہ کن سے کتنا پردہ کیا جائے۔"

سامعہ :- "اچھا ہوا یوں پوچھ گچھ کا راستہ تو ساس بہو میں کھل گیا۔"

باصرہ :- ہمجولی کے مزاج میں یہ بڑا جوہر تھا کہ خود رائی اور خود ستائی کا موقع ہی آنے نہ دیتی ساس کو گھر کی مالکہ سمجھتی اور حکم کے خلاف ایک قدم نہ بڑھتی۔ اسی انداز نے تو موہ لیا تھا۔"

سامعہ :- "بے شک نیکی اور بدی کا احساس اور بھلائی برائی کی پہچان انسان کی فطرت میں موجود ہے اس فطری جذبے نے ساس کو کیا سب ہی کو متاثر کر دیا ہوگا کہ ہمجولی کیا ہے سب کے لئے ایک مجسمۂ خیر و برکت اور سراسر نیکی۔ پھر بھلا گھر کی دیوی کیوں نہ بنتی۔"

باصرہ :- "وہ مجسم نیکی اور دیوی کہلانے کی اہل ہی اور بھی بہت سی باتیں تھیں وہ ایک خدا کو مانتی تھی اور واحد و یکتا جانکر اسی کے آگے سر جھکاتی تھی خدائے واحد کے سچے نبی کے حکموں پر چلنا بندگی کا شیوہ سمجھتی تھی اور سچے نبی کے دوستوں اور فرمانبرداروں کی اطاعت کا فرض اپنے لئے طوق غلامی تصور کرتی تھی ان باتوں پر بعض سہیلیاں اس پر "بڑی مولون" کی پھبتی بھی کہہ جاتی تھیں لیکن ہمجولی نے سسرال میں قدم رکھنے کے بعد بھی نماز اور ارکان اسلام سے منہ نہ موڑا اور ایسی فراست سے کام لیا کہ گھر کا بچہ بچہ اس کی ریس کرنے لگا۔ یا یوں کہئے کہ ہمجولی کے نقش قدم پر چلنا سب کے لئے ایک محبت کی کشش سمجھی گئی اور ایسے ہیر پھیروں سے یہ ظاہر ہونے لگا کہ یہ گھر سچے مسلمانوں کا گھر ہے۔"

بچّے والدین کا

کیوں مذاق اڑاتے ہیں؟

ترجمہ : از مسٹر ظفر قریشی بی۔ اے دہلوی

ضروری اطلاع :۔ ہجولی کے لئے زیادہ تر اسی نوعیت کے مضامین اور تراجم کی سخت ضرورت ہے امید ہے قلمی معاونین اس کا ضرور لحاظ فرمائیں گے (مدیرہ)

کوئی شادی شدہ جوڑا نہ ہو گا جس نے بچوں کے ہاتھوں دوچار بے حد پُر لطف چرکے نہ کھائے ہوں۔ بعض بچے تو بالطبع بہت شریر اور نڈر ہوتے ہیں اور وہ کسی طرح اپنے والدین کا مذاق اڑائے بغیر نہیں رہتے۔ بعض معصومیت کی آڑ میں وہ وہ کام کر جاتے ہیں کہ بزرگ ہونٹ چباتے رہ جاتے ہیں!

ان تجربات سے گھریلو زندگی میں ہم روزانہ دوچار ہوتے ہیں اس لئے مندرجہ ذیل مضمون خاص دلچسپی کی نظر سے پڑھا جائے گا۔

انگلستان کے ایک مشہور ڈاکٹر سی، ڈبلیو کمنس Dr. C. W. Kimmins ایک شہرۂ آفاق ماہر نفسیات ہیں انہوں نے بچوں کی تربیت کے لئے ایک مدرسہ بھی قائم کیا ہوا ہے۔ خود ذاتی تجربہ بہت وسیع ہو چکا ہے اور کہا جاتا ہے کہ وہ اس وقت دنیا میں "نفسیات اطفال" (چائیلڈ سائیکولوجی) کے سب سے بڑے ماہر ہیں۔

انھوں نے حال ہی میں انگلستان کے ایک موقر رسالہ میں اس بحث پر اظہار رائے کیا ہے کہ "بچّے اپنے والدین کا مذاق کیوں اڑاتے ہیں"؟

اس سوال کے متعدد جوابات دئے جا سکتے ہیں مگر ڈاکٹر صاحب کی نظر میں ایک تشریح یہ ہو سکتی ہے جو سمجھا جاتا ہے کہ بہت درست ہے :۔

"بچّے" کئی پہلوؤں سے ہماری نسبت زیادہ چالاک ہوتے ہیں کیونکہ ہم عادات و رسوم کے پابند ہوتے ہیں اور بچوں کا زندگی کی نتہائے نظر بہت ہی

وسیع ہوتا ہے وہ محدود دماغ کے مالک نہیں ہوتے اس لئے ہر چیز کو وسعت نظر سے دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں"۔

ذیل میں اس طویل مضمون کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے :۔

"بچے" اپنے بزرگوں اور والدین کا کیوں مذاق اڑاتے ہیں اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ ہم ان کی ذہنیتوں سے کماحقہ واقف نہیں ہوتے اور ان کے منشائے دلی کی تہ تک پہنچنے میں قاصر رہتے ہیں۔ اور ان کے معصومانہ انداز خیال کی پوری پوری داد نہیں دے سکتے۔ والدین کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلینی چاہئے کہ ابتدائے عمر میں بچے ایک ایسی فردوس خیال میں زندگی بسر کرتے ہیں جہاں اس دنیا کے افکار و حوادث کا کوئی ناگوار اثر اور نقش ان کے ذہنوں پر نہیں ہوتا اس لئے ان کا زاویۂ نگاہ بہت وسیع اور معصومانہ ہوتا ہے۔ یہ اس قدر لطیف و باریک نقوش ہوتے ہیں کہ ہم ان کے ساتھ ناروا سلوک کرکے ان کی روح کی بالیدگی اور فوقیت دماغی کو کند کردیں گے پس میں ان لوگوں کو جو بچوں کے والدین ہیں یا بننے والے ہیں مشورہ دوں گا کہ وہ بچوں کے ساتھ ہمیشہ ہمدردانہ پہلو اختیار کیا کریں۔

ان کی ذہنیتیں پہچاننے کی کوشش کریں اور اگر وہ کچھ گستاخی بھی کر بیٹھیں تو انھیں نرمی کے ساتھ بلکہ باتوں باتوں میں صحیح بات بتادیں ورنہ وہ جان رکھیں کہ بچے ان کا مضحکہ اڑانا جانتے ہیں! وہ خبردار رہیں"۔

"میں کہتا ہوں ہماری نسبت بچے بہت زیادہ چالاک، چست طبیعت اور حاضر دماغ ہوتے ہیں کیونکہ ان کا زاویۂ نگاہ تنگ نہیں ہوتا وہ زندگی کو ایک "بازیچہ تفریح" سمجھتے ہیں "مصیبت" اور "رنج" ان کی لغت میں نہیں پائے جاتے۔ وہ اپنی نیند سوتے ہیں اور اپنی نیند اٹھتے ہیں"!

"ہم یعنی بزرگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری عقلیں بڑی ہیں۔ ہمارا تجربہ وسیع ہے۔ ہماری سمجھ قابل قدر ہے یہ "بچے" ہیں کچھ نہیں سمجھتے، گر میں خیال کرتا ہوں یہی ساری خرابی کی جڑ ہے ہمیں نفسیات اطفال کا گہرا مطالعہ کرنے کے لئے اس خیال کو یکسر بدلنا پڑے گا کہ ہم بچوں سے زیادہ سمجھدار ہیں! —— ہم اگر سمجھدار ہیں تو وہ ہم سے کئی سو گنا زیادہ حاضر دماغ ہیں! اس لئے دانشمند والدین کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ احتیاط سے کام لیں!

"پیدائش کا پہلا سال بچہ کی ماں کے لئے جس قدر صبر آزما ہوتا ہے وہ اچھی طرح معلوم ہے۔ بچہ کو

اپنے جسم کی حفاظت کا کچھ خیال نہیں ہوتا۔ ماں دن رات اسی کا خیال رکھتی ہے۔ اس کی صحت وتندرستی ماں کی ساری توجہات کو منعطف رکھتی ہے اور وہ جس محنت وتندہی سے کام لیتی ہے قابل داد ہے!

اگر اس ہی صورت سے مائیں اپنے بچوں کے دماغوں کی تربیت کا بھی خیال رکھیں تو کیسی اچھی بات ہو۔ جسمانی صحت کے لحاظ کے ساتھ ساتھ ماں کو غور کرنا چاہئے کہ بچوں کا ذہن کن کن چیزوں کی طرف راغب نظر آتا ہے۔ وہ کس رنگ سے رغبت کرتا ہے کس ذائقہ کو پسند کرتا ہے کس قسم کی آوازیں اس کے چہرہ پر تغیر اور حرکت پیدا کرتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس مطالعہ سے ماں سال بھر بعد کچھ اندازہ لگانے کے قابل ہوجائے گی کہ اس کے بچہ کا رجحان طبع کس طرف ہے اور وہ کس صورت سے ترقی پا سکتا ہے"؟

اگر ہم بچوں کی ذہنیتوں کا اس قدر قریبی مطالعہ کریں گے تو یقین ہے کہ وہ ہمارا اس قدر مضحکہ اڑانے کی کوشش نہ کریں گے"۔

ایک بچہ کے متعلق روایت ہے کہ اس نے اپنے باپ سے پوچھا "ابا! بزرگ کسے کہتے ہیں"؟

باپ نے جواب دیا "بیٹا! بزرگ؟۔۔۔۔۔ ہاں دیکھو۔ جیسے میں تمہارا باپ ہوں تو میں تمہارا بزرگ ہوں۔ میرا باپ میرا بزرگ تھا اور تمہارا بھی تمہارے دادا یا میرے باپ کے باپ ہم سب کے بزرگ تھے انہیں "آبا و اجداد" اسی وجہ سے کہتے ہیں! سمجھے بیٹا!

چنانچہ مشہور ہے کہ بچہ نے انتہائی سادگی کے ساتھ کہا "تو ابا! جب یہ ہی بات ہے تو لوگ اپنے باپ دادا کے نام گنوا کر شیخیاں کیوں مارتے ہیں"؟

اس ہی سلسلہ کا ایک اور مشہور واقعہ میری آنکھوں کے سامنے گزرا تھا۔

ایک عورت اپنے کمسن لڑکے کے ہمراہ چڑیا گھر میں سیر کر رہی تھی۔ جب یہ کئی جانور دیکھ چکے تو بن مانس (گورلا) کے پنجرے کے قریب آئے۔

گورلا سلاخوں کے پیچھے ایک درخت کی شاخ پر بیٹھا تھا۔ یہ درخت خاص طور پر اس ہی کے لئے لگوایا گیا تھا۔ کیونکہ بن مانس بغیر درخت پر بیٹھے نچلا نہیں بیٹھ سکتا۔

ماں اور بچہ کئی منٹ تک بن مانس کی عجیب وغریب حرکتیں دیکھتے رہے۔ کبھی وہ منہ چڑاتا تھا کبھی "خوہ، خوہ" کرتا تھا اور کبھی منہ کھول کر بھاپ نکالتا تھا۔ غرض اس نظارہ نے بچہ کے معصوم دماغ پر بہت محظوظ کن اثر کیا اور اس نے انتہائی سادگی

کے ساتھ ماں کی طرف منہ اٹھا کر اور بن مانس
کی طرف اپنی ننھی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"امی جان! اس جانور کا منہ بالکل ہمارے ابا
کے منہ کی طرح ہے نہ"؟
چپ! ——— شریر کہیں کا! ——— تمہیں
ایسی بات منہ سے نہیں نکالنی چاہیئے"!
بچّہ کی حاضر دماغی دیکھیئے۔
مگر امی جان حرج کیا ہے؟ ——— گوریلا انگریزی
تھوڑا ہی جانتا ہے؟
نہیں سمجھنا چاہئے کہ چونکہ مذاق اڑاتے
بچے ہیں اس لئے وہ اپنے بزرگوں کے ساتھ
ہمدردانہ پہلو اختیار کرنا نہیں چاہتے یا وہ انھیں
پسند نہیں کرتے۔ بلکہ یہ کہ وہ اس قدر معصوم الذہن
ہوتے ہیں کہ وہ اپنے جملوں کی اہمیت کا کچھ احساس
نہیں کر سکتے! بلکہ اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بچہ
اور اس کے بزرگ کے درمیان اچھے تعلقات ہیں
اور وہ ایک دوسرے سے اس قدر مانوس ہیں اور
محبت کرتے ہیں کہ بچّہ کو اس قدر کھل کر بات کرنے
کی جسارت ہو سکتی ہے!

بچوں کی ذہنیتوں کا جن لوگوں نے مطالعہ
کیا وہ خوب جانتے ہیں کہ کوئی بچہ اپنے باپ کا دوسرے
کے ہاتھوں مذاق نہیں اڑوائے گا اور نہ کسی صورت
سے اس کی کم حیثیتی ہونے دے گا بلکہ کوشش کرے گا کہ
اس کا باپ جس قدر بھی باوقار ثابت کیا جاسکے
دوسروں پر اس کا اظہار کر دے گویا وہ اپنے باپ کو
بادشاہ نہیں تو کم از کم وزیر اعظم تو ضرور ہی سمجھتا ہے
اس سلسلہ میں ایک واقعہ یاد آجاتا ہے جو یہاں
درج کرتا ہوں۔[1]

"میرے اسکول میں دو لڑکے اپنے اپنے باپ کی
بڑائی میں مصروف تھے، ایک دوسرے سے شکست
کھانے کے لئے مطلق تیار نہ تھا۔ آمدنی، قوت جسمانی
حالت وغیرہ کے جب موازنے ہو چکے تو ایک صاحبزادے
نے جو اتفاق سے ایک ڈاکٹر کے فرزند تھے کہا "میرے
باپ ایک اچھے ڈاکٹر ہیں ——— بہت ہی ہوشیار،
اس وجہ سے میں مفت میں بیمار ہو سکتا ہوں"۔

I can be ill for nothing.

دوسرے جھگڑالو صاحبزادے جو ایک پادری صاحب
کی اولاد تھے فرمانے لگے "میرے والد بھی بہت بڑے

[1] افسوس ہے کہ میں انگریزی کے ان جملوں کو اردو میں اس شان کے ساتھ منتقل نہیں کر سکتا کیونکہ ہماری زبان ایسے ترشے ہوئے جملے
پیش کرنے سے قاصر ہے جو لوگ انگریزی سمجھتے ہیں وہ اس کا حظ بخوبی اٹھائیں گے۔ (ظفر قریشی)

یادری ہیں اس لئے میں بھی مفت میں نیک بن سکتا ہوں" - I can be good for nothing.

"بیوقوف ظاہر ہونا"

بچوں میں ایک یہ عادت بھی ہوتی ہے کہ وہ بعض اوقات اپنے آپ کو کم سمجھ بیوقوف اور کودن ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس رمز میں جتنے عواقب پوشیدہ ہوتے ہیں وہ یا تو کوئی بچہ ہی سمجھ سکتا ہے یا وہ جنھوں نے بچوں کو خوب سمجھا ہے۔

اپنے آپ کو بیوقوف ظاہر کرنا بچوں کے ذاتی مصالح کے لئے بعض اوقات بہت ہی مفید ثابت ہوتا ہے عام ماں باپ بچوں کے ان رموز سے واقف نہیں ہوسکتے۔

ایک بچہ کو عادت تھی کہ وہ کبھی کبھی کان پر ہاتھ رکھ کر "کیا؟ کیا؟" کہا کرتا تھا گویا اس نے سنا ہی نہیں ہے۔

ماں کو فکر لاحق ہوئی کہ شاید بچہ بہرا ہے اور اس وجہ سے وہ میری بات نہیں سن سکتا۔ چنانچہ وہ ایک مشہور کان کے ماہر ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔

ماں کو اکیلے کمرہ میں چھوڑ کر ڈاکٹر بچہ کو ایک کمرہ میں لے گیا۔ اور ایک چاکلیٹ کی ٹکیہ کے ساتھ اس نے بچے کو گھٹنوں پر بٹھا کر پوچھا۔

"کیوں بیٹا! تم بہرے ہو؟ تمھاری اماں جب تمھیں کسی کام کے لئے بلاتی ہیں تو تم کو سنائی نہیں دیتا؟ کیا تم میری بات سن رہے ہو"؟

پہلے تو بچہ کئی سکنڈ تک چاکلیٹ چوستا رہا ڈاکٹر سمجھا کہ اس کا نظریہ غلط ہے اور اس نے چوک کھائی۔ مگر نہیں۔

بچہ نے چاکلیٹ نگلنے کے بعد کہا "کبھی کبھی جب میرا دل نہیں چاہتا تو میں بہرا بنا رہتا ہوں یہ میرا اختیاری فعل ہے! امی سمجھتی ہیں میں نے سنا نہیں۔ میں کام سے بچ جاتا ہوں تم بھی ایسا ہی کرو بڑا مزا آتا ہے"!

پس اس ہی طرح بچے اپنے آپ کو بیوقوف ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں گویا ان کے منھ میں زبان ہی نہیں اور وہ انتہا درجہ کا غریب اور بھولا بچہ ہے مگر نہیں "وہ واشنگٹن ارون" کی طرح شریر ہے! (وہ بھی بچپن میں بہت شریر تھا اور پہلا جھوٹ اس نے اسوقت بولا تھا جب پیدائش کے تین ہفتے بعد اسے ماں کی موجودگی کی ضرورت ہوئی تو اس نے چیخنا شروع کر دیا گویا فراک کی سیفٹی پن اس کے سینے میں چبھ رہی تھی؟) اور اس کی بیوقوفی

محض اس لئے ہے کہ وہ شرارت پر پردہ ڈال دے
اور سرزنش سے بچ جائے!

انگریزی سوسائٹی میں قاعدہ ہے کہ جب کوئی
عازم سفر ہوتا ہے تو دوست اور اعزا و اقارب
اس کی صحت کا جام تجویز کرتے ہیں اور پیتے ہیں۔
دعوت کھاتے ہیں اور اسے خوش و خرم رخصت
کرتے ہیں۔

ایک بچہ کا باپ باہر جا رہا تھا۔ اس نے دیکھا
کہ باپ کی رخصت پر لوگ جام صحت پی رہے تھے
اور طرح طرح کے پھل اور مٹھائیاں اس کے نام پر
معنون کرکے کھا رہے تھے۔

چنانچہ جب وہ اور اس کی ماں اسٹیشن سے
ان صاحب کو رخصت کرکے واپس آرہے تھے۔ بچہ
نے ایک شیرینی فروش کی دوکان کے سامنے کھڑے
ہوکر کھڑکی کی طرف اشارہ کیا اور ماں کا سایہ گھسیٹ کر
اس جانب بڑھانے لگا۔

"امی جان، میں نے ڈیڈی کا جام صحت ابھی
تک نہیں پیا۔ یہاں سے کچھ چاکلیٹ کے ڈبے کچھ
مربے اور ــــــ"

"بس بس، بیٹا! بدہضمی ہو جائے گی"! ماں نے
اپنے چار برس کے بچے کی تمام بالیدگی روح کو فنا
کرتے ہوئے اسے روک دیا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ ماں کو مٹھائی دلوا دینی چاہئے
تھی بلکہ یہ ضرور کہوں گا کہ اسے بہلانے کا یہ کوئی دوستانہ
طریقہ نہ تھا اور نہ یہ ہمدردانہ ہی کہا جا سکتا ہے!

نیچے ایک اور واقعہ درج کرتا ہوں جو ایک بچہ
ہی نے مجھے سنایا بھی ہے۔ اس سے بڑی حد تک
ظاہر ہوتا ہے کہ ایک لڑکا کیونکر اپنے باپ کا مذاق
اڑانا چاہتا تھا۔

"میں اپنے والد کے ہمراہ گھر جا رہا تھا۔ ٹرام میں
لوگ بہت تھے اس لئے بعض لوگوں کو کھڑے ہوکر
سفر کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ کئی آدمی کھڑے ہوئے تھے
گاڑی میں کئی معزز و معزز خواتین بھی تھیں۔ ان کے
ساتھ ایک کم عمر لڑکا بھی تھا۔ معلوم ہوتا تھا اسے
آداب مجلس سکھانے اور تمیز داری کے اصول سکھانے
کا کام کسی محنتی اتالیق نے سرانجام دیا تھا۔ اور اسے
ضرورت سے زیادہ با اخلاق بنا دیا تھا۔

وہ ایک عورت کو کھڑے ہوئے دیکھ کر بہت
بےچین ہوا اور جلد اپنی نشست پر سے اٹھا اور ایک
خاتون سے کہا "مس! آپ یہاں تشریف رکھئے کیا
مذائقہ ہے؟"

ٹرام کے سب لوگ اس ننھے لڑکے کی تمیز داری

اور خوش اخلاقی سے بہت خوش ہوئے۔ باپ جو اس تربیت کا ذمہ دار تھا دل ہی دل میں اپنے لڑکے کے اس خلیقانہ طرزِ عمل سے بہت خوش ہوا اور اسے چمکار کر اپنے گھٹنوں پر بٹھالیا اور اس کی کمر ٹھونکی۔

ٹرام میں اب بھی جگہ نہ تھی بہت سے آدمی اب تک کھڑے ہوئے سفر کر رہے تھے۔

یکایک ٹرام اسٹیشن پر ٹھیری اور ایک نوجوان لڑکی داخل ہوئی۔ ٹرام میں مطلق گنجائش نہ تھی۔ خلیق لڑکے نے یا تو کچھ اپنی عادت کے موافق اور یا باپ کا مذاق اڑانے کے لئے کہا "مس! آپ میری نشست لے سکتی ہیں"! یہ کہہ کر وہ گھٹنوں پر سے اٹھا اور مس کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

ٹرام کئی سکنڈ تک قہقہوں سے گونجتی رہی۔ ہر ایک بچّہ کی خلیقانہ عادت کا معترف تھا!

باپ نے اپنی پریشانی اور خفت مٹانے کے لئے لڑکے کے کان مروڑے اور وہ مبہوت ہو کر باپ کی طرف دیکھنے لگا۔

غرض ان مثالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بچے اپنے والدین کا مذاق اڑائے بغیر نہیں رہتے۔ اس لئے ہمیں صحیح مسلک اختیار کرنا چاہئے اور وہ یہ ہے کہ ہمیشہ بچوں سے دوستانہ اور ہمدردانہ سلوک کریں اور انھیں اتنی سرزنش نہ کریں کہ روح کی بالیدگی اور امنگ دب جائے۔

تذکرۂ جمیل

(اردو شاعرات کا تذکرہ)

میں نے اردو شاعرات کا تذکرہ مرتب کیا ہے جس کی ادب اردو میں بہت سخت ضرورت تھی چنانچہ چندہ اولین شاعرہ سے لیکر ۱۸۹۹ء تک کل شاعرات کا تذکرہ جمع کر لیا گیا ہے اور کتابت ہو رہی ہے اب میں ناظرات سے بصد ادب درخواست کرتا ہوں کہ وہ دورِ حاضرہ کی شاعرات (سنہ ۱۹۰۰ء سے ۱۹۳۱ء) کے حالات و نمونہ شاعری سے مجھے سرفراز فرمائیں تاکہ یہ تذکرہ کسی حد تک مکمل ہو سکے کتاب کی اشاعت کی عجلت ہے تو یہی امید ہے کہ ۵ اکتوبر ۱۹۳۱ء تک مجھکو شاعرات اپنے حالات اور اپنے نمونہ کلام سے مطلع فرمائینگی۔

قادری محمد مشیر احمد علوی ناظر۔ بی۔ اے (علیگ) مذلست وائس پریسیڈنٹ۔ انجمن معیار الادب اور نیشنل پبلشنگ ہاؤس ع ۳۰ امین آباد پارک لکھنو

تاروں بھری رات

آدھی رات اپنی نصف مسافت طے کر چکی ہے۔ چاند دلفریب چاندنی میں اپنی رعنائیاں دکھلا رہا ہے چمن میں پھول کھل رہے ہیں غنچے چٹک رہے ہیں نسیم کی آغوش میں ڈالیاں جھولے لے رہی ہیں۔

دنیا خاموش ہے ہر شخص لیلائے شب کے آغوش میں میٹھی نیند کے مزے لے رہا ہے اس آدھی رات کے سناٹے میں اس پرسکون منظر میں ایک دریا کے کنارے چمن میں بیٹھی انکا وہ معطر اور روح افزا تحفہ جس کی ایک ایک بوند سے جنت کے پھولوں کی بو آ رہی ہے اپنے پریشان بالوں میں بسا رہی تھی۔ او آسمان محبت کے چاند او میرے دل کی دنیا کے مالک! میری زلفیں ہمیشہ تیرے پیارے تحفہ کی رہین منت ہونگی۔

او میری عمر کے ساتھ میری زلفوں کی درازی چاہنے والے! تو نے تحفہ میں روغن گلبہار عرف بہار گیسو نہیں بھیجا بلکہ بالوں کو چمکدار اور دراز کرنے والا نسخہ، جڑوں کو مضبوط کرنیوالا ڈاکٹر، دماغی کمزوریوں میں تقویت بخشنے والا مسیحا بھیجا ہے

مگر پیاری میری رفیق سہیلیاں میری شفیق ہمجولیاں اس دکان کا پتہ پوچھتی ہیں جہاں تم اپنے باغ عشق کے محبت کے پھول کی فرمائش پوری کرتے ہو کیا یہ روغن گلبہار عرف بہار گیسو رجسٹر شدہ سرکار عالی آصفیہ نمبر ۱۲ قیمت عہ گلبہار کمپنی کا ساختہ ہے جس کی شہرت بہت ہے اور جس کے مالک **معصوم علی** ولد نور محمد ہیں جو افضلگنج کی مسجد کے نیچے ہے جہاں عمدہ روغنیات کے عطریات کا خزانہ بھی ہے جنکا اصول ایک ہی دام اور ایک ہی بات ہے۔

ترتیب :- سیّدہ بیگم خویشگی

فتح میدان حیدرآباد دکن

جلد ۱ | دے سنہ ۱۳۴۱ف م نومبر سنہ ۱۹۳۱ع | نمبر ۵

اطلاع

آثار قدیمہ کے جو بلاک اس نمبر میں استعمال کئے گئے ہیں وہ محترم مولوی غلام یزدانی صاحب ایم اے ناظم سررشتہ آثار قدیمہ کے عطا کردہ ہیں جس کیلئے ہم انکے ممنون ہیں۔ مسٹر قریشی بی اے کے مجوزہ ٹائپ کا مطبوعہ نمونہ وصول ہوا جسپر اگلے پرچے میں تنقید کیجائیگی۔ زنگ آمیزی کا خاکہ وغیرہ اور متعدد اشتہارات قلت گنجائش کے سبب مجبوراً اب کے ملتوی کر دینے پڑے جس کا ادارہ ہذا کو افسوس ہے انشاء اللہ آئندہ اس کی تلافی کردیجائیگی

تاج پریس میں چھپکر دفتر رسالہ ہمجولی سے شائع ہوا

کھل گئے ہیں آج دو سہرے کے پھول

سالگرہ ہمایونی کا جشن مبارک رعایا و برایائے آصفی کے قلوب میں یوں تو ہر سال انبساط عید کی سی لہریں دوڑا دیا کرتا ہے لیکن اس عید میں ربِّ یگانہ نے اور دوگونہ عیدوں کی مسرت کا اضافہ فرما کر ہماری مسرتوں کو سہ گونہ اس طرح بنا دیا ہے کہ خانوادۂ آصفی کے گوہر شاہوار یعنی حضرت ولی عہد "شہزادہ اعظم جاہ" کے سلک ازدواج میں سابق خلیفۃ المسلمین و سلطان عبد المجید افندی کی صاحبزادی "شہزادی درشاہوار" اور شاہزادہ معظم جاہ" کے عقد میں "شہزادی نیلوفر" لائی جا رہی ہیں۔

اس مبارک و مسعود موقع پر جس نے مملکت آصفیہ کے طول و عرض میں ایک موج ابتہاج پیدا کر دی ہے "مجالس" بھی اپنے شاہ ذیجاہ اور ملکۂ دکن کی بارگاہ میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوا

دعا کرتا ہے

کہ آلِ صدیقؓ اور آلِ عثمانؓ کے دو نہایت عالی قدر اور قدیم شاہی خانوادوں کا یہ رابطہ عظمیٰ ہم سب کے لئے نیک فال اور عالم اسلام کیلئے گراں قدر حبل المتین ثابت ہو۔ آمین

ہمجولی

گزشتہ اشاعت میں دکھایا گیا تھا کہ مولوی سلام اللہ صاحب نے ہمجولی خریدا اور اسے خوش خوش گھر لاکر جمیلہ کو دیا جو گھڑی کو کب سے دیکھ رہی تھی۔ بیگم سلام اللہ گولکنڈہ صابن سے منہ دھو رہی تھیں جس کی خوشبو سے متاثر ہو کر مولوی صاحب اسکی تعریف کر ہی رہے تھے کہ باہر ایک موٹر کے رکنے کی آواز آئی اور مس راج کماری چندن لاہور اور نیرنگ دہلی لئے ہوئے گھر میں آئیں

راجکماری

کے گھر میں داخل ہوتے ہی مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی سب خوش خوش ان سے ملے بیگم سلام اللہ نے فوراً گلے لگایا چٹ چٹ بلائیں لیں اور جمیلہ اپنی ہمجولی کو دیکھ کر باغ باغ ہو گئی۔ غرض ایک گرم جوش استقبال کے بعد سب ایک گول میز کے اطراف بیٹھ گئے جس پر چاء کا سامان چُنا جا رہا تھا۔ مولوی صاحب نے پوچھا:—

"کہو بیٹی راج کماری کلکتہ سے کب واپس آئیں۔ ابا جان بھی آئے یا ابھی سیر سپاٹوں ہی میں مصروف ہیں؟"

"جی ہم سب کل صبح ہی آئے ہیں۔ ابا جان کا مزاج راستے کی تکان کی وجہ سے نصیب دشمناں کچھ ناساز ہو گیا تھا کل دوپہر کو تو بخار بہت تیز رہا مگر رات کے آٹھ بجے تک بالکل اتر گیا تھا اور آج تو ان کی طبیعت بالکل صاف ہے بلکہ صبح تو تھوڑی دیر کے لئے جاگیر کے ضروری کاروبار کے لئے وہ باہر بھی تشریف لے گئے تھے۔ جب میں گھر سے چلی ہوں تو آرام کر رہے تھے مگر آپ سب کی خیریت انھوں نے دریافت کی ہے اور کہا ہے کہ آپ سے کل صبح فتح میدان کے پویلین میں ملاقات ہو گی۔ کیا سالگرہ مبارک کی تقریب میں آپ بھی وہاں تشریف لیجائیں گے؟"

"کیوں نہیں بیٹی!" مولوی صاحب نے فرمایا "خدا خدا کر کے ہیں تو سال میں یہی ایک موقع ملتا ہے جہاں اپنے آقائے ولی نعمت کی سالگرہ کے بہانے اپنے ظل اللہ کو دل بھر کر دیکھ لیتے ہیں۔ وہاں پریڈ ہوتی ہے سلامی اترتی ہے اور گھنٹے دو گھنٹے اس مسرت و شادمانی میں بسر ہو جاتے ہیں جس کی حلاوت مہینوں تک نہیں جاتی پھر بھلا ایسے موقع کو میں اگر ہاتھ سے جانے دوں تو مجھ سے بڑھ کر اور کون بدنصیب نہیں ہو سکتا ہے .... اچھا میں ذرا عصر کی نماز پڑھ لوں تو پھر تفصیلی گفتگو ہو گی تم لوگ اتنے چاء بیو میں ابھی آتا ہوں۔ اور ہاں بیٹی جمیلہ تم نے بھی نماز پڑھی یا نہیں؟"

"جی ہاں میں تو پڑھ بھی چکی" جمیلہ نے فوراً جواب دیا "اور تمھاری اماجان نے؟" مولوی صاحب نے پوچھا۔ اس پر جمیلہ اپنی ماں کو دیکھ کر چپ ہو گئی۔ اور بیگم سلام اللہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھیں کہ مولوی صاحب ہنس کر بول پڑے:۔

"اس معاملے میں تمھاری اماں بڑی پھسڈی ہیں، ٹال بتاتی رہتی ہیں اور جب وقت تنگ ہو جاتا ہے تب ان کا مصلّے بچھتا ہے!"

"اوئی اللہ اللہ کرو بہتیرا وقت پڑا ہے۔ ابھی تو میں وضو کر کے آئی ہوں کہ تمھاڑ پڑ گئی۔ اچھا لڑکیو میں بھی ابھی نماز ختم کر کے آتی ہوں" یہ کہہ کر وہ قریب کے کمرے میں جا کر نماز میں مصروف ہو گئیں اور مولوی صاحب بھی حمام میں جا کر وضو کرنے لگے۔

اب جمیلہ اور راج کماری پاس پاس بیٹھی ہوئی گفتگو کرنے لگیں:۔

جمیلہ نے پوچھا "کہو بہن تمھارا ایم۔ اے کا امتحان کیسا رہا؟ سنا ہے کہ اب کے پرچے بڑے سخت تھے؟"

"پڑھنے والوں کے لئے تو کچھ سخت نہ تھے ہاں جنھوں نے پڑھا ہی نہ ہو ان کے لئے تو لامحالہ سخت ہوں گے" راج کماری نے بے پروائی سے جواب دیا "ہاں مجھے تاریخ میں ذرا شبہ ہے مگر رام کی کرپا سے پاس ہو جاؤں گی۔ ہاں جمیلہ دیکھو تمھارے لئے کلکتہ سے یہ ہار لائی ہوں" اور یہ کہتے ہوئے راج کماری نے ایک سبز مخملی ڈبے سے ہار نکال کر جمیلہ کے گلے میں ڈال دیا۔ اتنے میں ایک خادمہ موڑھیں سے ایک کشتی لئے ہوئے اندر داخل ہوئی جس میں کچھ میوے اور کلکتہ کے مشہور "رس گلے" تھے۔ دو چار بنڈلوں میں تحفیلدار کمپنی کے مشہور سلیپر

بندھے ہوئے تھے۔

"اُئے ہے بہن یہ کیوں تکلیف کی ان کی کیا ضرورت تھی مگر یہ تو تمھاری ہمیشہ کی عادت ہے کہ جب کہیں دو چار دن کے لئے بھی باہر جاتی ہو تو اپنی جمیلہ کے لئے ضرور کچھ نہ کچھ لے آتی ہو۔"

"جمیلہ کیا کہوں جی نہیں مانتا مجھے جو چیز پسند آجاتی ہے تم ضرور یاد آجاتی ہو پھر بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ میں اپنے لئے تو سب کچھ لے آؤں اور تمھارے لئے کوئی چیز نہ لاؤں۔"

"یہ تمھاری محبّت ہے جس نے مجھے طرح طرح سے گراں بار کر رکھا ہے۔" جمیلہ نے کہا "اور پیاری راج کماری ہی جیسی آج دنیا میں نہیں ملتی"۔ چائے تیار ہو گئی تھی، مولوی صاحب اور اُن کی بیگم بھی نماز سے فارغ ہو کر کرسیوں پر آبیٹھے تھے۔ آیا ہوا سامان دیکھ کر مولوی صاحب نے جمیلہ سے پوچھا:-

"ایں یہ کہاں سے آیا، کیا راج کماری لے آئی ہیں؟"

"جی ہاں ابا جان یہی لائی ہیں اور ایسے موقعوں پر کبھی خالی ہاتھ نہیں آتیں!"

"راج کماری بڑی پیاری بچّی ہے۔" مولوی صاحب نے فرمایا "اس کی ساری عادتیں اپنے باپ کی سی ہیں بس راجہ سکھ دیال پرشاد کی ہو بہو تصویر ہے۔ خدا انھیں خوش رکھے اپنی بچّی کو بڑی عمدہ تعلیم دی ہے اور بالکل اپنے رنگ میں رنگ دیا ہے" راج کماری کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے مولوی صاحب نے کہا "بیٹی آپس میں پیار محبت بڑھانے کا اس سے بہتر اور کوئی طریقہ ہو نہیں سکتا اسی وجہ سے ہمارے ہاں حدیث شریف میں "تہادو تحابو" آیا ہے یعنی آپس میں تحفے دو اور محبت بڑھاؤ اور جس نے اس پر عمل کیا تو سمجھ لو کہ اس نے دین اور دنیا دونوں کی نعمتیں پالیں" پھر جمیلہ کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا "تم نے بھی اپنی پیاری ہمجولی کے لئے کچھ خریدا جسے تم اپنی محبت کی نشانی لے سکو؟"

"جی ہاں ابا جان" جمیلہ نے اطمینان سے کہا "میں نے بھی ان کے ادبی مذاق کی چند چیزیں لے رکھی ہیں ان میں سے ایک تو "**منتخبات ہندی کلام**" ہے جسے ڈاکٹر جعفر حسن پی ایچ۔ ڈی نے ابھی حال ہی شائع کیا ہے۔ دوسری کتاب میاں ایم۔ اسلم کے افسانوں کا مجموعہ ہے جسے "**مرزا جی**" کے نام سے انھوں نے بڑی نفاست کے ساتھ طبع کرایا ہے اور سچی بات ہے کہ میں نے تو اس سج دھج اور سلیقے کی اردو میں اور کوئی ایسی کتاب نہیں دیکھی جو

اس قدر سستی ہو۔ تیسری کتاب "روحِ ظرافت" ہے جو مرزا عظیم بیگ چغتائی کے مضامین کا مجموعہ ہے۔

"ائے ہے! کولتار والی کتاب؟" بیگم نے قطع کلام کرتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں وہی کولتار والی کتاب" جمیلہ نے جواب دیا۔

"کولتار کیا؟" مولوی صاحب نے چاء کی پیالی منہ تک لیجاتے ہوئے پوچھا۔ اس پر بیگم نے مختصر طریقہ پر اس کا قصہ کچھ اس انداز میں بیان کیا کہ گھونٹ لیتے لیتے مولوی صاحب کو بے اختیار ہنسی آگئی جسے ضبط کرتے ہوئے انھیں پھندا لگ گیا اور پیالی میں سے چاء چھلک کر ان کی ٹوئیڈ کی واسکوٹ پر گر گئی جسے جمیلہ نے جلدی سے اٹھ کر تو ال سے پونچھ دیا۔

"سنا ہے چاء کا دھبہ بہت خراب ہوتا ہے"۔ راج کماری نے کہا "کہیں ایسا نہو کہ یہ ٹوئیڈ خراب ہوجائے"۔

"نہیں بیٹی!" مولوی صاحب نے بے پرواہی سے جواب دیا یہ سن برج ٹوئیڈ ہے اس پر بھلا کیا اثر ہو سکتا ہے۔ دھوپ اور پانی کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا اس لئے کہ اس کا رنگ پائیدار ہے یہی وجہ ہے کہ میں اس واسکوٹ کو پانچ برس سے پہن رہا ہوں اور آج بھی نئی کی نئی معلوم ہوتی ہے اور ویسے بھی ہمارے ہاں ان داغ دھبوں کی کوئی فکر نہیں کیجاتی جہاں اس قسم کا دھبہ کسی کپڑے کو لگا اور جمیلہ نے چٹکی بجاتے اسے صاف کر ڈالا"۔

"وہ کیسے جمیلہ!" راج کماری نے حیرت سے پوچھا۔

جمیلہ نے کہا "میرے پاس ایک کتاب ہے جس کا نام "رنگائی دھلائی" ہے اس میں پارچہ شوئی کے متعلق سیدہ عزیزہ خاتون صاحبہ نے بڑا بیش قیمت مسالہ فراہم کر دیا ہے بس سمجھ لو کہ جس گھر میں یہ کتاب ہوگی رنگائی دھلائی کی کوئی تکلیف نہ ہوگی یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر لڑکی پڑھے تاکہ اس کی معلومات میں طرح طرح کا اضافہ ہو سکے"۔

"اس کی کیا قیمت ہے اور کہاں مل سکتی ہے؟" راج کماری نے دریافت کیا۔ "یہ کتاب تو کوئی سو صفحوں کی ہے" جمیلہ نے جواب دیا "مگر قیمت صرف چار آنے ہے اور ناظم صاحب دار التصنیف کپورتھلہ سے ملسکتی ہے"

چاء ختم ہو چکی، برتن اٹھا دئے گئے اور جمیلہ قریب کی میز سے چاندی کا خاصدان اٹھا لائی اور آتے آتے "ہمجولی" بھی لے آئی تاکہ راج کماری کو دکھایا جا سکے۔

"ہمجولی دیکھتے ہی راج کماری بول اٹھی" اوہو! یہ یہاں بھی موجود ہے اس نے غضب کی ہر دل عزیزی حاصل کرلی ہے۔ آج میں جہاں جہاں بھی گئی اسے پڑھتا ہوا پایا۔ جس سے سنا اس کی تعریف ہی کرتا تھا۔ مس بہروچہ تو اس پر لوٹ ہیں اور ہر طرح اس کی نشر و اشاعت میں دلچسپی لے رہی ہیں انھوں نے ہی مجھے یہ چندن دیا تھا اور اس میں بھی ہمجولی کی تعریف کی گئی ہے۔"

"ذرا ہم بھی سنیں کہ ہمارے حیدرآباد کے ایک پرچے کے متعلق مہاشے سدرشن کی کیا رائے ہے؟" مولوی صاحب نے فرمایش کی اور اس پر راج کماری نے صفحہ ۳۳۵ نکال کر پڑھنا شروع کیا:—

چندن لاہور بابتہ ستمبر ۳۱ء ۱۹

یہ رسالہ نئی پود کی ہر جہتی فلاح و بہبودی کے لئے جولائی سے جاری کیا گیا ہے۔ جیسا محبوب نام ہے ویسا ہی محبوب پرچہ ہے۔ دیکھ کر آنکھیں خوش ہو جاتی ہیں پہلے دونوں اشاعتوں کے مضامین نظم و نثر نہایت ستھرے اور پاکیزہ ہیں۔ بھرتی کا ایک بھی مضمون ہمیں نظر نہیں آیا ہمیں اس بات کی اور بھی خوشی ہے کہ اس کی ترتیب کا کام ہماری ایک بہن نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ ان کی محنت، قابلیت اور خوش سلیقگی دیکھ کر خود بخود داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن ہم اپنی بہن سے ایک درخواست کریں گے۔ اسلامی پرچوں میں عام طور پر ایک بڑی بھاری کمی پائی جاتی ہے۔ ان کے نامہ نگاروں کی فہرست ہندوؤں سے بالکل خالی ہوتی ہے یہ تنگ دلی اور پست خیالی اردو ادب کے لئے مہلک ہے۔ ہمجولی کے پہلے دو نمبروں میں بھی کسی ہندو اہل قلم کا مضمون نہیں ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ایڈیٹر صاحبہ اس طرف توجہ دینگی اور ہماری اس شکایت کو جو صرف ہماری ہی شکایت نہیں ہے جلد سے جلد رفع کر دینگی فقط

اس کے سنتے ہی مولوی صاحب نے فرمایا "بھئی بات تو مہاشے صاحب نے بہت معقول کہی ہے اور واقعی ہمجولی میں یہ ایک کمی ہے کہ ہم نے آج تک اس میں کسی ہندو بھائی کا ایک مضمون بھی نہیں دیکھا۔

"پہلے مجھے بھی یہ بات بہت کھٹکی تھی" راج کماری نے کہا "بلکہ میں نے تو اسی وجہ سے اس کی طرف کوئی توجہ

بھی نہیں کی کہ ایسا فرقہ واری پرچہ کون دیکھے گر مس بہروچہ نے اس کا معقول جواب دیکر میری تسلی کردی"۔

"وہ کس طرح ؟" مولوی صاحب نے فوراً دریافت کیا۔

اس پر راج کماری نے کہنا شروع کیا کہ مس بہروچہ مدیرہ کی ہمجولی ہیں اس لئے وہ خوب واقف ہیں کہ ہمجولی جاری کرنے میں کن کن دقتوں کا سامنا کرنا پڑا' مضامین کس مشکل سے فراہم کئے گئے چنانچہ اس کے لئے آٹھ دس مہینے لگاتار کوشش کی گئی جگہ جگہ خطوط بھیجے گئے اور طرح طرح سے ہندو اور مسلمان انشا پرداز حضرات کو قلمی معاونت کے لئے ابھارا گیا مگر اس کا یہ روح فرسا نتیجہ ظاہر ہوا کہ فیصدی پانچ حضرات نے بھی اس کی طرف توجہ نہ کی اور جواب دیا بھی تو یہ کہ ہم اگر کچھ لکھ سکے تو اس کا معیار دیکھ کر لکھیں گے ۔ وہ یہ کہتی ہیں کہ ہندوؤں کی حد تک سوائے دو ایک کے اور کسی نے توجہ نہ کی بلکہ انھیں تو یہ ہی شکایت تھی کہ خود مہاشے صاحب کو کئی خط لکھے گئے مگر معلوم ہوتا ہے کہ ادارتی مصروفیات کے سبب انھیں جواب دینے کا موقع نہ مل سکا۔

"اگر یہ واقعہ ہے تو ہمجولی بیچارے کا کوئی قصور نہیں" مولوی صاحب نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔

راجکماری نے کہا "جی یہ واقعہ ہے !" جس کی شہادت رجسٹروں سے مل سکتی ہے ۔

"میں نے مہاشے سدرشن کی تحریروں کو بے لوث پایا ہے" مولوی صاحب نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "لیکن مجبوریوں کی تہ کو پہنچے بغیر عام اسلامی پرچوں کو تنگ دل اور پست خیال تصور کر لینا دوبارہ توجہ کا محتاج ہے ۔ میں نے دیکھا ہے کہ چندان میں کثرت سے مسلمان لکھتے ہیں جو اصولاً لکھنے والوں کی وسیع النظری کہی جاسکتی ہے لیکن مسلمانوں کے پرچوں میں ہندوؤں کا غال خال نظر آنا سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کی تنگ دلی کا نتیجہ ہے !"

اس پر راج کماری نے کہا "اور تو اور میں نے یہ بھی سنا ہے کہ خود یہاں کے لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ چن چن کر باہر والوں کے مضامین ہمجولی میں لئے جاتے ہیں اور یہاں کے لوگوں کے مضامین کو اس میں جگہ نہیں ملتی مستورات علیحدہ شاکی ہیں کہ اس میں عورتوں کے مضامین بہت کم نظر آتے ہیں ۔ لیکن جب کوئی لکھنے کی طرف توجہ ہی نہ کرے تو میری رائے میں ہمجولی پر اس قسم کی ذمہ داری عاید کرنا سراسر زیادتی ہے"۔

ہاں بیٹی خدا نے ہر ایک کو زبان دی ہے مولوی صاحب نے کہا اور ہر ایک اپنی سمجھ کے موافق اس سے

کام لیتا ہے۔ لیکن جو طبائع صداقت پسند ہوتی ہیں وہ کسی نتیجہ پر پہنچنے سے پہلے بات کے ہر پہلو پر غور کر لیتی ہیں۔ ویسے بھی ہمجولی کو نکلے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں جو سارا زمانہ اس میں مضامین لکھنا شروع کر دیگا۔ آخر پڑھنے والے بھی تو موجود ہیں جب وہ اسے اپنے ڈھب کا پالیں گے تو خود مضامین بھیجنے شروع کر دیں گے اور یہی اب تک ہوتا آیا

"جی ہاں یہی ہوگا اور ایک وقت ایسا آئیگا ہمجولی خود بخود اپنی راہ چل پڑے گا۔ مس بہروچہ اسی سلسلہ میں یہ بھی کہتی تھیں کہ بہن صغرا ہمایوں مرزا صاحبہ سابق مدیر النساء اس پرچے سے بڑی دلچسپی رکھتی ہیں وہ بھی یہی چاہتی ہیں کہ اس میں عورتوں کے مضامین بیش از بیش ہوں بلکہ وہ تو یہاں تک مصر ہیں کہ زنانہ محفل میں مردوں کی شرکت اچھی نہیں معلوم ہوتی اور یہ کہ مردوں نے عورتوں کے حقوق چھین لئے ہیں اب ہم خود اپنے حقوق حاصل کریں گے اسس لئے بھی عورتوں کے مضامین زیادہ ہوں"۔

"بات تو ٹھیک ہے" مولوی صاحب نے کہا "مگر میں جہانتک ہمجولی کی روش سے اندازہ کر سکا ہوں اس میں ابتک اس قسم کی کوئی چھیڑ نہیں ہوئی اور نہ غالبًا ہوگی کیونکہ اس کا دائرہ عمل صرف نئی پود کی فلاح بہبود تک محدود سمجھا جاتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس بحث کا اب وقت بھی نہیں رہا کیونکہ پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے بمصداق ماضی کے مصداق ان جھگڑوں کو چھوڑ کر سر دست اپنی ساری توجہ اپنی اولاد پر مرکوز کر دینی پڑیگی جس کی بہبودی اور فلاح میں ساری قومی ترقی کا راز پنہاں ہے یہ آپس کے حقوق و فرایض کے جھگڑے اس وقت تک نہیں مٹ سکتے جب تک ہم نئی نانی کو زیور علم سے آراستہ نہ کریں گے اور اس کا تصفیہ زمانہ خود کریگا کہ "ناموس اکبر" کے مدونہ قوانین میں کہاں تک اصلاح ممکن ہے"۔

مولوی صاحب یہاں تک پہنچے تھے کہ جمیلہ نے اپنی کلائی گھڑی دیکھ کر کہا "میں اب اجازت چاہتی ہوں بہت دیر ہوگئی ہے اور ہاں جمیلہ بہن میں کلکتہ میں کیا رہی گویا اردو ادب سے کوئی واسطہ ہی نہیں رہا وہاں کی فضا کچھ ایسی تھی ہے کہ خبر ہی نہوتی تھی کہ ہندوستان میں کون کون سے پرچے نکل رہے ہیں۔ لاؤ کچھ تازے پرچے دکھاؤ تاکہ میں اپنی پسند کے موافق کچھ جاری کرا سکوں اس پر جمیلہ اٹھی اور بنڈل راجکماری کے سامنے لاکر رکھدیا۔ جس میں بہت سے پرچے سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔

راجکماری نے سلسلہ وار پڑھنا شروع کیا:۔

سعید دہلی، سروش لاہور، سرگزشت[1]، نیرنگ دہلی، ایوان گورکھپور، ندیم گیا، چمنستان امرت سر، لب روحانی لاہور، ہونہار دہلی، فلم ریویو کلکتہ، چوپنچ کلکتہ، دیش سیوک لاہور، رہنما مراد آباد، مکتبہ حیدرآباد کشافہ حیدرآباد، سلطنت دہلی، الخلیل دہلی، ارمغان دہلی، فلمستان لاہور، گرہستی لاہور، پیمانہ آگرہ، الناقد آگرہ، میخانہ لکھنؤ، رفیق نسواں لکھنؤ، رفیق بلند شہر، چندن لاہور، عالمگیر لاہور، ادبی دنیا لاہور، وغیرہ وغیرہ۔

"اوہو یہ تو بہت پرچے ہیں!" راجکماری نے حیرت سے کہا۔

ابھی تو اور بہت سے پرچے بالاخانے پر رکھے ہیں" جمیلہ نے کہا "ذرا فرصت سے آؤ تو پھر ان کی بہار دیکھو روا روی میں کیا دیکھ سکو گی۔ بہت سی نئی کتابیں بھی ہیں جن پر ذرا تنقیدی نگاہ ڈالنا"۔

"اچھا تو بہن میں اب جاتی ہوں اللہ کو سونپا"

ہاں کماری ذرا ٹھہرو وہ سٹ بھی مجھیں لاکر دیتی ہوں جو تمہارے لئے میں نے تیار کرایا ہے ان کتابوں کو ذرا اطمینان سے دیکھ کر اپنی رائے دینا کیسی ہیں۔

یہ کہکر جمیلہ اپنے کتاب خانہ میں گئی اور ایک نہایت نفیس آبنوسی کیس لے آئی جس میں مرزاجی "منتخاب ہندی کلام اور روح ظرافت تینوں کتابیں نہایت عمدہ جلد بندھی ہوئی رکھی تھیں جن پر سنہری حروف میں منقوش تھا:۔

"پیاری راجکماری کے لئے"

راجکماری نے شکریہ کے ساتھ اسے لے لیا اور جانے کے لئے کھڑی ہو گئی مگر کچھ خیال آتے ہی جمیلہ سے پوچھ بیٹھی:۔

ہاں جمیلہ کل تم بھی فتح میدان آؤ گی ذرا پریڈ اور سلامی دیکھ کر جی بہلانا۔

جی تو میرا بھی بہت پھڑکتا ہے کہ اس مبارک تقریب کو میں بھی اپنی آنکھوں سے ہر سال دیکھا کروں مگر وہاں پردہ کا کوئی انتظام نہیں ہوتا اس لئے جانا ممکن نہیں۔

"ہاں بات تو ٹھیک ہے" راجکماری نے کہا "تاہم ہمارے اباجان نے نواب اکبر یار جنگ بہادر سے

[1] اس پر انشاء اللہ آئندہ کی فصل میں ریویو کیا جائیگا!

اس کے متعلق عرض کرکے ہوم آفس کی عمارت کے ایک عقبی حصہ میں مستورات کے لیے کچھ انتظام کیا ہے اور نواب صاحب ممدوح نے ازراہ کرم اس بات کا احساس فرماکر حسبِ دستور اجازت بھی عطا فرمادی ہے۔ اس لئے امید ہے کہ اس مبارک تقریب کے اکثر دلچسپ مناظر وہاں سے دیکھے جاسکیں گے۔"

"اگر ایسا ہے اور دیگر خواتین بھی وہاں آتی ہیں تو جمیلہ بیٹی تم بھی ضرور جاؤ۔" مولوی صاحب نے فرمایا۔ "تمھاری اماں کو بھی جانا چاہئے" بیگم کی طرف مخاطب ہوکر "تم بھی جاؤ گی نا؟" کیوں نہیں" بیگم نے کہا۔ "سر آنکھوں سے جاؤنگی مگر مجھے افسوس اس بات کا ہوتا ہے کہ ہزاروں ایسی غیر مستطیع بہنیں ہیں جنھیں ہر سال اس تقریب کے دیکھنے کی آرزو پیدا ہوتی ہے۔ مگر پردے کا انتظام نہ ہونے کے سبب ان کی تمنائیں دل کی دل ہی میں رہ جاتی ہیں۔"

"اجی تمھیں عورتوں کی فکر پڑی ہوی ہے کچھ خبر بھی ہے کہ ہزارہا مرد کس جوش اور عقیدت سے فتح میدان کے اردگرد چکر کاٹتے رہتے ہیں، سڑکوں پر دورویہ قطار در قطار اس غضب کا مجمع رہتاہے کہ تل دھرنے کو جگہ نہیں رہتی فتح میدان کے اطراف کی عمارتوں اوران کی چھتوں پر اس قدر اژدحام ہوتا ہے کہ کہیں چھتیں نہ بیٹھ جائیں۔ نوبت پہاڑ کی بھیڑ دیکھنے کے قابل ہوتی ہے اور یہی ڈر رہتا ہے کہ اترنے چڑھنے میں کوئی واردات نہ ہوجائے مگر عقیدت کا جوش سینوں میں ابلتا رہتا ہے اور خلایق اپنے ظل اللہ کے دیدار کی دیوانہ وار مشتاق رہتی ہے چاہے مینہ آے یا آندھی جب تک اس تقریب کے تمام مراحل طے نہیں ہوجاتے اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوتے پھر بھلا اس ہلڑ میں عورتوں کے پردے کا کیا بندوبست ہوسکتاہے۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ مردوں کو کان پکڑ کر سڑک سے ہٹادیا جائے اور پردے لگاکر عورتوں کو دورویہ سڑک پر بٹھادیا جائے" بیگم نے میز پر ٹیکا دیتے ہوئے کہا۔ "بلکہ میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ کوئی ایسی جگہ بنادی جاتی جہاں سے مرد اور عورتیں اطمینانِ قلب کے ساتھ اس مبارک تقریب کو دیکھ سکتیں اور دھوپ یا بارش سے کوئی تکلیف نہ ہوتی۔

"بنادی جاتی کی بھی ایک ہی رہی" مولوی صاحب نے راج کماری کو مخاطب کرتے ہوے کہا "گویا جن میرے قبضے میں ہے کہ میں اسے فوراً طلب کرکے کہدوں کہ دیکھو جی کل زبردست مجمع ہونے والا ہے، بڑے لوگوں کے لئے تو پیویلین ہے۔ البتہ عوام الناس کو سر چھپانے کے لئے کوئی جگہ نہیں اس لئے راتوں رات فتح میدان

کے کمپاؤنڈ میں ایک زبردست ایمفی تھیٹر (Amphitheatre) تیار کروا دیں کل بھر دم اس کے دروازے ہمارے استقبال کے لئے چوپٹ کھلے ہوئے ہوں گے"۔ یہاں پہنچ کر مولوی صاحب نے بیگم کی طرف دیکھ کر پوچھا"کہو تو اس میں زنانہ حصہ بھی بنوا دوں یا مردانے ہی سے کام چل جائے گا۔" ادئی ہو کیا گیا ہے تمھیں!" بیگم نے طنزاً کہا" بات کرنی مشکل کر دی ہے۔ کہہ رہی تھی میں کیا اور پکڑ لائے جن صاحب کو" اس پر راج کماری اور جمیلہ دونو کھل کھلا کر ہنس پڑیں" تو کیا جن سے مراد الف لیلہ والا جن لینی ہو مگر میری نظروں میں تو وہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ میں تو اس جن کو کہتا ہوں جو ہم میں اور تم میں فطرتاً پایا جاتا ہے اور یہ" ارادہ" ہے۔ اس میں بلا کی قوت ہوتی ہے مگر اس پر قبضہ پانا بہت مشکل ہے اور جس نے اس پر قابو حاصل کر لیا اس کے لئے کوئی چیز ناممکن نہیں ہے۔ اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ قوت ارادی کے تاثرات یا بواسطہ خرقِ عادات کے مظہر بن سکتے ہیں البتہ ارادہ...... بیگم نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا" اجی کس چکر میں پڑ گئے؟ ہو رہی تھی کچھ اور بات چیت اور فلسفہ بگھارنا شروع کر دیا، میری سمجھ میں تو کچھ آتا نہیں کہ ارادہ جن کیسے ہو سکتا ہے؟"

مولوی صاحب نے مثال دیتے ہوئے کہا" مثلاً یہ بھولی ہی ہے اگرچہ ابھی سے اردو کے چوٹی کے پرچوں میں اس کا شمار ہوتے لگا ہے لیکن اگر اس کی معقول قدردانی کی جائے اور اس طرح مدیرہ کے ارادوں اور ہمت میں بلندی پیدا ہو جائے تو میں آج ہی پیشین گوئی کرتا ہوں کہ یہ بہت جلد مغربی طرز کا ایک بہترین میگزین ہو جائے گا جس پر ہندوستان ناز کرے گا۔

" مگر آپ فتح میدان میں ایمفی تھیٹر کس طرح تعمیر کرا سکتے ہیں؟" بیگم نے پوچھا" یہ بھی اس طرح ممکن ہے" مولوی صاحب نے کہا" کہ پبلک اپنی تکلیف کا پہلے احساس کرلے اور یہ معاملہ اپنے ارادے سے حکومت کی خدمت میں پیش کرے تو یہ تو کہنے کی بات ہے کہ کل اگلے ہی روز اس کی تعمیر ہو جائے گی۔ مگر ہاں اگلے سال انشاءاللہ سارا حیدرآباد سالگرہ مبارک کی تقریب نہایت اطمینان سے اسی" جلوگاہ" سے معائنہ کر سکتا ہے"۔

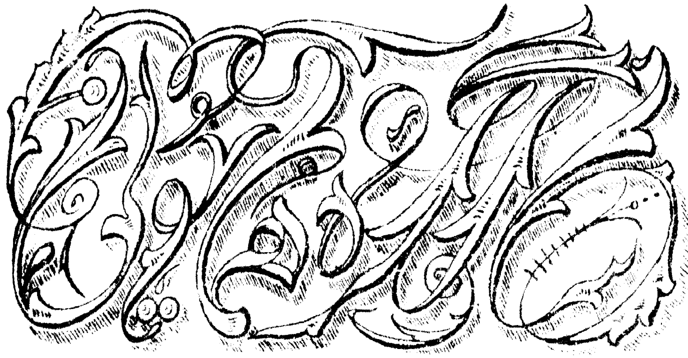
راج کماری نے مولوی صاحب کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا" یہ نہایت عمدہ تجویز ہے جس پر حکومت کو فوری توجہ کرنی چاہئے اور آج کے" منشور" میں بھی اسی عنوان سے کچھ لکھا گیا تھا مگر اس میں صرف پبلک کی تکلیف کا احساس اور اس کا اظہار کیا گیا تھا اور آپ نے تو ساری اسکیم ہی مرتب کر ڈالی"۔

"احساس بڑی چیز ہے" مولوی صاحب نے فرمایا۔ "اسی سے ارادہ پیدا ہوتا ہے جو عملی صورت اختیار کر کے ہر کام انجام دلوا سکتا ہے۔ اسی جلوہ گاہ کی ضرورت کے احساس کو دیکھو جو اگر پوری قوت ارادی کے ساتھ حکومت کی خدمت پیش ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اس پر عمل نہ ہو اور اس سے جو فوائد حاصل ہوں گے وہ بھی لاتعداد ہوں گے غضب ہے کہ فتح میدان جیسے پرفضا مقام میں آئے دن طرح طرح کے کھیل تماشے ہوتے رہیں اور پبلک اس طرف کوئی توجہ نہ کرے اس کی بظاہر یہی وجہ کہی جاسکتی ہے کہ وہاں مخلوق کی نشست کا کوئی انتظام نہیں ہوتا اس پر بھی شوقین مارے دھاڑے دوڑ دور سے یہاں آکر کچھ درختوں پر چڑھ جاتے ہیں کوئی اپنی گاڑیوں میں بیٹھے رہتے ہیں جن کی نظریں تیز اور ہمتیں بلند ہوتی ہیں وہ نوبت پہاڑ پر چڑھ جاتے ہیں اور اسی طرح ان کھیل تماشوں کو دیکھتے رہتے ہیں لیکن اس طرف کسی کا ذہن منتقل نہیں ہوتا کہ اگر کم از کم کوئی گیلری ہی بنا دی جائے تو حیدرآباد کا ایک کثیر حصہ وہاں جوق جوق آئے گا کھیل تماشے دیکھے گا، فوجی کرتب دیکھے گا، چاندنی راتوں کے بینڈ سنے گا، فوجوں کی نقل و حرکت دیکھے گا مصنوعی لڑائیاں دیکھے گا۔ کرکٹ ٹورنمنٹ دیکھے گا اور کیا کچھ نہیں دیکھے گا جو آئے دن وہاں ہوتا رہتا ہے۔ یہ میں مانتا ہوں کہ فتح میدان فوجی ضروریات کے لئے محفوظ سمجھا جاتا ہے۔ اگر اس کو گاہے گاہے پبلک کے مفاد اور اس کے آرام کی خاطر بھی کام میں لایا جائے تو ورزش جسمانی اور دیگر مردانہ کھیلوں کی تشویق کی اس سے بہتر اور کوئی درگاہ ہو نہیں سکتی۔ اور کچھ ہی دن میں اس کا یہ اثر ہوگا کہ یہاں کا بچہ بچہ اپنی جسمانی پرداخت کی طرف خود بخود مائل ہو جائے گا۔"

"مگر اس کے لئے کثیر روپیہ کی ضرورت ہوگی اور یہاں کا فوجی محکمہ اتنے مصارف کس طرح برداشت کرسکتا ہے؟" راج کماری نے دریافت کیا۔

"یہ کچھ مشکل امر نہیں" مولوی صاحب نے کہا۔ "ہماری سرکار عالی کروڑہا روپیہ دیگر عمارتوں پر صرف کر رہی ہے اگر اس کے لئے بھی کچھ روپیہ صرف کر دیا جائے تو اس کی پابجائی پبلک ہی سے اس طرح ہو سکتی ہے کہ اس عمارت کے داخلے کے لئے کچھ ٹکٹ مقرر کر دیا جائے تو یوں رفتہ رفتہ کل صرف شدہ رقم نہایت آسانی سے واپس مل سکتی ہے ......"

جمیلہ نے پھر گھڑی دیکھی اور کہا کہ میں اب رخصت ہوتی ہوں اور جمیلہ کی طرف دیکھ کر کہا کہ کل علی الصباح موٹر لے کر آؤنگی آپ سب فتح میدان چلنے کے لئے تیار رہیں اور مجھے یہ بھی توقع ہے کہ مولوی صاحب نے اگر پوری توجہ کی اور اس تجویز کا یہاں چرچا ہو گیا تو انشاء اللہ اگلے سال تک سردست وہاں ایک گیلری ہی تیار ہو جائے گی تا کہ خلق خدا آرام سے بیٹھ کر ایسی اہم تقاریب کو دلچسپی سے دیکھ سکے اور میں ابا جان کو بھی مجبور کرونگی کہ وہ اس معاملہ کو پبلک و پریس میں لانے کی انتہائی کوشش کریں خدا حافظ (باقی آئندہ)



از جناب سیّد وزیر حسن صاحب



نے مل جل کے رہنے کا بھی
اگلے وقتوں میں جب اپنا
جامۂ وحشت چاک کرکے یہ
مل بیٹھا - اور شدہ شدہ اس نے
سماجی ہوش سنبھالا - تو گویا
اسے سب سے پہلے حق اور فرض کی پڑی کہ انہیں کے
تانے بانے سے سماج کی شیرازہ بندی ہوتی ہے - لیکن
حق و فرض کی گلجھٹوں کا سلجھانا کچھ بچوں کا کھیل نہ تھا
اِس واسطے اسکو سماجی تنظیم میں ایک ایسی اعلیٰ قوت
کی ضرورت محسوس ہوئی جو ایک طرف حقوق و
فرائض قایم کرے - تو دوسری طرف ان کی حفاظت

بھی کرتی جائے - غرض اسطرح "**حکومت**" کی
داغ بیل پڑی - اور اگرچہ "حکومت" کے کئی نام پڑگئے ہیں
مثلاً کہیں "**بادشاہت**" ہے تو کہیں "**جمہوریت**"
پھر بھی اِن سب کی وہی شکل ہے - جیسے ایک پھول
اور اُس کی کئی سندر پنکھڑیاں

خیر تو "حکومت" ایک قوت اعلیٰ ہے - اور دیکھا جائے
تو سماج سے اس کا وہی نازک رشتہ ہے جو جسم کا
دل و دماغ سے ہوتا ہے - اب اگر کوئی اپنے دل و دماغ
سے بے وفائی کرے - تو یہ اسی کی بدتوفیقی ہوگی - اور
اس سے ہوگا یہ کہ وفاداری کی برکت سے جو دلی اطمینان
اُسے نصیب ہوتا وہ نہ ہوگا - اور پھر اسطرح "بادشاہت"



از جناب سید وزیر حسن صاحب



تا مل جل کے رہنے کا بھی
سیکھ لیا تو اس نے جب اپنا
جامۂ وحشت چاک کر کے یہ
ل بیٹھا۔ اور شدہ شدہ اپنے
سماجی ہوش سنبھالا۔ تو گویا
اسے سب سے پہلے حق اور فرض کی پڑی کہ انہیں کے
تانے بانے سے سماج کی شیرازہ بندی ہوتی ہے۔ لیکن
حق و فرض کی گتھیوں کا سلجھانا کچھ بچوں کا کھیل تھا
اس واسطے اسکو سماجی تنظیم میں ایک ایسی اعلیٰ قوت
کی ضرورت محسوس ہوئی جو ایک طرف حقوق و
فرائض قایم کرے۔ تو دوسری طرف ان کی حفاظت

بھی کرتی جائے۔ غرض اسطرح "**حکومت**" کی
داغ بیل پڑی۔ اور اگرچہ "حکومت" کے کئی نام رکھے گئے
مثلاً کہیں "**بادشاہت**" ہے تو کہیں "**جمہوریت**"
پھر بھی ان سب کی وہی شکل ہے۔ جیسے ایک پھول
اور اسکی کئی سندر پنکھڑیاں

خیر تو "حکومت" ایک قوت اعلیٰ ہے۔ اور دیکھا جائے
تو سماج سے اس کا وہی نازک رشتہ ہے جو جسم کا
دل و دماغ سے ہوتا ہے۔ اب اگر کوئی اپنے دل و دماغ
سے بے وفائی کرے۔ تو یہ اسی کی بد توفیقی ہوگی۔ اور
اس سے ہوگا یہ کہ وفاداری کی برکت سے جو قلبی اطمینان
اسے نصیب ہوتا وہ نہ ہوگا۔ اور پھر اسطرح "بادشاہت"

ہو یا جمہوریت" وہ ان سے ہم گھبراتا اور بے چینی
کی آگ میں پڑا سلگتا رہے گا۔

اس نازک رشتہ کی تو کچھ آج جاپان میں قدر ہے
اور دنیا اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتی۔ اپنے بادشاہ کی
کی ذات میں انہیں آسمانی خیر و برکت دکھائی دیتی ہے
کہ وہ اس پر تن من دھن سب نثار کر دیتے ہیں ان
لوگوں کے خلوص و عقیدت کی بھی حد ہو گئی کہ وہ
بادشاہ سے پھرنا گویا خدا سے پھرنا سمجھتے ہیں مثالاً
اسے یوں دیکھئے چند سال ہوئے کہ جاپان میں شاہ و
کی شادی کا جشن ہوا تھا۔ اس خوشی میں بادشاہ
نے بھی صرف خاص سے اک بڑی رقم دی۔ اور
خواہش کی کہ یہ رقم رعایا میں خاص خاص عمر کے
لوگوں میں بانٹ دی جائے۔ مستحقین میں ایک دیہاتی
نے بھی اپنی عمر کا صداقت نامہ داخل کیا۔ مگر بعد میں
غریب کو معلوم ہوا کہ اس نے اپنی عمر کا حساب غلط
لگایا۔ جس سے ایک سال کا بل آ گیا ہے۔ بس اب
کیا تھا۔ جذبات کا جوالا مکھ پھٹ پڑا۔ دل ہل گیا
کہ بادشاہ کو غلط اطلاع دیکر میں تو دین و دنیا
سے گیا۔ فوراً ایک خط میں سارا ماجرا لکھا اور کفارہ گناہ
کے طور پر بڑے اطمینان سے خودکشی کرلی۔ ایسا ہی
ایک واقعہ ایک جاپانی اسٹیشن ماسٹر کا ہے۔ جس نے
صرف اس لئے خودکشی کرلی کہ ریل کے ٹائیم ٹیبل میں
معمولی سی چوک ہو گئی تھی۔ اس سے ہوا یہ کہ شاہی
اسپیشل میں چند منٹ دیر ہو گئی۔ جنرل نوگی کی جاں نثاری
ان سب سے انوکھی ہے۔ جنگ روس و جاپان کے
اس منچلے ہیرو کو جب شاہ میجی کی وفات کی خبر
پہنچی تو اس نے اور اس کی بیوی نے بڑے اطمینان سے
دوست احباب عزیز اقربا کو خیرباد کہا۔ اور مسکراتے
ہوئے اپنی جانیں محبت کی دیبی کے بھینٹ چڑھا دیں۔

یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں محبت و احترام
کا یہی شیوہ ہے۔ ہمارے بھی اچھے دن تھے۔ تو اسی
زمین و آسمان اور اسی بجلیاں ہندوستان میں ہم نے بھی
بیسیوں ایسی مثالیں پیش کی ہیں جو رہتی دنیا تک نہیں
بھلائی جائینگی۔ پرجا کی حیثیت سے ہم نے ہمیشہ
یقین رکھا کہ راجہ کو تائید غیبی ہوا کرتی ہے۔ ہم یہ بھی
جانتے تھے کہ اسکی تعظیم خدا کی عظمت اور اسکی اطاعت خدا کی اطاعت
ہے غرض یہی چیز تھی۔ جس سے ہندوؤں کی نظروں میں
بادشاہ اوتار بنا تو مسلمانوں نے اسے ظل اللہ سمجھا
دور کیوں جاؤ۔ اگلے وقتوں غلطی آن بان کی ہی
ایک جھلک دیکھ لو۔

دربار اکبری میں لکھا ہے کہ ایک دن اکبر بادشاہ
فوج کی موجودات لے رہا تھا۔ دو راجپوت نوکری کیلئے

سامنے آئے۔ کہیں بادشاہ کے منہ سے یہ نکل گیا کہ کچھ
بہادری بھی دکھاؤ گے؟ اتنا سننا تھا کہ اُن میں سے
ایک نے اپنی برچھی کی بوڑی اتار کر پھینک دی اور
دوسرے کی بھال اسپر چڑھائی۔ تلواریں سونت لیں
برچھی کی انیاں سینوں پر تلیں اور گھوڑوں کو ایڑیں
لگائیں بے خبر گھوڑے چٹاک کر آگے بڑھے۔ دونوں
بہادر چھد کر بیچ میں آن ملے۔ اس نے اسکے تلوار
کا ہاتھ مارا۔ اُس نے اُسکے۔ دونوں وہیں کٹ کے
ڈھیر ہو گئے!

دیکھئے! وفا سی وفا ہے کہ بادشاہ آزمانے
کو جھوٹوں کہتا ہے۔ وہ غیرت کے دھنی بات کی بات
میں نثار ہو جاتے ہیں۔ بھلا اکبر کی تیموری حمیت اس پر
کیسے خاموش ہو جاتی۔ مرنے والوں کے بال بچوں کو
جب نہال کیا۔ کیا۔ پہلے تو خود بدولت کے چنگیزی
لہو میں گرمی آگئی کہ جان کا بدلہ جان ہوتا ہے۔ مگر
بادشاہ کے مقابلے کو کون سامنے پڑتا؟ حکم دیا۔
تلوار کا قبضہ دیوار میں اسطرح گاڑ دو کہ پھل باہر نکلا ہے
پھر تلوار کی نوک سینہ پر لی۔ چاہتا تھا کہ آگے کو ہو
رہے لیکن مان سنگھ بلبلا کر لپٹ گیا۔ مطلب یہ تھا کہ
غلاموں کے رہتے آقا پر آنچ نہیں آسکتی۔ اکبر بڑے
جھنجلائے۔ جوش میں آکر مان سنگھ کو دے مارا کہ
کہ اس نے جذبۂ خداداد کو ظاہر نہ ہونے دیا۔ مگر وہ جاں نثار
بھی لپٹا ہی رہا۔ اس کشمکش میں انگوٹھے کی گھاٹی پر
بھی زخم آگیا۔ آخر مظفر سلطان نے زخمی ہاتھ مروڑ کر
کہیں مان سنگھ کو چھڑایا۔

تو ہاں یہی وہ چیز ہے جو گہری عقیدت مندی اور
سچی جاں نثاری کیلئے ہماری بھی آنکھیں کھولتی ہے اور سچ بھی
ہے۔ وفا و محبت کا بندہ بننا اور سدا اپنے محسن کا
کا گن ماننا ہی اصلی بھلمنسائی ہے کہ اس سے خود بھی
مطمئن اور خدا بھی خوش! لیکن خوبیٔ قسمت سے یہ
پیمان وفا و محبت اگر

حضرت آصف سابع خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ

جیسے خوبیوں والے حکمران سے ہو جائے تو اسکا پوچھنا ہی
کیا؟ سمجھو گھر بیٹھے خدا کی بہت ساری نعمتیں مل گئیں
یہ کچھ جوش عقیدت کا زور بیان نہیں۔ بلکہ اظہار حقیقت
ہے۔ ہندوستان میں کئی سو ریاستیں ہیں۔ ان میں سے
جس کو جی چاہے لو۔ کوئی اس ریاست ابد مدت
کے پلے کی نہ نکلے گی اور آپ مقابلۃً محسوس کریں گے
کہ تیس پینتیس برس میں تو یہاں کی وہ کایا پلٹ ہو گئی ہے
کہ زندگی کا ہر شعبہ آپ اپنی نظیر بن گیا ہے اس طرح گویا
یہ سرکار ابد قرار سب کی سرتاج ہے جیسے ثبوت درکار ہو

اس کے نئے تخت نشینی مبارک سے لیکر آج تک کی ملکی و سیاسی
مہمات موجود ہیں۔ دیکھ لے کہ ان دنوں ملک نے کیسی
کیسی کروٹیں بدلی ہیں۔ مگر ایک حضرت ظل سبحانی کی
قوت تدبر اور سیاست ہے کہ دل کی سی گہرائی اور
خیال کی سی وسعت لئے ان سب میں کارفرما ہے بلکہ
اس پر بھی خداداد جودت فکر اور جدت نظر نے سماج میں
جان اور جان میں زندہ دلی کی ایسی بے گمنی سوتیں کھود دی
ہیں کہ جن سے ملک شاد و آباد ہے۔

اور نو اور سرزمین دکن میں ایک جامعہ عثمانیہ ہی کا
قیام ایسا ہوا ہے کہ واہ وا۔ اور یہ جامعہ چشمہ علوم ہے تو
تو دارالترجمہ سرچیون سوت ہے جو منت نے تراجم سے اسکی
سدا بہار آبیاری کرتا رہتا ہے۔ یہی وہ مادر علمی (المامیٹر)
ہے۔ جسکی گودوں بھارت دیس کے سپوت رہتے دنیا
پروان چڑھیں گے۔ بلونت بنیں گے۔ جیسا کہ میں
کہیں پہلے بھی دکھا چکا ہوں۔ جامعہ عثمانیہ کیا ہے؟
ہمارے اس پرانے عارضے کا علاج ہے۔ جو مدت سے
ہمیں گھلا رہا تھا۔ اب تک غیر زبان میں تو ہمیں تعلیم
ملتی تھی۔ جس سے ہم زبان کی اصطلاحی مشکلات اور
محاوروں کے پھیر میں آ گئے تھے۔ حافظہ طوطے کی طرح
کتابیں رٹتا تو دماغ پر بار پڑتا۔ بینائی جدا جواب دیتی
تھی۔ مختصر یہ کہ تحصیل زبان میں ہی ہماری عمر کی
عزیز ترین گھڑیاں دیکھتے دیکھتے اسطرح گذر جاتی تھیں
کہ علم کی ہمیں اصلا ہوا بھی نہیں لگنے پاتی تھی۔ اسپر بھی کوئی
اللہ کا لال جفا کفا اٹھا کے محمد علی بنتا تو بن آئی ہم سے
رخصت ہو جاتا ۔ غرض یہ اور اسی طرح کی اور سیوں
باتوں سے ہماری جسمانی اور دماغی سکت ٹوٹ گئی تھی
اور بجائے اسکے کہ تحصیل علم سے ہماری حالت سنورتی
امنگیں ابھرتیں۔ وہ ہمارے حق میں خودکشی ہو گئی تھی
چہ جائیکہ تعلیم کے تو یہ معنے ہیں کہ اس سے ملک کی ذہنی
اور مادی ضرورتیں پوری ہوں۔ اور وہ ہماری قومی حیثیت
ابھار کر ہمیں فلاح و بہبود کے رستہ ڈال دے۔ مگر ہماری
درسگاہوں میں ایک بات بھی ایسی نہ تھی۔ ان میں
ڈھونڈے سے بھی ہمارے درد کا درماں نہ ملتا تھا۔
وہ تو نری اس گوں کی تھیں کہ امتحان لے لیں ڈگری
دے دیں۔ ان کی بلا سے۔ کوئی مرتا مرے۔ جیتا جیئے
آخر اسی بارگاہ عثمانی کے ایک فرمان عطوفت نشان مرشدہ
۴ رجب المرجب ۱۳۳۵ھ (۲۶ اپریل ۱۹۱۷ء) نے
ہمارے دکھ کا مداوا کیا۔ اور مادری زبان کی ایک
ایسی یونیورسٹی قایم فرما دی۔ جس نے ایک طرف مروجہ
تعلیم کے نقص اور ہمارے دلدر دور کئے۔ تو دوسری
طرف مغرب و مشرق کو اس نہج سے سمو دیا کہ ہماری
جسمانی۔ ذہنی اور روحانی ترقی کے نئے پرانے

و تیمرے جمع ہوگئے۔ اس یونیورسٹی کو مآل کی نظروں
سے دیکھو تو اس کی پوری آن بان نظر آتی ہے۔ خیال
کو روک نہیں۔ ایک دن میں بھی اس مادر علمی کو کھڑا
دیکھ رہا تھا کہ میری نظروں میں حال و مستقبل ایک
ہوگئے۔ میں نے دیکھا کہ آنے والی نسلوں کی ٹولیوں
کی ٹولیاں علم و فضیلت کے رنگ برنگ جبہ و دستار
پہنے چلے آتی ہیں۔ یہ سب کی سب آئیں اور اس مادر
علمی کے قدموں میں خاموش کھڑی ہوگئیں۔ پھر انہوں
نے ملکر دھیمے سروں میں شکر و احسان کا ایک گیت
گایا۔ جس میں ہمارے آقائے ولی نعمت کی حکمت
و کرمت کا سرتاسر بیان تھا۔ یہ گیت گاکر آنے
والے امتنان و محبت سے جھک گئے۔ اس وقت
قومی ارمانوں سے بھرا پرا میرا دل بھی احترام سے
گرما اٹھا۔ اور میں بھی ان کے ساتھ تعظیماً جھک گیا
حضرت سلطان العلوم کا یہی ایک درخشاں
کارنامہ اس مبارک راج کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے
اور اس خیال سے تو جی باغ باغ ہو جاتا ہے کہ ذوق
علم و ریاست میں جو ہمیشہ دور کی نسبت سنی تھی اور
تاریخ عالم میں پڑھا تھا کہ علم و فضل کو تخت و تاج سے
کہیں زیادہ بوریا نشینوں سے انس رہا ہے تو اس
کلیہ کے عالیشان مستثنےٰ یعنے حضرت بندگانعالی متعالی ظلہم العالی
کی ذات شاہانہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اللہ
اللہ عثمانی دربار بھی عجب دربار ہے۔ جہاں تاج شاہی
میں فقیری کا راز پنہاں ہے! جہاں عدل نوشیروانی
اور صولت سکندری بھی ہے تو تقوائے بایزیدی
بھی! جہاں جلالت و حشمت میں رقت و مروت
ہو۔ یہ وہ پیشگاہ ہے جہاں مجاز میں حقیقت کی
چاشنی ہو۔ یہ وہ آستانہ ہے! اور سچ تو یہ ہے کہ
کائنات میں ثوابت و سیارگان کے ملے جلے جس طرح
بے شمار نظام ہیں۔ اور جس طرح ان ثوابت و
سیاروں میں ایک نہ ایک ایسا بھی ہوتا ہے جس کی کشش
جذب و محبت دوسروں کو اپنا مصروف طواف
رکھتی ہے تو ٹھیک اسی طرح اس صفحۂ ہستی پر بھی چند
برگزیدہ ہستیاں ایسی ثوابت شہرت اور کعبۂ محبت
ہیں کہ ان کے جوہر ذاتی پر خلق خدا پروانہ ہے۔
حضرت اقدس و اعلیٰ ابھی اورنگ سلطنت پر جلوہ
افروز ہوئے تھے کہ سارے ہندوستان سے نذور
عقیدت و خلوص پیش ہوگئیں۔ ان عقیدت مندوں
میں ایک قابل احترام حالی بھی ہیں۔ ذرا ان کا
وجدان محبت دیکھئے!

قصیدۂ تبریک و تہنیت کے محبت میں ڈوبے
اشعار پڑھتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے حضرت

شہریار دکن ادام اللہ اجلالہم کی سواری بادبہاری کا مرکب وہ اپنی آنکھوں خوش خرام دیکھ رہے ہیں اور یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اسکے جلو میں عقل و فراست کے پرے کے پرے چلے آتے ہیں ۔ خود بدولت کے فرق مبارک پر ہوشمندی کی دستار ہے ۔ جس میں ظفر مندی کا طرہ جگمگ جگمگ کررہا ہے ۔ سیدھے ہاتھ میں شمشیر سیاست بے نیام ہے تو الٹی جانب قلمدان علم کھلا ہوا ہے ۔ غرض اس پُر احتشام جلوس کو جشن تاجپوشی کی طرف بڑھتے دیکھا تو اخلاص مند حالی بھی اپنا قصیدہ پڑھنے لگے ۔

قصیدہ

مُبارک بزرگوں کی میراث تم کو
جنھوں نے کہ جھیلی ہیں کڑیاں یہ ساری
ادا کرگئے وہ تو اپنے فرائض
ہے اب آپ کے عہدِ دولت کی باری
اب اُن کی جگہ آپ کو ہے اُٹھانا
خدا کی امانت کا یہ بوجھ بھاری
جو بے بس ہیں دینا ہے اُن کو سہارا
جو بے یار ہیں اُن کی کرنی ہے یاری
نکمے ہیں جو اِن کو کامی بنانا
بڑھانا دِل اُن کے جو ہیں کار باری
جگانا اُنھیں نیند کے ہیں جو ماتے
پڑھانا انہیں علم سے جو ہیں عاری
جو زردار ہیں اُن کی ہے پاسبانی
جو نادار ہیں اُن کی حاجت براری
جو سرزور ہیں اُن کی ہے گوشمالی
جو مظلوم ہیں اُن کی ہے غم گساری
سمجھنا ہر اک قوم و ملت کو یکساں
کہ خصلت ہے یہ زیورِ شہریاری
مُبارک یہ بارِ گراں تم کو شاہا!
اُٹھانے سے جس کے ہیں افلاک عاری!!

دنیا جانتی اور اچھی طرح جانتی ہے کہ اس قیافہ شناس بزرگ قوم نے جن پتہ کی باتوں کی طرف اپنی ارمان بھری زبان میں اشارہ کیا تھا وہ بارگاہ سلطانی سے کس طرح حرف بحرف پوری ہوئیں اور خدا نے چاہا تو پوری ہوتی رہیں گی ۔ اس عرض معروض کے بعد بڑے بوڑھوں کا جیسے قاعدہ ہے ۔ خوش اطوار **حالی** نے بھی بہت ساری دُعائیں دی ہیں اور حقیقت میں وہ اس قدر پر خلوص ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ اس سینتالیسویں

"سالگرہ مبارک"

کے سُہانے موقع پر بھی تفاؤلاً اُنہیں ہی بکمال ادب و خلوص دُہرا دیا جائے ۔

دُعا گوئے دیرینہ ناچیز حالیؔ — کہ مدحت گری کے ہُنر سے ہے عاری

دُعا کے سوا کچھ نہیں پاس اُس کے — ادا جس سے ہو فرضِ مدحت نگاری

الٰہی طفیل اُس کا پھیلائی جس نے — خلائق میں توحید و پرہیزگاری

منادی نے تعلیم نے، جس کی آکر — زمانے کی بگڑی ہوئی کل سنواری

طفیل اُس کا فرمانروائے دکن کی — حکومت کو دے غیب سے استواری

رہے رہتی دنیا تلک وہ سلامت

بہ اقبال و فیروزی و کامگاری!!

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

ذاتِ ہمایونی

از حضرت نکہت بی اے، آنرز ان پرشین

ہمارے کرمفرما مولوی عبدالسمیع خان نکہت جنہیں مشرقی علوم و ادبیات میں خاص مہارت حاصل ہے۔ گزشتہ ہفتہ بغرض تفریح بلدہ تشریف لائے تھے۔ اس سوال کے جواب میں کہ انہوں نے حیدرآباد اور اسکے تاجدار کو کیسا پایا۔ صاحب ممدوح نے اپنے جوابی خیالات کو فارسی نظم میں بڑی خوبی سے ادا کیا ہے جو ذیل میں درج ہے۔ انکی تشبیہات قابل غور ہیں جن میں عہد عثمانی کی برکات اور ذات ہمایونی کی حقیقی سیرت پر نہایت اختصار اور جامعیت کیساتھ روشنی ڈالی گئی ہے امید ہے کہ نظم نہایت دلچسپی سے پڑھی جائیگی اور آئندہ بھی انکی تشریف آوری پر ہمیں انکے کلام سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملیگا۔

بنگر بہ سلطانِ دکن، کو آمدہ صاحبقراں ‌‌ — یک عالمے از انس و جاں، در مدح او رطب اللساں

آئینہ حسن و صفا، سرمایۂ صدق و وفا — چشم و چراغ اصفیا، و مظہر روحانیاں

شمعیست با نور و ضیا، در ظلمت ہندوستاں — کز فیض او سرچشمۂ علم و ادب ہر سو رواں

ہم کامبخش و کامراں، ہم نکتہ سنج و قدرداں — زیر نگینش معدلت گستر شود، امن و اماں

شاہیست در شاہنشہاں چوں مہر در سیارگاں — تو ام "دلیل آفتاب" و حسن و نظمش در جہاں

صد مرحبا بر مسلکش، اسلام می نازد بجاں — با رسم مغرب سیرتش ہرگز نہ شد ہمداستاں

ملکش مگر باغ جناں، در حسن و خوبی دلستاں — ہر نخل نخل بارور، ہر شاخ شاخ گلفشاں

گلہائے عشرت خندہ زن، ہر چمن اندر چمن — فیض نسیمش پرورد ہم بوئے گل در بوستاں

حسن قبولش در امنم گیرد چہ ساں نکہت بہ بیں — آوردہ ام از صدق دل در خدمتش ایں ارمغاں

حیدرآباد کے سررشتہ عدالت پر ایک نظر

از جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی
اسسٹنٹ ہوم سکرٹری

وہ دن گئے جب کسی بادشاہ ملک یا والئ ریاست کی تعریف محض الفاظ کی بھتات اور زمین و آسمان کے قلابے ملانے کا نام تھا۔ امن و امان کی تعریف کرنے کھڑے ہوئے تو کہد یا کہ ملک کے اس کونے سے اُس کونے تک سونا اچھالتے چلے جاؤ کیا مجال ہے کہ کوئی آنکھ اُٹھاکر دیکھ لے۔ اب اگر یہ کہو گے تو پوچھیں گے کہ ذرا آپنے ہاں کی کوتوالی رپورٹیں نکال کر ہم کو صرف یہ دکھا دیجئے کہ رعایا، کا مال اسباب صندوقوں میں بھی محفوظ رہ پاتا ہیں اگر عدل و انصاف کی تعریف میں کہو گے کہ اس کے زمانے میں بکری اور شیر ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں تو یہی جواب ملیگا کہ یہ کام سرکس والوں کا ہے بادشاہ کا نہیں ہے ہم کو تو یہ بتادیجئے کہ اس کے ملک میں انسان سے انسان بھی مل کر رہتے ہیں یا نہیں۔

مہربان من۔ اب کچھ منہ سے نکالو تو ساتھ ہی ساتھ کوتوالی کے رجسٹروں اور عدالت کی مسلوں سے ثابت بھی کرتے چلو۔ نہیں تو یہ تعریف خوشامدیوں کی زبانوں اور درباریوں کے کانوں ہی تک محدود رہے گی۔ نہ ایسی بے تکی باتیں کرنے کی تم کو ضرورت ہے اور نہ سُننے کیلئے دوسروں کو فرصت۔

اب اگر میں یہ کہوں کہ اعلیحضرت نواب میر عثمان علیخان بہادر نظام دکن کا زمانہ تاریخ میں سنہری حرفوں سے لکھنے کے قابل زمانہ ہے۔ اور اپنے بیان کو (عقلاً نہیں نقلاً) ثابت نہ کرسکوں تو سب یہی کہیں گے کہ یا تو شاید ریاست سے کچھ وظیفہ ملتا ہوگا جو یہ مدحت سرائی ہو رہی ہے یا یہ خواہش ہوگی

کہ چلتے چلاتے کچھ انعام ہی مل جائے۔ اس لئے مناسب
یہی ہے کہ واقعات کا اظہار کر دیا جائے نتیجہ آپ
خود نکال لیں اگر نتیجہ قابلِ تعریف ہے تو آپ خود ہی
اس عہد کی تعریف کریں گے اگر نہیں ہے تو کم سے
کم خوشامد اور بیجا تعریف کے الزام ہی سے محفوظ
رہیں گے۔

بادشاہ کا سب سے اہم فرض رعایا کی جان
و مال اور ان کے حقوق کی حفاظت ہے۔ اور اس
غرض کو حاصل کرنے کے لئے سب سے زیادہ ضروری
چیز یہ ہے کہ رعایا کے دلوں میں عدالت کی وقعت
قائم کی جائے اور عدالت کی حالت کے متعلق ان
کے دلوں میں اطمینان۔ جس ملک کی رعایا کے
دلوں سے یہ دونوں چیزیں جاتی رہیں تو سمجھ لو کہ
وہاں سے امن و امان رخصت ہوئے۔ فوج سے رعایا
کو مغلوب کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کے دلوں کو مطمئن
نہیں کیا جا سکتا۔ ادھر فوج ہٹی ادھر جس کی لاٹھی
اس کی بھینس والا معاملہ شروع ہوا۔ عدالت اور
کوتوالی دو ہی ایسے محکمے ہیں جن پر ملک کی بہبودی
اور سرسبزی کا دارومدار ہے۔ سڑکیں بنا دو مگر جب اہالی
کو سڑک پر چلنا ہی خطرناک ہو تو ان سڑکوں کا ہونا نہ ہونا
برابر ہے۔ نہریں جاری کر دو۔ لیکن اگر ہری بھری کھیتی
لٹ جانے کا اندیشہ لگا ہو تو بھلا کوئی کھیتی کر کے دکھ
بھریں بس فاختہ اور کوّے انڈے کھائیں کی صورت
کھول پیدا کرے گا۔ غرض کسی پہلو سے دیکھو امن
و امان کے لئے لازمی ہے کہ رعایا کو یہ اطمینان ہو جائے
کہ جو جیسا کرے گا ویسا پائے گا۔ اور یہ اطمینان اسی
وقت حاصل ہو سکتا ہے جب ملک کا سررشتۂ عدالت
ایسی مضبوط بنیاد پر قائم کر دیا جائے کہ اس کو کوئی قوت
اپنی جگہ سے نہ ہلا سکے اور کسی کا خوف یا لالچ اس
کے عہدہ داروں کے ایمانوں کو متزلزل نہ کر سکے۔

یہی اسباب تھے جن کی وجہ سے شہریار دکن نے
سب سے پہلے اسی محکمہ پر نظر ڈالی اور اس کی ظاہری
اور اندرونی حالت کو اس طرح درست اور مضبوط کیا کہ
یہ محکمہ سمجھنے لگا کہ اپنی کارروائیوں کے متعلق اپنے خدا
کے سوا وہ اور کسی کا جواب دہ نہیں ہے۔ سب سے
اہم عدالت کے تقررات کا مسئلہ تھا۔ بہت کم ممالک
ہوں گے جہاں شاہی قوت اکثر و بیشتر ان اصولوں
سے نہ ٹکراتی ہو۔ جو عہدہ داروں کے تقرر کے متعلق
قائم کئے جاتے ہیں۔ لیکن ریاست حیدرآباد کے سررشتۂ
عدالت کو فخر ہے کہ قوتِ شاہی نے اپنے اختیارات
کو اس بارے میں استعمال بھی کیا تو اس طرح استعمال
کیا کہ بجائے ان اصولوں کے توڑنے کے ان میں

اور تقویت ہو گئی۔ جب کبھی کسی کے خاص حالات کے لحاظ سے کسی تقرر کے متعلق راست حکم دینے کی ضرورت بھی آئی۔ تو اس کے ساتھ یہ بھی ہدایت کر دی کہ یہ تقرر صرف اس صورت میں قابل نفاذ ہو گا کہ قواعد مجریہ اس کے منافی نہ ہوں اور اس اصول کو مدنظر رکھ کر کہ جس محکمہ کو عہدہ داروں کے کام دیکھنے کا موقع ملتا ہے وہی محکمہ خدمات کے لئے انتخاب بھی بہتر کر سکتا ہے۔ ہائیکورٹ کے اختیارات میں یہاں تک وسعت دے دی کہ تقررات اور تعیناتی ایک بڑی حد تک خود اسی عدالت عالیہ کے قبضہ میں آ گئے

اصلاح عدالت کے لئے ضرور تھا کہ اس سررشتہ کی خدمات پر ایسے لوگ مقرر کئے جائیں جو نہ صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں بلکہ عرصہ تک وکالت کر کے قانون سے واقف اور حالات رعایا سے باخبر ہو چکے ہوں چنانچہ ان ہی خیالات کو پیش نظر رکھ کر قواعد تقرر عہدہ داران میں ترمیم کی گئی اور سررشتہ عدالت کے سب سے ادنیٰ درجہ کے عہدہ دار یعنی منصف کے متعلق بھی یہ شرط قائم کر دی گئی کہ یا تو حیدرآباد کی سول سروس کلاس کا ایسا کامیاب شدہ ہو جس نے کم از کم ایک سال تک علاقۂ انگریزی میں عدالتی کام سیکھا ہو یا ایسا شخص ہو جس نے اپنی خاص قابلیت کی وجہ سے سرکاری وظیفہ حاصل کر کے یورپ میں تعلیم پائی ہو یا ایل ایل بی کا امتحان پاس کرنے کے بعد دو سال تک وکالت کی ہو۔ اسی معیار پر آپ اعلیٰ خدمتوں کے شرائط کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ انتخاب کی سختی کے باعث صرف تعلیم یافتہ اور قابل ہی لوگوں کے لئے ترقی کا دروازہ کھلا رہ گیا ہے۔

تقرر کی سختی کے ساتھ ساتھ معاوضۂ خدمت کا مسئلہ سب سے زیادہ قابل غور امر تھا اس کو اس طرح حل کیا کہ ادنیٰ سے لگا کر اعلیٰ خدمتوں تک سب کی تنخواہوں میں معتد بہ اضافہ کر دیا گیا۔ تاکہ لائق اور کارگزار لوگوں کو باوجود اس قدر موانعات اور شرائط کے خدمت سرکاری میں داخل ہونے کا شوق ہو۔ اور معاوضہ کی کمی ان کو ناجائز طریقوں سے اپنی آمدنی بڑھانے پر مائل نہ کرے۔ چنانچہ اس وقت بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ حیدرآباد کا سررشتۂ عدالت دوسری ریاستیں تو کجا خود برٹش انڈیا کے محکمۂ عدالت سے کیا بلحاظ قابلیت عہدہ داران وعمال اور کیا بلحاظ حسن انتظام و دیانت کسی طرح پیچھے نہیں ہے

مدتوں سے علاقۂ انگریزی میں کوشش پر کوشش ہو رہی ہے کہ کسی طرح عہدہ داران انتظامی سے اختیارات عدالتی علٰحدہ کر لئے جائیں۔ اور بات بھی

ٹھیک ہے۔ جن عہدہ داروں سے انتظام ملک متعلق ہے۔ وہ صرف قیام انتظام کو ہر وقت پیش نظر رکھتے ہیں اور اس غرض کے حاصل کرنے میں اختیارات عدالتی کو اس طرح استعمال کر جاتے ہیں۔ کہ قانون ان کے تکمیل خیالات کا ایک آلہ بن جاتا ہے فرض کیجئے کہ ایک عہدہ دار ایک حیثیت سے کوتوالی کا افسر اعلیٰ ہے اور دوسری حیثیت سے مجسٹریٹ بحیثیت افسر کوتوالی وہ کسی شخص کو چالان کئے جانے کا حکم دیتا ہے اور بحیثیت مجسٹریٹ وہ اس مقدمہ کی سماعت کرتا ہے۔ کیا ایک منٹ کے لئے یہ مانا جا سکتا ہے۔ کہ عدالت کی کرسی پر بیٹھنے کے بعد اس کے دل سے وہ خیالات محو ہو جائیں گے۔ جو مقدمہ کو قابل چالان قرار دیتے وقت بحیثیت افسر کوتوالی اس کے دل میں پیدا ہوئے تھے۔ ایسی ہی ایک اور مثال کا مجھے اس وقت خیال آگیا۔ ایک بہت بڑے کالج میں ایک مشہور پروفیسر تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ ہر سال یونیورسٹی میں اپنے ہی مضمون کے پرچہ کے ممتحن بھی ہوتے تھے۔ ان کی لیاقت میں کلام نہیں۔ مگر ہر سال وہ یہ کیا کرتے تھے کہ امتحان سے چند روز پہلے طالب علموں کو بتا دیتے تھے کہ فلاں فلاں سوال دیکھ لو اس مرتبہ امتحان میں آئیں گے۔ چنانچہ وہی سوالات آتے اور

ان کی جملہ جماعت کے سب لڑکے پاس ہو جاتے۔ ہوتے ہوتے یہ خبر یونیورسٹی کو ہوئی ان کا جواب طلب ہوا۔ جواب صرف ایک سطر کا تھا کہ بحیثیت پروفیسر میں نے وہ سوال بتائے اور بلحاظ ممتحن میں نے وہ سوال پوچھے پس مشترکہ اختیارات والے عہدہ داروں کی بھی یہی مثال ہے۔ بطور افسر کوتوالی وہ مقدمہ پیش کراتے ہیں اور بحیثیت مجسٹریٹ اس کی سماعت کرتے ہیں۔ انتظامی اور عدالتی اختیارات کو علحدہ علحدہ رکھنے میں کچھ تو خوبی ہے جو تمام دنیا کے متمدن ممالک میں یہ اختیارات کہیں ایک شخص میں جمع نہیں کئے گئے ہیں کچھ ہندوستان کی دنیا ہی نئی ہے کہ لوگ کوشش کرتے کرتے تھک گئے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح یہ دونوں اختیارات علحدہ علحدہ کر دیے جائیں۔ مگر ہر مرتبہ ناکامی کی صورت دیکھنی پڑتی ہے۔ عہدہ داران انتظامی اپنے عدالتی اختیارات کی پوٹ باندھے دورہ پر چلے جا رہے ہیں پیچھے پیچھے ملزمین مستغیث۔ گواہ۔ وکیل۔ ان کا پتہ پوچھتے ہوئے بھاگتے جاتے ہیں۔ صاحب کے ڈیرے پر پہنچے معلوم ہوا کہ کیمپ برخاست ہو گیا۔ بیس میل آگے ڈیرے پڑ گئے ہیں یہ بچارے اور آگے بڑھے۔ ابھی وہاں نہ پہنچے تھے کہ کیمپ اور آگے کھسک گیا۔ اور یہ کیمپ کی تلاش میں پھر چلے۔ غرض ان مشترکہ اختیارات کی وجہ سے ایک مشکل

ہو تو کہیں۔ دو ہوں تو کہیں۔ یہاں تو سراسر مشکلیں ہی مشکلیں ہیں۔ اعلیٰحضرت نواب میر عثمان علیخان بہادر نظامِ دکن ہی پہلے فرماں روا ہیں جنھوں نے سارے ہندوستان میں سب سے پہلے ایک گردشِ قلم سے اس معمّہ کو حل کر دیا اور ہندوستان بھر کو بتا دیا کہ صحیح راستہ کیا ہے اور کس طرح اختیار کرنا چاہئے جو احکام اس بارے میں صادر ہوئے ہیں وہ اِس انقلاب خیر و برکت کی بسم اللہ ہیں۔ اِس لئے بطور یادگار دائمی ان کو لفظاً لفظاً یہاں درج کرنے کی عزت حاصل کی جاتی ہے۔

(نوٹ۔ نقل فرمان مبارک)

ہر کام کی بھلائی اور بُرائی اِس کے نتیجہ سے دیکھی جاتی ہے۔ اب ہم کو دیکھنا یہ ہے کہ انتظامی اور عدالتی اختیارات کے علٰحدہ ہونے کا نتیجہ کیا نکلا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست حیدرآباد میں عہدہ داران مالگزاری اور عدالت کی تعداد جن سے دیوانی اور فوجداری کام متعلق تھا قبل انتزاع اختیارات ۲۵۹ تھی۔ اور اسکیم کے بعد گھٹ کر ۱۶۱ رہ گئی۔ اِس کے مقابلہ میں اگر کارگزاری دیکھی جائے تو مقدمات کا منفصلہ تقریباً دُگنا ہو گیا۔ اور مقدمات کا دوران گھٹ کر کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ ہم کو کسی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے لئے سررشتہ عدالت کی سالانہ رپورٹیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ اور ان سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ مقدمات منفصلہ کی تعداد سالانہ برابر بڑھ رہی ہے۔ اور مقدمات کا دوران گھٹ رہا ہے اور ہونا بھی یونہی چاہئے۔ جب کسی سررشتہ کے عہدہ دار کے وقت اور مقام مقررہ پر ایک خاص قسم کا کام انجام دیں تو یقیناً اِن کا کام ایسے عہدہ داروں سے بہت زیادہ اور بہتر ہوگا۔ جن کے پیچھے کئی کئی کام لگے ہوئے ہیں اور جن کو اپنے دوسرے کاموں کی وجہ سے یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں پھرنا پڑتا ہے علاوہ ازیں فطرتِ انسانی بھی اس کی مقتضی ہے کہ اگر کسی عہدہ دار کے ذمّے کئی سررشتوں کا کام ہو تو ہمیشہ وہ اِسی سررشتہ کے کام کو زیادہ محنت۔ زیادہ تن دہی اور زیادہ شوق سے انجام دے گا۔ جس سررشتہ سے اِس کی ترقی وابستہ ہے۔ دوسرے سررشتہ کے کام کو وہ بیگار سمجھے گا۔ لیکن اِن کو چھوڑنا بھی نہ چاہیگا کیونکہ اختیارات کی وسعت کا شوق ہر شخص کے دل میں قدرتی طور سے ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ جتنے زیادہ سررشتے کسی عہدہ دار کے تحت ہوں گے۔ اتنے ہی اس کے اختیارات میں وسعت اور اس کے احکام میں زیادہ اثر ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں کوئی عہدہ دار نہیں چاہتا کہ انتظامی اور عدالتی اختیارات علٰحدہ علٰحدہ کر دیے جائیں۔ ایک تحصیلدار تھے۔ بیچارے کو

فوجداری میں درجۂ سوم کے اختیارات تھے۔ مگر اس پر
ان کو اتنا ناز تھا کہ بیان سے باہر ہے۔ کہا کرتے تھے
کہ دنیا میں انسانوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کو
فوجداری اختیارات ہیں اور دوسرے وہ جن کو فوجداری
اختیارات نہیں ہیں۔ ہاں تو میری بحث کا مطلب یہ ہے
کہ ایسے مشترک اختیارات والے عہدہ دار ایک طرف
تو عدالتی اختیارات کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ اور دوسری
طرف جس طرح کام کرنا چاہئے اس طرح کام نہیں کرتے
اور چونکہ ان کے تقرر اور ترقی وغیرہ کا تعلق راست
سررشتۂ عدالت سے نہیں ہوتا۔ اس لئے ان کے کام
نہ کرنے یا کام کو خراب کرنے کی وجہ سے ان سے پوری
طرح بازپرس بھی نہیں کی جاسکتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ
ایک طرف تو ان کے بروقت کام نہ انجام دینے کی وجہ
سے رعایا پریشان ہوتی ہے اور دوسری طرف ان پر
محکمۂ عدالت کا پورا دباؤ نہ ہونے کے باعث کام میں
اصلاح نہیں ہوتی۔ بہرحال جس پہلو سے دیکھئے گا
آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ عدالتی اختیارات صرف
ان ہی عہدہ داروں کو عطا ہونے مناسب ہیں جو بالراست
عدالت عالیہ یعنی ہائیکورٹ کے ماتحت ہوں اور جن کو
کسی انتظامی کام میں دخل نہ ہو۔ ریاست حیدرآباد نے
اس بارے میں صرف نیا راستہ ہی نہیں نکالا بلکہ

اعداد و شمار سے ثابت کر دیا۔ کہ یہی صحیح راستہ ہے یہی
قریب کا راستہ ہے اور اسی پر چلنے میں رعایا کو سہولت ہے۔
سررشتہ عدالت کی اصلاح کے لئے یہ بھی ضرور تھا کہ
اس کے عہدہ داروں کو اپنے فرائض سمجھنے کے علاوہ
اس کا بھی پوری طرح اطمینان ہو جائے کہ اپنے کام کے
متعلق نہ تو وہ سوا خدا کے کسی کے پاس جوابدہ ہیں
اور نہ ان کے فیصلوں میں بصیغہ انتظامی دست اندازی کا
کسی کو حق ہے۔ وہ بطور نائب بادشاہ اس کام کو انجام
دے رہے ہیں۔ اور ان کے فیصلوں میں اگر کوئی
طاقت ردوبدل کر سکتی ہے تو وہی طاقت کر سکتی ہے
جس کے عطا کئے ہوئے اختیارات وہ استعمال
کر رہے ہیں۔

یہاں ہم کو اصول قانون میں جانے کی ضرورت
نہیں ہے۔ اور نہ اس پر بحث کرنے کی حاجت ہے کہ
صرف عہدہ داران عدالت ہی بادشاہ کے نائب کیوں
سمجھے جاتے ہیں۔ ہاں اس قدر لکھ دینا کافی ہے کہ عدالت
کے علاوہ کسی ملک میں جس قدر اور سررشتے ہوتے
ہیں ان کی بنیاد کسی نہ کسی پہلو سے اصول تجارت پر
قائم ہوتی ہے۔ مثلاً محکمۂ مالگزاری کو دیکھ لیجئے۔ زمین
بادشاہ کی ہے اور محنت رعایا کی۔ جو آمدنی ہوتی ہے
وہ بلحاظ معاہدہ تقسیم ہو جاتی ہے۔ غرض آپ جس محکمہ کو

دیکھے گا۔ اس میں بھی اُصول پائیے گا۔ سوا عدالت کے جہاں خود لین دین نہیں کیا جاتا۔ دوسروں کے لین دین کا تصفیہ کیا جاتا ہے۔ جب سے دنیا قائم ہوئی آپس کے تصفیوں کے لئے انسانوں نے اپنے میں سے کسی نہ کسی کو اپنا سر پنچ ٹھہرالیا۔ اور یہی فیصلہ کرنے والے لوگ ملک کے تمدن اور ترقی کے ساتھ بڑھتے بڑھتے بادشاہ ہوگئے۔ جو اختیارات ان کو خود ان ہی کی رعایا نے دیے تھے وہ دو قسم کے تھے۔ ایک یہ کہ جب ہمارے آپس کے تعلقات میں کوئی پیچیدگی پڑ جائے تو اس کو سمجھایا جائے۔ یہ اختیارات دیوانی ہوئے۔ دوسرے یہ کہ جب ہمارے تعلقات کو درہم برہم کرنے کی کوشش کی جائے تو اس کو رفع کیا جائے۔ یہ اختیارات فوجداری ہوئے۔ غرض یہ دونوں اختیارات ہمیشہ بادشاہ وقت میں جمع رہے ہیں اور اس نے یا تو ان کو خود استعمال کیا ہے۔ یا اپنے دوسرے نائبین کے ذریعہ سے استعمال کرایا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی بڑے ملک یا سلطنت کا صرف بادشاہ ساری رعایا کے جھگڑے فیصل نہیں کرسکتا۔ اِس کی انجام دہی کے لئے اس کو نائب ہی مقرر کرنے پڑیں گے۔ یہ نائبین عہدہ داران عدالت ہیں لیکن تاوقتیکہ ان کو اپنی اصلی قوت کا اطمینان نہ ہوجائے وہ دلچسپی اور حوصلہ سے کام نہیں کرسکتے یہ

اطمینان تمام ممالک متمدنہ میں ایک فرمان شاہی کے ذریعہ سے دلایا جاتا ہے۔ اور اس فرمان کو Raval Charter یا منشور خسروی کہتے ہیں ریاست حیدر آباد میں سررشتۂ عدالت ہمیشہ سے قائم تھا عہدہ دار بھی تھے۔ فیصلے بھی کئے جاتے تھے۔ لیکن اس تناور درخت کی جڑ ہی نہ تھی۔ ہر اعلی انتظامی عہدہ دار اِس کے فیصلوں میں بلحاظ ضرورت ردّ و بدل کرسکتا تھا۔ اور ہر انتظامی محکمہ ان کو قبول کرنے یا نہ کرنے کا مجاز تھا۔ اعلیحضرت نواب میر عثمان علیخاں بہادر شہریار دکن ہی نے اس نقص کو محسوس کیا۔ اور اس کو اس طرح رفع کیا کہ منشور خسروی عطا کر کے سررشتہ عدالت کی بنیادیں مضبوط کردیں۔ ہائیکورٹ کی عمارت وہی ہے جو اس چارٹر کے ملنے سے پہلے تھی۔ عہدہ دار بھی وہی ہیں جو پہلے تھے۔ وکلاء بھی وہی ہیں جو سابق میں تھے۔ رعایا بھی وہی ہے جو پہلے تھی۔ مگر صرف ایک "دستاویز تفویض اختیارات" نے ان کی حالت کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ عہدہ داران عدالت اپنے فرض کی اس اہمیت کو سمجھ کر فیصلہ کرتے ہیں کہ جو کچھ ہم اس وقت لکھ رہے ہیں وہ فریقین کے حق میں قطعی ہے۔ وکلاء سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہم بحث کر رہے ہیں اسی پر ہمارے موکلوں کی قسمت کا دارومدار

اور رعایا سمجھتی ہے یہاں پہنچنے کے بعد جو کچھ ہوتا ہے
ہو جائے گا۔ اس کا فیصلہ ہماری دستاویز قطعی ہوگا
اور کسی محکمہ کو اس میں ترمیم و تبدل کرنے یا اپنے حسب مرضی قبول
کرنے یا نہ کرنے کا حق نہ رہے گا۔ غرض اس منشور
خسروی نے ایک طبقہ میں اگر احساس فرائض کی لہر
دوڑادی تو دوسری طرف رعایا کو بالکل مطمئن کر دیا۔
ایک طرف اگر ذمہ داری کو بڑھایا تو دوسری طرف اس کے
احکام میں وقعت پیدا کرکے دیگر محکمہ جات کی دستبرد سے
ان کو محفوظ کر دیا۔ بعض محکمہ جات اس منشور خسروی کی
اہمیت کو پوری طرح نہیں سمجھے تھے۔ اور چاہتے تھے
کہ کسی نہ کسی طرح عدالت کے فیصلوں کو قبول نہ کرنے کا
کوئی پہلو نکالیں۔ بہت سوچ سوچ کر یہ راستہ نکالا گیا کہ
معاملہ کا انتظامی رُخ دکھا کر بادشاہ وقت سے عدالت
کے فیصلے کے خلاف احکام حاصل کر لئے جائیں مگر عدالت
کی خوش قسمتی سے بادشاہ وقت اعلیٰحضرت نواب میر
عثمان علیخاں بہادر تھے۔ وہ سمجھ گئے کہ یہ کیا رنگ ہے
اور اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ چنانچہ ادھر تو انھوں نے منشور
خسروی کے تحت قانون ہائیکورٹ نافذ کر دیا اور ادھر
گورنمنٹ گزٹ (جریدہ اعلامیہ) کے ذریعہ سے تمام محکموں
کو آگاہ کر دیا کہ جب کوئی فیصلہ عدالت سے ہو جائے
تو پھر کسی طریقہ سے کوئی محکمہ میرے پاس ایسا کوئی
کاغذ نہ پیش کرے جس کی منظوری سے اس فیصلہ پر
ذرا بھی اثر پڑتا ہو۔ خود ان کو جو کچھ کرنا تھا وہ کر چکے۔ اب
سررشتۂ عدالت کا کام ہے کہ جو توقعات کہ انھوں نے
اس سررشتہ سے وابستہ کئے ہیں ان کو پورا کرے اور
ان کی خوشنودی کے ساتھ رعایا کی بہبودگی میں
کوشاں رہے۔

دنیا اسباب ظاہری کی پابند ہے۔ قاضی درخت
کے نیچے بوریا بچھا کر بھی فتوے دے سکتا ہے لیکن
جو وقعت فریقین کے دل میں دارالافتاء میں مسندِ
قضاء پر بیٹھ کر فتوے دینے والے قاضی کی ہوگی۔ وہ
اس درخت کے نیچے بیٹھ کر فتوے دینے والے قاضی
کی نہیں ہو سکتی۔ فریقین کے دلوں میں کسی محکمہ کے
احکام کی وقعت قائم کرنے کے لئے اس محکمہ کی ظاہری
شان کا قائم کرنا لازم اور ضروری ہے۔ شہریار دکن
نے اس پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ اس سررشتہ کی
سب سے اعلیٰ عدالت یعنی ہائیکورٹ کے لئے ایسی
عمارت تعمیر کرائی جس کا جواب حیدرآباد تو کیا تمام
ہندوستان میں بھی ملنا مشکل ہے۔ اس کی تعمیر میں
تقریباً (۲۷ لاکھ) روپیہ خرچ کیا۔ اس کو تخمیناً تین لاکھ
روپیے کے سامان سے آراستہ کیا۔ لیکن اس کے
ساتھ ہی اس امر کا بھی خیال رکھا کہ عمارت میں

نزاکت کے بجائے شکوہ اور زینت کی بجائے سادگی قائم رہے۔ عمارت اگر بلندی اور خوبصورتی سے لوگوں کی نظروں کو اپنی طرف کھینچتی ہے تو اس کے ساتھ ہی اپنی پائیداری اور سادگی سے اِن کے دلوں میں عدالت کا رُعب قائم کئے بغیر نہیں رہتی۔

اِس محکمہ کے لئے صرف ایک ہی عمارت بنانے پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ بلکہ تمام ریاست میں ہر درجہ کی عدالتوں کے لئے اِن کے شایانِ شان عمارتیں تعمیر کرنے کی ایک اسکیم منظور کی گئی۔ اِن میں سے اکثر تیار ہو چکی ہیں۔ کچھ بن رہی ہیں اور کچھ عنقریب شروع ہونے والی ہیں۔ اور وہ دن دور نہیں ہے کہ ایسی ایک عدالت بھی نہ ہوگی جو خود اپنی عمارت میں اجلاس نہ کرے یا ایسی عمارت میں اجلاس کرے جس کی ظاہری حالت اس کے وقار پر اثر ڈالے۔

اِس مختصر سے مضمون میں ریاست حیدرآباد کے سررشتۂ عدالت کا صرف خاکہ کھینچ دیا ہے۔ ورنہ اعلیحضرت نواب میر عثمان علی خاں بہادر کے عہد معدلت مہد میں جو جو ترقیاں دوسرے سررشتے تو کیا صرف سررشتۂ عدالت میں ہوئی ہیں۔ ان کے لئے بقولِ غالب۔

سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

غرض اس ریاست کے جس محکمہ کی رپورٹ اُٹھا کر دیکھوگے۔ یہی پاؤگے کہ ملک کی بہبودی اور انتظام کی درستی کے لئے اس حکمراں نے روپیہ اُٹھانے میں کبھی دریغ نہیں کیا۔ یہاں محکمۂ فینانس دریا کا حرف بند ہے۔ جو کچھ جمع ہوتا ہے وہ مختلف نہروں کے ذریعہ سے ملک اور رعایا کی سرسبزی کے لئے سارے کا سارا خرچ کر دیا جاتا ہے اگر چند لفظوں میں اس بیدار مغز بادشاہ کی سچی تعریف سننا چاہو تو مولانا حالی کی زبان میں سن لو

رعیت شاد و ملک آباد ——————

ادا حق کر دیا شاہ دکن نے حکمرانی کا

زندہ باد بادشاہ دکن!

ہیروں کی وادی

مسٹر مائیکل پم کی خاص اجازت سے طبع کیا گیا

مترجم: مسٹر عزیز احمد بی۔اے
مددگار ناظم سررشتۂ معلومات عامۂ سرکار عالی

جہازی کی داستان آپ نے پڑھی ہوگی
سندباد جس میں اس نے بتایا ہے کہ ہیروں کی وادی
سے جواہرات کس طرح نکالے جاتے تھے۔ اس کا بیان
ہے کہ تاجر گوشت کے بڑے بڑے لوتھڑے اس سانپوں
بھری عمیق اور پرخوف وادی میں پھینکدیتے تاکہ ان سے
ہیرے چمٹ جائیں اور جب عقاب انھیں اپنے آشیانوں
کی طرف لے اڑتے تو یہ لوگ ان کا پیچھا کرکے جواہرات
حاصل کرلیتے تھے۔

اسی واقعہ کو ایک اطالوی سیاح نکولودی کونتی نے
بھی دہرایا ہے جو پندرھویں صدی میں ممالک مشرقی
کے کئی چکر لگا چکا ہے اس کا بیان ہے کہ سال کے مقررہ
ایام میں لوگ بیلوں کو پہاڑوں پر چڑھاتے اور وہیں
تکہ بوٹی کرکے دوسری پہاڑیوں پر اُن کا گوشت
اس لئے پھینکدیتے کہ اس میں جواہرات چمٹ جایا کریں
چنانچہ جب شکاری پرند انھیں لے اڑتے تو ان کا تعاقب
کیا جاتا اور جس جگہ یہ گرے ہوئے بیش قیمت جواہرات
ملتے تھے اسی مقام کا اصلی نام **گولکنڈہ** ہے جو وسط دکن
میں اعلیحضرت حضور نظام کے زیر نگین ہے جنھیں دنیا
کی متمول ترین ہستی کہا جاتا ہے۔

گولکنڈہ میں جو شہر سے چند میل کے فاصلے پر ہے
جواہرات کی کانیں ہیں اور انھیں میں سے تاریخ کے
تقریباً تمام مشہور و معروف ہیرے برآمد ہوئے ہیں
سندباد سے قطع نظر، جو کچھ نکولودی کونتی نے دیکھا وہ
غالباً کانوں میں سے ہیروں کے نکالنے کا طریقہ

نہ تھا بلکہ وہ ایک قسم کی قربانی تھی جو دولت کی دیوی لچھمی کی یادگار پر ہر سال چڑھائی جاتی تھی۔ اس رسم کے مماثل اب بھی ریاست میسور میں سالانہ جشن کے موقعہ پر لوگ ایک بیل کو نگری کے ایک بلند حصہ پر چڑھایا کرتے ہیں اور اسے وہاں سے نیچے دھکیل کر موت کے گھاٹ اتار دیا کرتے ہیں۔

گولکنڈہ کا شہر دکن کے قطب شاہی سلاطین نے تعمیر کرایا تھا۔ ان میں سے ایک بادشاہ نے جو سولہویں صدی عیسوی میں برسرِ حکومت تھا موجودہ شہر حیدرآباد تعمیر کیا تھا۔ ان سلاطین کے عہد میں گولکنڈہ دنیا میں جواہرات کی سب سے بڑی منڈی کی حیثیت حاصل کر چکا تھا۔ اس کی کانوں کے اکثر قیمتی پتھر دنیا کے غیر مختتم ڈراموں میں فیصلہ کن حصہ لے چکے ہیں۔ مثلاً **کوہ نور** کو لیجئے جو عرصہ دراز تک برطانوی تاج کے جواہرات میں اوّلین حیثیت رکھتا تھا۔ وہ ۱۶۵۶ء میں دستیاب ہوا اور شاہجہاں کو نذر دیا گیا۔ اورنگ زیب کے جانشین محمد شاہ کے وقت تک وہ مغلیہ خاندان کے قبضے میں رہا جس کے بعد نادر شاہ نے شمال سے دھاوا بول کر دہلی کو لوٹ لیا۔ نادر شاہ کے قتل کے بعد یہ ہیرا اس کے قاتل شاہ رخ کے قبضے میں آیا اور اس نے اسے احمد شاہ بانی خاندان درّانی کی نذر کیا جس کا خاندان امان اللہ کے زوال تک افغانستان پر حکمران رہ چکا ہے شاہ شجاع کے عہد تک جس جس طرح کوہ نور افغانی بادشاہ کے قبضے سے دوسرے افغانی بادشاہ کے قبضے میں آتا گیا قتل و غارتگری اس کے ہمرکاب رہی رنجیت سنگھ والی پنجاب نے اسے اپنے جانی دشمن شاہ شجاع سے دھوکہ دیکر حاصل کر لیا۔ جب پنجاب برطانوی ہند میں شامل کر لیا گیا تو کوہ نور انگریزوں کے ہاتھ آیا اور ملکۂ ہند کے شاندار تاج کی زیب و زینت قرار پایا۔

"پال" جو ایک خونِ کبوتر یاقوت تھا **"بدرالجبال"** کے ساتھ دہلی کی لوٹ میں نادر شاہ کے ہاتھ لگا اور اس کے بعد اسی تاج کے جواہرات میں شامل کر لیا گیا۔ یہی بپتا **"آرلاف"** نامی لاثانی ہیرے پر پڑی جو گولکنڈہ کی کانوں میں سے برآمد ہوا تھا۔ ایک زمانہ میں آرلاف شرنگم کے مندر میں جو مدراس اور میسور کے درمیان واقع ہے ایک دیوتا کی آنکھ بنا ہوا تھا۔ ایک فرانسیسی سپاہی نے اسے اڑا لیا اور دس ہزار ڈالر میں بیچ ڈالا۔ شہزادہ آرلاف نے اسے ایک ایرانی سوداگر سے ساڑھے چار لاکھ ڈالر نقد اور بیس ہزار ڈالر سالانہ کی قیمت میں خرید لیا شہزادہ موصوف نے جو اس وقت کیتھرائن عظمیٰ کے دام گیسو میں اسیر تھا اسے اپنی محبوبہ کی نذر کیا۔ ملکہ نے

اسے اپنے عصائے سلطانی کے بالائی حصہ پر نصب کرالیا
کیتھرین کے ایک دوسرے عاشق زار پوٹمکین
نے اسے گولکنڈہ کا "یوجین" نامی ایک دوسرا ہیرا نذر
دیا تھا جو بعد میں نپولین سوم کے قبضے میں آیا اور اس
کی حکومت کے زوال کے بعد اس ہیرے کو مہاراجہ بڑودا
نے خرید لیا اور اس طرح وہ ہندوستان واپس آگیا۔
علاوہ ازیں سبز قدم ہیرا "امید" جو بعد میں
فرانسیسی تاج کے جوہرات میں سے چرالیا گیا تھا اور
"ریجنٹ" جسے ڈیوک آف اورلینس نے مدراس کے
گورنر پٹ سے خرید اتھا اور جو اب مقام لوورے میں ہے
گولکنڈہ ہی سے دستیاب ہوئے تھے۔ دوسرے دو نہایت
مشہور ہیرے جنھوں نے نصف دنیا کا چکر لگایا تھا آخر کار
ہندوستان واپس آگئے۔ ایک کا نام "اکبر شاہ" تھا
جو سلاطین مغلیہ کے سب سے بڑے تاجدار کی ملک تھا
اور جس کے حکم سے اس پر عربی عبارت کندہ کی گئی تھی
کچھ عرصے تک اس کا کوئی سراغ نہ لگا لیکن بعد میں
وہ قسطنطنیہ میں "سنگ شبان" کے نام سے نمودار ہوا
دوبارہ تراشنے کے بعد جس کے باعث اس کے وزن
میں بہت کمی ہوگئی اسے مہاراجہ بڑودا نے خرید لیا۔
دوسرے کا نام "سانسی" تھا جو سب سے پہلے
چارلس دی بولڈ کے قبضے میں آیا بعد ازاں اسے

سائبز دی سانسی نے ملکۂ الزبتھ کو بیچ ڈالا اور اس کے
بعد جیمس ثانی نے اسے کارڈنل مزارن کے ہاتھ فروخت
کر دیا۔ مزارن نے اسے لوئی چہاردہم کے نذر کیا۔ پھر
انقلاب فرانس کے دوران میں وہ چرالیا گیا لیکن معلوم
ہوتا ہے کہ اس کے بعد ڈمیڈاف خاندان تک اس کی
رسائی ہوگئی اور وہاں سے وہ پھر ہندوستان واپس آگیا
ان شہرۂ آفاق جواہرات کی فہرست حیرت انگیز
ہے۔ متذکرہ ہیروں کے علاوہ ایک اور مشہور و معروف
جواہر "دریائے نور" ہے جو ایرانی تاج کا سب سے بڑا
ہیرا ہے۔ اسے بھی نادرشاہ نے دہلی کی لوٹ میں حاصل
کیا تھا۔ دوسرا ہیرا "فلورنٹیائن" ہے جو آسٹریا کے
تاج کی زینت بنا ہوا ہے۔ ایک اور ہیرا "نجم الشرق"
ہے جو کسی زمانے میں آرچ ڈیوک فرانز فرڈیننڈ کی
ملک تھا۔ ایک اور "ڈریسڈن گرین" ہے جو سکزن
تاج کے جواہرات کا جزو تھا۔ وقس علیٰ ھذا
دکن کے خزانے بھی عجیب و غریب تھے دکن کے
پہلے حملہ آور علاؤالدین خلجی نے جب ۱۲۹۴ء میں نربدا
پار کر کے آخری ہندو تاجدار رام چندرا کو ہتیار ڈالدینے
پر مجبور کیا تو شکست یاب بدقسمت بادشاہ نے اپنے
فاتح کو چھ سو من موتوں کا تحفہ دیا۔ اس کے علاوہ اس نے
دو من بیش قیمت جواہرات از قسم یاقوت نیلم ہیرے وغیرہ

بھی نذر دئے۔ لیکن آہ! گولکنڈے کی آج کیا حالت ہے؟ وہاں اب ان جواہر ریز کانوں کا کوئی وجود نہیں ہے۔ البتہ سلاطین قطب شاہیہ کی شان ودبدبہ کے کچھ آثار چند خوشنما مقبروں کی شکل میں رہ گئے ہیں جن کی مضبوط اور عظیم الشان دیواریں اس خطہ زمین کی پاسبانی کر رہی ہیں جو کسی زمانہ میں دس لاکھ نفوس کی آبادی سے گلزار بنا ہوا تھا۔ اندرونی رقبہ میں اب کوئی مکان تک نہیں۔ ہاں صرف چند خاک آلود جھونپڑیاں نظام گولکنڈہ ٹروپس کے کوارٹر نظر آتے ہیں محل کا عظیم الشان قلعہ "بالا حصار" اس اجڑے دیار کے وسط میں آسماں بوسی کرتا ہوا نظر آتا ہے لیکن وہ بھی زمانہ کی بربادی کے ہاتھوں نالاں ہے، صرف اس کی چوٹی پر ایک عمارت محفوظ حالت میں استادہ ہے جہاں سے سیاح نواح کے وسیع صحرائی مناظر اور غروب آفتاب کا جلوہ دیکھ سکتا ہے۔ وہاں زندگی کے آثار سوائے ایک مختصر سے مندر کے جو مذکورہ عمارت کے پہلو میں ہے اور کہیں نہیں پائے جاتے۔ لیکن اسی چیز میں اہل نظر ہندوستان کا حقیقی رنگ جھلکتا ہوا دیکھتے ہیں یعنی یہی کہ ایک چھوٹا سا مندر جو مسلمانوں کے عہد سے پہلے موجود تھا ان کے عہد میں بھی قائم رہا اور اب جبکہ وہ بادشاہ محافظہ کے دھندلے نقوش کی پرچھائیاں بن چکے ہیں یہ مندر آج بھی جوں کا توں قائم ہے

ریاست حیدرآباد ہندوستانی ریاستوں میں سب سے بڑی سرکار ہے بلدہ حیدرآباد اس کا دارالخلافہ ہے۔ جو ہندوستان کے بڑے اور ممتاز شہروں میں چوتھے درجے پر سمجھا جاتا ہے۔ یہاں کے فرمانروا حضور نظام خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ معلیہ سلاطین کے وزیر اعظم حضرت میر قمر الدین اعلی اللہ مقامہ کی اولاد سے ہیں۔ حضرت ممدوح کو ہی نادر شاہ نے ہندوستان کی سلطنت پیش کی تھی جس پر آپ نے یہ فرما کر انکار کر دیا تھا کہ ہم لوگ خدمتگذار ہیں۔ میں بے وفائی کی بدنامی اپنے سر نہیں لے سکتا۔ یہ وہ چیز ہے کہ اور تو اور خود حضور ہی پیمان وفا کے توڑنے پر مجھ سے نفرت کرنے لگیں گے۔

قدیم سے تاریخ کے اوراق پارینہ میں سلطنت دکن کو علم و تمدن کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ پولی کے سن ثانی کے عہد میں جس کی نسل کے چلوکیا راجپوت بادشاہ دو صدیوں سے زیادہ حکمراں رہے، ایک چینی سیاح ہیون سیانگ نامی نے دارالسلطنت کا معائنہ

کرکے بادشاہ کے فوجی نظم ونسق اور اس کی رعایا کے انضباط پر حیرت وقدر دانی کا اظہار کیا ہے **ہیون سانگ** نے غارہائے **اجنٹہ** کے عجائب خانہ کے بھی ذکر کیا ہے جو آج تک دنیا میں نادرالوجود مصوری کی حیثیت سے زبان زد خلایق ہے۔ یہ غار چوبیس خانقاہوں اور پانچ عبادت گاہوں (**وہارا اور چیتیا**) پر مشتمل ہیں جنھیں ہلال نما دو سو انسٹھ فٹ اونچی عمودی چٹان میں کھود کر بنایا گیا ہے جس کے نیچے واگھرا ندی بہتی ہے۔ ابتدا جملہ غاروں میں مصوری کا کام کیا ہوا تھا لیکن اب **اعلیٰحضرت حضور نظام** کی سرپرستی میں سر اکبر حیدری کی خاص مساعی کے باعث ان کا کافی حصہ زمانہ کی دستبرد سے بچا لیا گیا ہے تاکہ آغاز عالم سے لے کر مغلیہ خاندان کے عہد تک کے ہندوستانی فن مصوری کے تمام وکمال مطالعہ کے لئے مواد فراہم ہوسکے۔

جدتِ تخیل، رنگ آمیزی، باریکی اور زور خیال کے اعتبار سے **اجنٹہ** کی تصویریں دنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتیں لیکن جس چیز نے انھیں اسقدر عجوبۂ روزگار بنا دیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ شخص واحد کا کام نہیں ہیں اور نہ انھیں کسی ایسے ماہر کاریگر نے ہی بنایا ہے جس کی تکمیل میں اس نے اپنے شاگردوں سے کوئی مدد لی ہو بلکہ وہ نامعلوم مصوروں کی متعدد نسلوں کی محنتوں کا پھل ہیں جنھیں آخر میں ایک بالکل یکساں اور مربوط کاریگری کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔

ان کے علاوہ غارہائے **ایلورا** ہیں جن کا تذکرہ شہرۂ آفاق عرب جغرافیہ دان **مسعودی** نے دسویں صدی میں کیا ہے۔ ان میں جین، بودھ اور ہندو مذہب والے تین گروہوں نے علی الترتیب پانچ، بارہ اور سترہ مندر تیار کئے ہیں اور یہ پورا کام پانچویں اور نویں صدی کے درمیان تکمیل پایا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ حیرت انگیز **کیلاسا** ہے جو غالباً تلنگانہ کے راشٹرا کتا خاندان کے بادشاہ **کرشنا** اول کے عہد میں بنایا گیا تھا۔ یہ ایک عظیم الشان یک سنگی مندر ہے جس کے اندر اور باہر منبت کاری کی گئی ہے اور جو دو سو ستر فٹ طویل اور ایک سو پچاس فٹ عریض صحن میں استادہ ہے یہ پوری عمارت صرف ایک چٹان میں سے کاٹ کر بنائی گئی ہے اور مندر کو باقی حصہ میں سے علیحدہ کر لیا گیا ہے۔

ہندوؤں کے فن معماری کے شاندار نمونے مندروں کی شکل میں تمام ریاست میں بکھرے ہوئے ہیں اور جب مسلمانوں نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو انھوں نے بھی اس میں اپنی جودتِ طبع کا ثبوت دیا

حیدرآباد کا چار مینار گلبرگہ کی **جامع مسجد** اور دولت آباد **کا چاند مینار** ہندوستان میں اسلامی صناعی کے نادر الوجود نمونے شمار کئے جاتے ہیں۔ شہر حیدرآباد سے جانبِ غرب بیدر میں ایک شاندار یونیورسٹی کے آثار پائے جاتے ہیں جو پندرھویں صدی میں تعمیر ہوئی تھی اس کا کتب خانہ "**فرشتہ**" کے زمانہ میں تین ہزار قلمی نسخوں سے مزین تھا اس کے اساتذہ کا انتخاب تمام ایشیا سے کیا گیا تھا۔ آج صرف اس کے کھنڈر پائے جاتے ہیں لیکن بایں ہمہ اس کے برآمدوں کی نفیس رنگین خشت کاری کے جو آثار ہیں ان کی وجہ سے اُس کی اصل خوبصورتی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

اس ملک کی مردم خیزی پہ حیرت ہوتی ہے جس نے نہ صرف ماہر فنون لطیفہ بلکہ بڑے بڑے فرمانروا اور ادیب پیدا کئے۔ اندھرا خاندان کا سب سے پہلا معروف بادشاہ "**ہالا**" اپنے ادبی کارناموں کے باعث نہایت مشہور تھا۔ وجنانیشورا جو متکشرا کا مصنف اور مشہور مقنن کہلاتا ہے **وکرماجیت** راجپوت بادشاہ کا درباری تھا **نظام الملک اولی** کا ذکر آچکا ہے اور غالباً ہندوستان میں **سر سالار جنگ اعظم** سے زیادہ قابل مدار المہام کسی ریاست نے پیدا نہیں کیا جنھوں نے انیسویں صدی کے وسط میں ساری مملکت دکن کے نظم و نسق کی اصلاح کی اور اسے موجودہ ترقی کے راستے پر گامزن کر دیا۔

ہندوستان جن دو[۲] یوروپینوں کو آج تک نہیں بھولا ان میں سے ایک **موسیو ریماند** ہے تو دوسرا **انکلسن** مائکل جے، ایم ریمانڈ فرانس میں ۱۷۵۵ء میں پیدا ہوا بیس سال کی عمر میں وہ **پانڈیچری آکر ٹیپو سلطان** کی سلک ملازمت میں شامل ہوگیا، یہاں سے نکل کر وہ بسی (Bussy) کے ساتھ ہوگیا جب کہ موخر الذکر ۱۷۸۳ء میں ہندوستان واپس آیا تھا بسی کا دو سال بعد انتقال ہوگیا، اور پھر ریمانڈ فوج کا کپتان ہوکر نظام حیدرآباد کے یہاں ملازم ہوگیا، ریمانڈ کا انتقال تینتالیس سال کی عمر میں ہوگیا لیکن اِن بیس برس کی مدت میں جو اس نے ہندوستان میں بسر کئے یہاں کے لوگوں کو اپنا اس قدر گرویدہ کر لیا تھا کہ اس کی یاد ابھی تک دلوں سے محو نہیں ہوئی ہے اور ہر سال اس کی برسی کے موقعہ پہ ہزاروں لوگ بشمول افواج بے قاعدہ جن کے پیشرو کی اس نے سیادت کی تھی مقبرے پہ جمع ہوکر اس کا ماتم کرتے ہیں یہ مقبرہ نہایت سادہ وضع کا ہے اس کے ۸۰ × ۸۰ فٹ چبوترہ پر ایک تیئس فٹ اونچی مخروطی مینار کھڑی ہوئی ہے جس پر کوئی کتبہ نہیں ہے، صرف اس کے نام جو جم ریمانڈ کے دو ابتدائی حروف ہے۔ آر کندہ ہیں اس مقبرے کے نزدیک ایک چھوٹی سی کھلی ہوئی

عمارت ہے جہاں زیب و زینت کی خاطر کچھ قندیلیں رکھی ہوتی ہیں۔ ہندوستان کی یہ خاصیت ہے کہ جب وہ ایکمرتبہ کسی سے محبت کرتا ہے اوراس پر اعتماد کرتا ہے تو وہ اسے پھر کبھی فراموش نہیں کرتا۔

ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے جب کہ اس موسیو ریمانڈ کی بدولت حیدرآباد میں فرانسیسوں کو بہت اقتدار حاصل تھا۔ اس کا نام اس طرح سے لیا جاتا ہے۔ کہ گویا وہ کل تک زندہ تھا فرانسیسیون نے حیدرآباد کی فوج کو تعلیم دی اوراس کی افسری بھی کی ریمانڈ کے پاس ایک ایسا فرانسیسی دستہ بھی تھا جس کی وردی آج تک میسرم میں رائج ہے۔ اسی زمانے میں ایک ایسا وقت بھی گزرا ہے جب کہ فرانسیسی فوج نے سب سے پہلے نظام کے فرزند **صلابت جنگ** کو کی تخت نشینی میں مدد دی تھی۔

اس کے بعد ہی برطانیہ کا ستارۂ اقبال چمکا اورانھوں نے صلابت جنگ کو تخت سے آتار کر نظام علی کو سریر آرائے سلطنت کردیا چنانچہ اخرالذکر نے برطانوی فوج لے کر ٹیپو سلطان پر چڑھائی کردی اوراس کا یہ نتیجہ ہوا کہ کچھ مزید حصہ ملک قبضہ میں آگیا۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد وہ پھر برطانیہ ہی کے قبضے میں چلا گیا۔ لیکن خیر یہ ایک دوسرے کم خوشگوار قصے کا ایک جزء ہے۔

بہرحال ایک مرتبہ برطانیہ سے وابستہ ہونے کے بعد حیدرآباد نے کبھی اپنے معاہدوں کی خلاف ورزی نہیں کی غدر کے ہیبت ناک زمانہ میں اس نے برطانیہ ہی کا ساتھ دیا اور پھر جنگ عظمیٰ کے موقعہ پر اس نے اپنے اہم اعلان وفاداری سے ہندوستان کے مسلمانوں کی بے چینی رفع کردی جس کے باعث برطانیہ کو روپیہ اور آدمی کثرت سے مل گئے۔ صرف نقد رقم کی صورت میں حیدرآباد نے پچاس لاکھ ڈالر اور قرضہ جنگ میں پانچ کروڑ چار لاکھ ڈالر دئے (ایک ڈالر تقریباً تین روپیہ کا ہوتا ہے) جب سنہ ۱۹۱۸ء کے رقمی خسارہ کے موقعہ پر حکومت ہند چاندی کے لئے ترس رہی تھی اورامریکہ سے ڈالر کی چاندی آنے میں وقفہ تھا تو حیدرآباد ہی نے پھر اس آڑے وقت میں دو کروڑ پارہ ہائے نقرہ سے اس کی مدد کی۔

ریاستوں کی زندگی کا دارومدار ان کی گزشتہ تاریخی عظمت ہی پر نہیں ہوتا ہے۔ موجودہ زمانہ کا حیدرآباد تہذیب و تمدن کے جدید اصولوں کا تجزیہ گاہ بنا ہوا ہے جو اپنی رفیع المرتبت کامیابی کے باعث حد درجہ دلچسپی کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں اوراسی باعث تمام ہندوستان کی نظریں ریاست پر جمی ہوی ہیں جو اپنے (۸۲۶۷۹) مربع میل رقبے کے باعث انگلستان اور اسکاٹلینڈ دونو کے مساوی ہے اور جس کی آبادی سوا کروڑ ہے۔

جوایک درجن سے زیادہ زبانیں بولتی ہے۔ اس کی وسعت اور دولت میں دیسی حکومت کی خوبیوں کی سیر حاصل مطالعہ کا کافی مواد موجود ہے، لیکن ہندوستانی آنکھیں اسے اس نقطہ نظر سے نہیں دیکھتیں۔ ایک نسبتہً مختصر حلقہ کے باہر عوام کو حیدرآباد کے متعلق بہت کم معلومات ہیں۔ انتہا پسند ہندو نظام کے خلاف ایک سیاسی پروپگنڈا پھیلانے میں مصروف ہیں اس لئے کہ ایک آخری اسلامی مرکز ہونے کے اعتبار سے وہ مسلمانان ہند کے ملجا وماوا قرار دئے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس وجہ سے فوق القدر خیالات رکھنے والے ہندو طلبہ کے لکھے ہوئے بعض ذلیل مضامین امریکہ کے اخبارات میں شایع ہوتے رہتے ہیں۔ برطانوی لوگوں کو حیدرآباد کے متعلق بہت کم معلومات ہیں جس کے سبب سے برار کے معاملات پر تعصب کا رنگ چڑھ گیا ہے۔

حیدرآباد کا موجودہ نظم ونسق ایک دستوری مطلق العنانی کی تعریف میں آسکتا ہے۔ سب سے اعلیٰ رتبہ حضور نظام کا ہے جنھیں ہر قانون یا مسودۂ قانون کو مسترد کر دینے کا کامل اختیار حاصل ہے اور جن کے رتبہ پر بحیثیت اپنی ریاست کے حاکم اعلیٰ ہونے کے ان اختیارات سے جو کونسل کو عطا کئے گئے ہیں یا ان قوانین سے جو وہ منظور کرے کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ اس کے بعد نظم ونسق ہے جو دو شعبوں قانونی اور انتظامی میں منقسم ہے مجلس وضع قوانین ریاست کے قوانین منظور کرتی ہے اور ایک صدر، ایک نائب صدر اور (۲۳) اراکین پر مشتمل ہے اس کا صدر باب حکومت کا صدر اعظم ہوا کرتا ہے جسے اپنے عہدہ کی وجہ سے یہ رتبہ دیا گیا ہے۔ اسی طرح اپنے عہدوں کی وجہ سے میر مجلس عدالت العالیہ، معتمد عدالت اور سرکار عالی کے مشیر قانونی مجلس ہذا کے اراکین ہیں۔ باقی بیس اراکین اس اختیار کے ساتھ دو سال کے لئے مقرر ہوتے ہیں کہ بعد ختم مدت دوبارہ مقرر کرلئے جا سکیں۔ ان میں سے نو عہدہ دار ہیں اور بقیہ گیارہ غیر عہدہ دار موخر الذکر فہرست میں سے دو ایسے جاگیرداروں کا ہونا لازمی ہے جن کا علاقہ کسی قسم سے زیر بار نہ ہو اور اس کے محاصل دو ہزار ڈالر سالانہ سے زیادہ ہوں۔ ان اراکین کا انتخاب دوسرے جاگیردار آپس ہی میں کرلیا کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں دو اراکین عدالت العالیہ کے وکلاء آپس میں سے منتخب کرلیتے ہیں ایک مجلس صفائی حیدرآباد کا نمایندہ ہوتا ہے، دو اضلاع کے اور چار خود صدر کی جانب سے نامزد کئے جاتے ہیں۔

(باقی آیندہ)

تہنیت سالگرہ مبارک حضرت اقدس و اعلیٰ خلد اللہ ملکہٗ

از جناب غلام محمد خانصاحب ایجادؔ

عمرت دراز و سالگرہ ساز گار باد — ایام در نہادہ بدستت برار باد

فتح و ظفر معاونِ جاہت زگرد و پیش — تائیدِ غیب در ہمہ جا دستیار باد

آئندہ جشنِ سالگرہ باہمہ تو زک — ایزد چناں کند کہ بملک برار باد

در سنگلاخ و وادی و ہامون و کوہسار — ہر جا کہ پانہی ز قدومت بہار باد

پیرایۂ حکومتِ سرکار عالیت — لطفِ عمیم و معدلتِ خوشگوار باد

مشہور در مذاق و بسرمایۂ علوم — ایں دولتِ خجستہ بدار العیار باد

مثلِ فلک خمیدہ جبینِ مہانِ عصر — بر خاکِ بارگاہِ تو لے شہریار باد

نقشِ وفائے تو بدلم باد جاگزیں — بدخواہ و بیوفائے تراسر بدار باد

ایجاد ہر دعا کہ تو گفتی بحقِ شاہ

مقبول باد و موجبِ عز و وقار باد

طریق ترجمہ اور اس کے اصول

از جناب مولوی محمد عنایت اللہ صاحب ناظم دار الترجمہ سرکار عالی

دنیائے ادب میں ترجمہ کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ بلحاظ فن یہ وہ پیچیدہ خارزار ہے جس میں عموماً ارباب علم کا دامن اس طرح الجھ جاتا ہے کہ پھر بجز خار و خس ان کے تراجم میں اور کچھ نظر نہیں آتا۔ اس کے اہم فرائض روشنی بیان وصفائی مفہوم، جامعیت الفاظ، نزاکت بیان، حسن ادا، تکمیل مطالب اور واجبی اختصار سے وابستہ ہیں مگر افسوس ہے کہ اردو ترجمے ان خاص اوصاف سے عموماً معرا نظر آتے ہیں بلکہ اکثر اوقات اجنبی زبانوں سے ترجمہ کئے ہوئے الفاظ معمے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جن کی ناموزوں تراکیب ذوق سلیم پر بار ہوتی ہیں ہم اپنے فاضل محترم مولوی محمد عنایت اللہ صاحب کے بیحد ممنون ہیں جنھوں نے اصولی حیثیت سے طریق ترجمہ اور اس کے اصول پر مبصرانہ نقطۂ نگاہ سے بحث کی ہے۔ اور اس موقر مضمون نے ایک ایسی شاہراہ قائم کر دی ہے، جو اخلاف کے لئے رہنما ثابت ہوگی۔ صاحب موصوف نے یہ اصول ترجمہ ایک صاحب ذوق کے استفسار پر جوابی حیثیت سے سپرد قلم فرمائے ہیں اور ہم بیحد مسرور ہیں کہ ہمجولی کے صفحات آپ کے فیضان سے مستفید ہو رہے ہیں۔

جنابِ مکرمی۔ تسلیم!

عنایت نامہ مورخہ ۶ر ہی موصول ہوا۔ میری نسبت جو حسن ظن جناب نے فرمایا اس کا تہ دل سے ممنون ہوا آپکے

ہمجولی

سوالات بہت دلچسپ ہیں۔ لیکن حیران ہوں کہ ان کے جواب کیا لکھوں۔ بہرکیف ترجمے کے متعلق جو دو چار باتیں ذہن میں ہیں عرض کرتا ہوں۔ یہ ضرور نہیں کہ

کوئی ان سے اتفاق کرے۔

آئیڈیل درحقیقت کسی چیز کی کمال کی ایک ذہنی تصویر یا نمونے کا نام ہے ذہن مختلف ہیں اس لئے کمال کے نمونے بھی ان میں مختلف ہیں ترجمے کے آئیڈیل کی دو مثالیں میرے ذہن میں ہیں۔

۱۔ یورپ کی درسگاہوں کے اکثر تعلیم یافتہ ترجمے کا کمال اسی میں سمجھتے ہیں کہ لفظ کی جگہ لفظ ہو بلکہ ایک ہی لفظ کی جگہ ایک ہی لفظ ہو۔ فقروں کی ترکیب بھی ہمیشہ اصل سے مطابق ہو اس میں اردو کے قواعد سے بھی قدم ڈگ جائے تو مضائقہ نہیں۔ اگر پڑھنے والا مطلب نہ سمجھے تو اسے سمجھایا جائے اور یہی وہ رستہ ہے جو منزل مقصود تک پہنچا سکتا ہے اور یہی وہ طریق ہے جو کمزور اردو زبان کو توانا و طاقتور بنا سکتا ہے۔ بغیر اس کے اردو ایک علمی زبان نہیں بن سکتی۔ یہ لوگ مجبور ہو کر مغربی علوم کی قربان گاہ پر اردو کو ذبح کرنا کار ثواب جانتے ہیں۔ مگر ان کا آئیڈیل ایسا زبردست ہے کہ گو دل پر کیسی ہی چوٹ لگے مگر اسے کہیں نہ کہیں ماننا ضرور پڑتا ہے۔

۲۔ دوسرا آئیڈیل یہ ہے کہ کسی حال میں بھی ادب کا دامن ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ یہ پہلے آئیڈیل کو اپنی زبان کی تخریب و تذلیل قرار دیتا ہے۔ پاؤں پھیلانے میں چادر کو اتنا نہیں تاننا چاہتا کہ چادر پھٹ جائے۔ اس آئیڈیل کے ماننے والوں کے نزدیک بہترین طریقہ ایسی کتابوں کے ترجموں کا جو مطلقاً اصطلاحی علوم کی نہیں ہیں یہ ہے کہ انگریزی فقرے کا مفہوم بالکل صحیح طور پر سمجھا جائے اور پھر اس مفہوم کو اپنی زبان میں اس طرح ادا کیا جائے کہ عبارت شروع ہی سے اپنی زبان کی لکھی معلوم ہو۔ یہ کام اکثر موقعوں پر نہایت دشوار ہوتا ہے بعض مفہوم ایسے ہوتے ہیں کہ ہزار کوشش کیجئے مگر جس صورت میں وہ سمجھ میں آئے ہیں بعینہ اسی صورت میں اپنی زبان میں ادا نہیں ہوتے مگر اس میں بھی کہیں کہیں ذہن غلطی کرتا ہے۔ بہرکیف دشواریاں ہیں اور ان کی وجہ ظاہر ہے۔ انگریزی زبان میں الفاظ کی کثرت اور ہر چیز کو منطقی اسلوب پر بے کم و کاست بیان کرنے کی ترکیبیں ایسی موجود ہیں جو ہماری زبان میں نسبتاً کم ہیں۔ اس آئیڈیل کے ماننے والے اردو کو کچے شیشے کا ایک ظرف سمجھتے ہیں جو زیادہ گرم یا سرد پانی بھرنے سے ٹوٹ جانے کا اندیشہ رکھتا ہے۔ یہ لوگ زبان کی پاسداری میں اور ادبی ضرورتوں کے لحاظ سے مفہوم میں کمی بیشی پیدا ہو جانے کو کوئی بڑا گناہ نہیں سمجھتے بشرطیکہ اپنی زبان کا حسن ادا جس قدر بھی ہو سکے ظاہر ہو جائے۔

میرے خیال میں پہلے آئیڈیل کی پابندی سے
بالخصوص اصطلاحی علوم میں مثلاً ریاضی سائنس ۔ قانون
وغیرہ میں گریز کرنا عبث ہے ۔ دوسرا آئیڈیل ایسی کتابوں
کے ترجموں میں مدنظر رکھنا ضروری ہے جنہیں ادب
سے زیادہ تعلق ہے مثلاً تاریخ ۔ جغرافیہ ۔ فلسفے کی بعض
شاخیں ۔ سیرت وغیرہ وغیرہ ۔

ترجمے کے اچھے برے ہونے کا اندازہ بھی دو طریقوں
سے ہوتا ہے ۔ ایک یہ کہ صرف ترجمہ پڑھتے چلے جائیے
اگر مطلب صاف سمجھ میں آرہا ہے ۔ بیان کی خوبی اور
قوت دونوں چیزیں عبارت میں موجود ہیں اور اسکا
علم بھی ہے کہ ترجمہ پڑھ رہے ہیں تو ایسے ترجمے کی تعریف
بے اختیار زبان سے نکلے گی اور وہ اچھا ترجمہ ہوگا ۔
اگر بیان میں کوئی خوبی نہیں ہے ۔ فقرے بے ربط ہیں
غیر مانوس الفاظ ۔ کریہ الصوت جملے ۔ حل طلب ترکیبیں
آئی ہیں خواہ اصل سے مفہوم کتنا ہی قریب ہو وہ ترجمہ
خراب سمجھا جائے گا ۔ دوسرا طریقہ اندازہ کرنے کا
(اور خدا اس سے پناہ میں رکھے) یہ ہے کہ ترجمہ کا اصل
سے مقابلہ کرتے ہوئے چلئے ۔ پھر دونوں زبانوں کے
فرق کی وجہ سے مشکل سے کوئی ترجمہ ایسا نظر آئے گا
جس میں اعتراض کی گنجائش نہ نکلتی ہو ۔ اس صورت
میں ایک مدرسہ کا لڑکا بھی ایک عالم کے ترجمے پر
حرف گیری کرسکے گا ۔ اور یہ حرف گیری ایسی ہوگی کہ جواب
دینا مشکل ہو جائے گا ۔ اس طریقہ سے ترجمہ کا اندازہ کریں
جو ماہرین فن ہیں انھیں کا قول قول فیصل ہو سکتا
ہے ۔ عام ناظرین تو جس وقت ترجمہ کے سمجھنے میں ذرا
بھی مشکل پیدا ہوگی ترجمہ اور مترجم دونوں پر لعنت
بھیجیں گے ۔

مترجم کا فرض ہے کہ اصل کا صحیح مطلب سمجھ کر اپنی
زبان میں صفائی اور سلاست سے اسے بیان کرے
جہاں تک ممکن ہو اپنی زبان کی خوبی سے بے پروا نہ ہو
اس طرز پر ترجمہ کرنے کی مشکلات کثرت سے ہیں انگریزی
سے اردو کے مترجم کو جو چیز سب سے زیادہ پریشان
کرتی ہے وہ انگریزی زبان کے ایڈجیکٹو Adjective
اور ایڈورب اور ایک ہی فقرہ میں جملے کے ساتھ جملے
جوڑ کر بہت دور جا کر خبر نکالنے کے متعدد طریقے ہیں
اردو تو عمر اور کم مایہ زبان ہے ۔ اس میں اسم و فعل
جسقدر قریب ہوگا اسیقدر زبان فصیح ہوگی ۔ جس قدر
ضمیریں کم آئیں گی اسیقدر مطلب جلد سمجھ میں آئیگا
بار بار پیچھے مڑ کر دیکھنے میں راہ کھوٹی نہ کرنی پڑیگی
طرز جدید کی انگریزی میں بھی لمبے فقروں سے پرہیز
ہونے لگا ہے لیکن پرانے انشاپردازوں کے ہاں
فقروں کا طول قیامت خیز ہوتا ہے ۔ اور اب بھی

اگر ضرورت ہو تو اس سے پرہیز نہیں۔ ایسی صورتوں میں مترجم کا کام ہے کہ فقرے کو اس کے اجزا میں تحلیل کردے۔ پھر اپنے قواعد کے مطابق ان میں سے چند کو جوڑ کر جہاں جڑ سکیں اور چند کو علحدہ فقرے بنا کر ترجمہ کرے۔ درخت بھی ہے اور درخت کی بہت سی شاخیں بھی ہیں۔ پورا درخت مع شاخوں کے اپنی زبان میں ادا نہیں ہوتا اس لئے بعض شاخوں کے علحدہ پودے لگانے پڑتے ہیں مگر مترجم کی خوبی اس میں ہے کہ یہ پودے درخت ہی کے سایہ میں اس طرح رہیں کہ انہی کی شاخیں معلوم ہونے لگیں اسطرح آپ مطلب صاف کردینگے مصنف کو آپ سے شکایت نہ ہوگی۔ مگر اس طرز میں ضروری ہے کہ اپنی زبان پر پوری قدرت ہو ورنہ بیجا کمی بیشی کا ارتکاب ممکن ہے۔

اس کے علاوہ مترجم کے لئے ایک بات اور نہایت ضروری ہے۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ دو فقروں کا جو یکے بعد دیگرے آتے ہیں صحیح ترجمہ ہو گیا ہے لیکن جو ربط دونوں فقروں میں انگریزی میں ہے وہ ترجمے میں پیدا نہیں ہوا۔ یہ ترجمہ کا سخت عیب اور مترجم کی نالایقی سمجھی جائے گی۔ تھوڑی سی توجہ سے دوسرے فقرے میں لفظوں کے الٹ پھیر سے یہ عیب رفع ہو سکتا ہے۔ اسیطرح ایک پیرے گراف سے جہاں تعلق ہو اپنی زبان میں بھی متعلق کرنے میں غفلت نہ کیجائے کچھ اشارہ اس خیال کی طرف کرکے جس کے سلسلے میں دوسرا پیرے گراف آیا ہے ترجمہ شروع کیا جائے۔ ضمیروں پر پورا بھروسہ نہ کیا جائے اردو زبان اس کی بہت کم متحمل ہے انگریزی مصنف اپنی زبان پر قادر ہے مترجم کو بھی اسی قدرت کے پیدا کرنے میں غفلت نہ کرنی چاہئے۔ مطلب اس کا ہے زبان اپنی ہے۔ جب تک پورے طور پر اس کے ہم خیال نہ بن جائے گا اس کے مفہوم کو بیان کرنے سے قاصر رہیگا۔ ترجمہ میں غفلت کی یہ شکایت نہ پیدا ہونے پائے۔

اس قسم کی خامیاں ہیں جن سے ترجموں کو پڑھکر سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ جب تک زیادہ غور نہ کیجئے باوجودیکہ اپنی ہی زبان ہوتی ہے مگر مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ اس تضیع اوقات کے بعد جب مطلب سمجھ میں آیا تو معلوم ہوا کہ اس میں تو کچھ بھی نہ تھا۔ یہ بات تو اسطرح بھی آسانی سے کہی جا سکتی تھی۔ مگر ہمیشہ یہ کہکر بھی آپ اپنا اطمینان نہیں کر سکتے۔ اگر مترجم نے بات آسان کرکے کہدی ہے تو مصنف کا کچھ مطلب ضرور چھوڑ دیا ہے۔ درخت کی بعض شاخوں کی تصویر بنائی رہگئی بہرکیف اگر پڑھنے والے کو مطلب کے سمجھنے میں زیادہ محنت کرنی پڑے تو وہ اسے ناواجب زحمت سمجھکر مترجم

کو الزام دے گا۔ چھوٹی باتوں کو بڑا سمجھ کر ترجمہ میں زیادہ کوشش اور بڑے مطلبوں کو ادا کرنے میں صرف انگریزی الفاظ کی پابندی کرنا اور عبارت کو چیستان بنا کر اپنا پیچھا چھڑانا درست نہیں ہے۔ اگر مترجم خود مطلب نہیں سمجھا ہے تو پھر ترجمہ کرنا سراسر بے ایمانی ہے اگر سمجھ میں آگیا ہے تو اس کو سچ سچ بے تکلف ادا کرنا لازمی ہے۔ یہاں اگر اپنی زبان پر قدرت ہے تو یہ کام آسان ہے ورنہ اس کے برابر کوئی مشکل اور عبث چیز نہیں۔ جہاں مطلب سمجھ میں آگیا وہاں مصنف کے زور بیان سے مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں ترجمہ میں مترجم زبان کے فرق سے قطع نظر کر کے مصنف کا درجہ رکھتا ہے۔ جو چیز میں سمجھ گیا وہ چیز میری ہوگئی۔ پھر انگریزی عبارت کے خوف سے اپنی زبان بگاڑنے کی ضرورت نہیں۔

تھوڑی سی ذہانت اور جرأت سے ترجمے کے بہت سے عیب رفع ہو سکتے ہیں یہ جرأت کن چیزوں سے پیدا ہوتی ہے۔ مطالعہ سے۔ گو آپ کیسے ہی ماہر فن ہوں مگر کسی خاص کتاب کا ترجمہ شروع کرنے سے پہلے اس کے مضمون سے ضرور بخوبی آشنا ہو جائیں اس مضمون پر اور کتابیں کبھی مشکل اور کبھی آسانی سے ملجائیں گی۔ ضرورت اس کی ہوگی کہ بہت سا وقت ان کے مطالعہ میں صرف کیجئے۔ جب مضمون پر آپ کو قدرت ہوگئی تو پھر ترجمے کے وقت مصنف کے منہ سے بات نکلتے ہی آپ سمجھ جائیں گے کہ آگے کیا لکھنا چاہتا ہے۔ اب آپ کو ترجمہ کرنا آسان ہو جائے گا۔ اور جو کچھ لکھئے گا اس میں صحت روانی اور بے تکلفی پیدا ہو جائے گی۔ کوئی کتاب تا وقتیکہ اس کے مضمون سے اور کتابیں پڑھ کر اپنے کو مانوس نہ کر لیں ہرگز ترجمہ شروع نہ کیجئے۔ مطالعہ اور مطالعہ بھی زیادہ اچھا ترجمہ کرنے کے لئے ضروری شرط ہے۔

تاریخ کے ترجمے کا مجھے کسیقدر تجربہ ہے۔ اس کی نسبت یہ عرض ہے کہ جس ملک کی تاریخ کا ترجمہ کیجئے جب تک اس ملک کا جغرافیہ اور جغرافی نقشہ سامنے نہ رکھ لیجئے ترجمہ شروع نہ کیجئے۔ میں کبھی کسی تاریخ کا ترجمہ اپنے اطمینان کے قابل نہیں کر سکا جب تک کہ شہروں قلعوں پہاڑوں اور دریاؤں کے موقعے نقشہ پر نہ دیکھ لئے۔ آپ کی اس زحمت سے آپ کے ترجمہ پڑھنے والے کو براہ راست کوئی نفع نہیں پہنچا لیکن ترجمے میں آپ کو مدد مل گئی اور وہ اس طرح کہ طبیعت بند نہ رہی۔ جہالت کا بادل پھٹ گیا۔ واقعات اس طرح قلم سے نکلنے لگے جیسے چشم دید ہوں۔ اب یہ نہ ہوا کہ مصنف گھوڑے پر سوار ہے۔ راستہ جانتا ہے اور مترجم

بیدل راہ سے ناواقف ہے۔ اب مضمون ہمرکابی کا ہو گیا مگر یہاں یہ خوف ہے کہ آپ مصنف سے آگے نہ نکل جائیں اور اپنی معلومات کے زور پر مصنف سے بھی زیادہ نہ لکھ جائیں۔ ایسا ہو گا۔ لیکن جب دوبارہ فقرے پر غور کیجئے گا تو مصنف ہی کے الفاظ مضمون کو صحیح بیان کردینے کے لئے ترجمے میں کافی ہو جائیں گے۔ اسیطرح تلمیحات جو انگریزی عبارتوں میں علم کی کثرت کی وجہ سے بہت زیادہ آتی ہیں ان کو ترجمہ کرنے سے پہلے کتابوں میں تلاش کر کے اور ان کو اچھی طرح سمجھ کر ذھن میں رکھئے۔ ترجمہ کے وقت خود بخود آپ انھیں اس طرح بیان کر جائیں گے کہ پڑھنے والے کو مطلب سمجھنے میں دقت نہ ہوگی۔ محض ایک مختصر سا نوٹ حاشیہ پر یا متن میں عبارت کے سلسلے میں ایک آدہ فقرہ خطوط ہلالی میں کل مضمون کو روشن کر دے گا۔

ڈکشنری دیکھنے سے کبھی دل نہ چرائیے۔ یہ بہت بڑی خطا ہے۔ ڈکشنری وہیں بکار آمد نہیں ہوتی جہاں لفظ کے معنی نہ معلوم ہوں بلکہ اچھے لفظ کی تلاش میں بار بار ناامید ہونے کے بعد بھی اسے دیکھنا پڑتا ہے۔

انگریزی سے اردو ترجمہ کرنے میں ذیل کی کتابوں کو دیکھنا لازمی ہے۔

(۱) ڈکشنری انگریزی سے انگریزی میں۔ تاکہ انگریزی لفظ کے تمام معنی پر عبور ہو جائے۔

(۲) ڈکشنری انگریزی سے اردو میں۔ تاکہ اردو لفظ معلوم ہو۔

(۳) انگریزی سے فارسی اور عربی کے لغت تاکہ اردو ڈکشنری میں جو فارسی یا عربی لفظ آگئے ہیں اور وہ کام کے نہیں معلوم ہوتے ان کے فارسی یا عربی مترادف الفاظ دیکھے جائیں ممکن ہے کہ کوئی لفظ ڈھنگ کا ملجائے۔ فارسی اور عربی لغات سے اس بارے میں اکثر اچھی مدد مل جاتی ہے۔

(۴) تلمیحات کی ڈکشنریاں قصص اصنام جو لغت کی صورت میں لکھے گئے ہیں۔ بیوگرافیکل ڈکشنریاں تاکہ تاریخی لوگوں اور مشاہیر کے حالات معلوم ہو سکیں۔

(۵) انسائیکلوپیڈیا جس سے نمبر ۴ کے بہت سے عقدے حل ہوتے ہیں۔ مگر سب نہیں۔

(۶) اٹلس نئے اور پرانے مشہور شہروں کے خاکے اگر کسی پرانے شہر کا ذکر آیا ہے۔

(۷) مشہور تعمیروں کا اگر ذکر آیا ہے تو انکی تصویریں جہاں کہیں ملیں ضرور دیکھئے۔ انگریزی مصنف تاریخوں میں بہت کچھ جغرافی نقشوں اور تصویروں کی مدد سے عبارتیں اس طرح لکھ جاتے ہیں کہ نقشہ

سامنے آجاتا ہے۔ پھر جو کچھ مصنف نے کہا ہے مترجم
کو بھی چاہیئے کہ اتنی ہی زحمت گوارا کرے۔
جس مضمون کی کتاب ترجمہ کرنی ہے اس کے
مضمون سے دوسری کتابوں سے کماحقہ واقفیت
پیدا کرنے میں کاہلی فقرے کا صحیح مفہوم سمجھنے، لفظ کے
صحیح معنے معلوم کرنے یا مناسب لفظ کی تلاش میں
سستی مترجم کو نالائق ثابت کر دے گی۔ اور اگر مطلب
سمجھنے میں غلطی ہے تو پھر مرتے دم تک اس کی ندامت
سے چھٹکارا نہیں۔ اگر ہزار فقرے صحیح ترجمہ کئے ہیں
اور ایک فقرے کا مطلب غلط سمجھ لیا تو یہ ایک غلطی
ہزار صحیحوں پر بھاری ہوگی۔ ایسی غلطیوں سے مترجم
کو ڈرنا اور بچنا چاہیئے۔ ایک منٹ کی غفلت سے
مہینوں کی محنت غارت ہو جائے گی۔ مگر اچھے سے
اچھے مترجموں سے بھی یہی ہوتا ہے۔ غیر معاف کر دیتے
ہیں مگر اس کا دل معاف نہیں کرتا۔

ترجمے میں جلدی نہ کیجئے مگر پیٹ ایسی بری بلا ہے
کہ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے مگر جو لوگ ترجمہ کے پیدائشی مریض
ہیں وہ ایک ایک فقرے کے سوچنے میں کئی کئی دن
صرف کر دیتے ہیں۔ ترجمے کے فقروں کو بار بار کاٹ
کر فقرے کی بہتر شکل پیدا کرتے ہیں اور پھر بھی اطمینان
نہیں ہوتا۔ اور کام مشق سے آجاتے ہیں۔ ترجمے میں
مشق کے بعد بھی "ہنوز روز اول" کا مضمون رہتا ہے
بعض ذہین مترجم جن کی قوت گرفت بڑھی ہوئی
ہے ترجمہ صاف لکھتے چلے جاتے ہیں۔ فقرہ دیر میں
لکھتے ہوں مگر کاٹنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ
مستثنٰے صورتیں ہیں۔ لیکن میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ
جب تک ایک بار ترجمہ کر کے پھر اس ترجمے کو خود
لکھکر صاف نہ کرے ترجمہ درست اور اچھا نہیں
ہوتا۔ جلدی میں اکثر یہ خرابی ہوتی ہے کہ انگریزی کے
فقرے اکثر بڑے ہوتے ہیں۔ پہلی مشکل تو یہ ہوتی ہے
کہ انھیں کہاں سے شروع کرے۔ پھر ایک ہی فقرے
میں ذیلی فقرے اتنے ہوتے ہیں کہ اگر ذرا بھی عجلت
کی تو کوئی نہ کوئی بات چھوٹ جاتی ہے۔ مترجم اپنا
فقرہ درست کرنے کے بعد مطمئن ہو جاتا ہے لیکن
ترجمہ ناقص رہتا ہے۔ مقابلہ کرنے والا بہت خفا
ہو کر بدر نکالتا ہے۔

ترجمہ کرنے کے بعد اس کو پڑھیئے۔ میں تو اکثر
کمرہ بند کر کے زور زور سے پڑھتا ہوں پڑھنے
میں جہاں زبان رکے سمجھ لیجئے کہ خامی ہے۔ اس
پھانس کو نکالئے۔ میرے ایک معزز استاد نے ایک
مرتبہ نصیحت کی تھی کہ "فقرے کی آواز درست
کر لو گے تو مطلب بھی درست ہو جائے گا۔" یہ

نصیحت زیادہ تر بکار آمد اس وقت ہوتی جب اپنی ہی زبان میں خود انسان کوئی بات لکھتا ہے۔ ترجمے کے ساتھ ہمیشہ درست نہیں۔ لیکن جہاں تک ترجمہ کی زبان کا تعلق ہے اس نصیحت کا ضرور خیال رکھنا چاہئے۔

ترجمہ کو بالعموم آسان کام سمجھا جاتا ہے۔ جو لوگ اردو کی مشکلوں سے واقف ہیں وہ تو مترجم کی نقل نویس سے زیادہ عزت کرنے کو ایک ناواجب سی بات سمجھتے ہیں۔ مگر ترجمہ آسان کام نہیں ہے۔ بالخصوص انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنا اور ایسا ترجمہ کرنا کہ وہ ایک مستقل تصنیف ہو نہایت دشوار ہے۔ انگریزی اور اردو زبانوں میں کچھ ایسا اختلاف ہے کہ اسے بیان کرتے بن نہیں پڑتا۔ شاید انگریزی اور یورپ کی اور زبانوں میں اتنا فرق نہو اور وہاں ترجمہ کرنا آسان کام ہو۔ مگر یہ بھی درست نہیں معلوم ہوتا کیونکہ انگلستان کے ایک بڑے عالم کا قول ہے کہ "اپنا ہی خیال اپنی زبان میں صحیح طور پر خوبی سے بیان کرنا مشکل ہوتا ہے چہ جائے کہ غیر کا خیال غیر زبان میں کہا ہوا اپنی زبان میں ادا کرنا۔" اس عالم کو اگر اردو اور انگریزی کا فرق معلوم ہوتا تو شاید وہ اپنے اس قول میں اور بھی زیادہ قوت پیدا کر دیتا۔ ترجمہ کی نسبت یہ بھی کسی کا قول ہے اور بہت صحیح ہے کہ ترجمہ ایسی محنت ہے جو کسی کے شکریہ کی مستحق نہیں گو یہ مقولہ مترجم کی ہمدردی میں کہا گیا ہے مگر اس سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ شکریہ کا مستحق دراصل مصنف ہے۔ مترجم کا کام صرف اس کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کا ہے اور یہ کوئی بڑا کام نہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ جہاں ایک قوی زبان سے کمزور زبان میں خیالات منتقل کرنے کی خدمت کسی کے سپرد ہوتی ہے تو یہ خدمت تصنیف سے بھی اکثر مقامات پر چہار چند دشوار ہو جاتی ہے۔ وقت اور دماغ مصنف سے بھی زیادہ مترجم کو صرف کرنا پڑتا ہے۔ اور مترجم کی خدمت ایک علمی خدمت ہوتی ہے۔ نقل نویسی نہیں رہتی۔ مترجم کو کم و بیش وہی مدارج طے کرنے پڑتے ہیں جو مصنف نے کئے ہیں بشرطیکہ وہ اپنے ترجمے کو اپنی زبان میں وہی عزت بخشنی چاہتا ہے جو انگریزی زبان میں انگریزی کتاب کو ہے میرا خیال ہے کہ جو لوگ ترجمے کو آسان سمجھتے ہیں ان کو یا تو ترجمہ کا تجربہ نہیں یا علم کی قدر نہیں۔

گھر کا نہ گھاٹ کا

از جناب مرزا عبدالحمید بیگ صاحب بی۔اے۔بی۔ٹی (علیگ)

اس قسم کے مضامین رسالہ ہٰذا کی جان ہیں اس لئے جملہ اصحاب قلم سے استدعا ہے کہ وہ براہِ کرم زیادہ تر اسی نوعیت کے مضامین ہمجولی میں اشاعت کے لئے بھیجا کریں۔ سر دست دیگر مقالات کو محض اس اُمید میں جگہ دی جا رہی ہے کہ شاید ہمارا دلی مقصد رفتہ رفتہ پورا ہو جائے اور وہ طبقہ اس طرف مائل ہو جائے جو بفضلِ خدا اس باب میں اپنے اعلیٰ مضامین اور تراجم سے نہ صرف ہماری امداد کر سکتا ہے بلکہ اس کی تحریروں میں ایسا جادو بھرا ہوا ہے جن کی بدولت آنِ واحد میں نئی پود کی کایا پلٹ ہو سکتی ہے۔ ہم مرزا عبدالحمید بیگ صاحب کے بے انتہا ممنون ہیں کہ وہ اپنے سرکاری فرائض کی انتہائی مصروفیات کے باوجود بھی ہمجولی کے صفحات میں ایسا بیش قیمت لٹریچر فراہم کرنے کی ٹھان چکے ہیں جو بے انتہا دلچسپی سے پڑھا جا رہا ہے خدا کرے کہ ان کی سعی موفور مشکور ہو اور ان کے حسبِ دلخواہ ملک کے نوجوانوں میں ایسی بیداری پیدا ہو جائے تاکہ وہ اپنے مستقبل کو اچھی طرح دیکھ سکیں۔

کیا ہم دیگر بی۔ٹی حضرات سے التماس کر سکتے ہیں کہ وہ بھی اس عملی میدان میں آکر اپنی قابلیت کا مظاہرہ فرمائیں گے

ہمجولی

عام قاعدہ تو یہی ہے کہ گھوڑا گاڑی کو کھینچتا ہے لیکن جس ملک کا باوا آدم ہی نرالا ہو وہاں اگر گاڑی سے گھوڑے کو کھچوایا جائے تو بھی کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ یقین نہ ہو تو ہماری زندہ مثال ملاحظہ فرما لیجئے یعنی اصولاً تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ دورانِ تعلیم میں جب وقت ہم سنِ شعور کو پہنچ گئے تھے تو اُس وقت ہم کو تعلیم کے

مقصد سے آگاہ کر کے ہماری بعینہٖ تعلیم کی تکمیل اسی مقصد کے تحت کرائی جاتی۔ مگر جیسا کہ ہم کہیں عرض کر چکے ہیں ہماری تعلیم کی تو شان ہی نرالی تھی۔ لہذا ہمارے ناخدایانِ تعلیم کی ستم ظریفی کو تو ملاحظہ فرمائیے کہ ہماری کشتیٔ تعلیم پورے (۱۴) سال تک بحرِ علوم میں ڈگمگاتی رہی مگر کسی اللہ کے بندے کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ وہ اس سفر کی غایت اور منزلِ مقصود سے ہم کو واقف کر کے ہماری رہنمائی کرتا۔

خوش قسمتی کہئے یا محض اتفاق کہ ہم عام معیار کے مطابق اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد مدرسہ کے بچوں کی خاطر جب ہم کو ایک سال اور اس کی نذر کرنا پڑا تب کہیں جا کر ایک محترم استاد کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ وہ ہمارے طبعی رجحانات کا لحاظ رکھتے ہوئے ہماری اندرونی قوتوں کی نشو و نما اس طرح سے کرے کہ ہم ہر اعتبار سے آدمی بن جائیں تاکہ جس وقت طالب علمی دنیا سے نکل کر زندگی کے طوفانی سمندر میں داخل ہوں تو اپنے آپ کو کشمکش حیات کے لئے پوری طرح تیار پائیں اور زندگی کے خواہ کسی شعبہ میں قدم رکھیں کامیابی و کامرانی ہمارا ساتھ نہ چھوڑے بلکہ ہم جس کام میں ہاتھ ڈالیں ترقی کی راہیں خود بخود ہمارے سامنے کھلتی چلی جائیں اور ہم زمانہ میں روزی کے لئے پریشان نہ ہوں۔

اس تعریف کو معلوم کرنے کے بعد اب جو ہم نے اس کی روشنی میں اپنی تعلیم کا جائزہ لیا تو اللہ کے فضل سے اپنے آپ کو بالکل صفر ہی پایا۔ یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ قصور ہمارا ہے کہ ہم میں یہ خصوصیات مفقود ہیں یا تعلیم کی اس تعریف ہی کی خطا ہے کہ وہ ہم پر صادق نہیں آتی۔ بہرحال نتیجہ واحد ہے یعنی ہم کورے کے کورے ہیں البتہ ہم اپنے تعلیمی معماروں کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ انہوں نے گو مکان تو کچی مٹی کا بنایا مگر اوپر سے اس کو اس طرح لیپ پوت دیا کہ بظاہر دیکھنے میں ایک نہایت خوشنما عمارت معلوم ہونے لگا حالانکہ اس کی پائداری کی یہ حالت ہے کہ حوادث کے ایک تھپیڑے کی بھی تاب نہیں لا سکتا۔

بہرکیف ہم اس کو سوائے اپنی بدقسمتی کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ دوسرے ملکوں میں تو تعلیم کی یہ خصوصیت ہو کہ اس کے اختتام پر اعلیٰ درجہ کے انجنیر سائنس داں اور ماہرانِ فن پیدا ہو جائیں اور ہمارے یہاں اس کی یہ حالت ہو کہ باوجودیکہ ہم نے اپنی عمر کے پورے (۱۵) سال اس کی نذر کئے اور اپنی عزیز ترین اشیاء یعنی دماغ اور بصارت تعلیم کی اس ہوشربا دیوی کی بھینٹ چڑھائیں مگر پھر بھی سوائے منشی گیری کے اور کوئی ہنر یا فن ایسا ہاتھ نہ آیا جو آڑے وقت کام آتا۔ چنانچہ ہماری حالت یہ ہے کہ آجکل عام کساد بازاری

کی وجہ سے جو ایک ہل چل مچی ہوئی ہے ہم اس کی آواز و ں ہی سے سہمے چلے جاتے ہیں کہ اگر خدانخواستہ ہماری کشتیٔ ملازمت بھی تخفیف کی بھنور میں آ گئی تو کیا حشر ہو گا کیونکہ یہ یورپ تو ہے نہیں کہ وہاں حکومت پیٹرول یا اسی قسم کی اور دوسری تعیشات پر محصول بڑھا کر اپنی کمی کو پورا کرے اور غریبوں پر اس کا اثر نہ پڑنے دے یہاں تو نزلہ ہمیشہ عضو ضعیف ہی پر گرتا ہے اس لئے آج کل ہم بھی رات دن اسی اُدھیڑ بُن میں رہتے ہیں کہ اگر خدانخواستہ اس لپیٹ میں آ گئے تو کیا ہو گا شاید یہ روز گاری کے ہاتھوں بھوکوں ہی مرنا پڑے کیونکہ ہم میں تو اتنی بھی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی ہے کہ نوکری ڈھو کر اپنا پیٹ پال سکیں۔ خدا بھلا کرے اس نظام تعلیم کا۔ کہ اس نے ذہنیت کو اس قدر بدل دیا ہے کہ کام کرنا تو درکنار اس کے خیال ہی سے طبیعت گھبراتی ہے اماں اور تو اور غضب یہ ہے کہ اسٹیشن پر جاتے وقت ہینڈ بیگ سنبھالنے کے لئے بھی قلی کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گا۔ تجارت سے ہم کو کوئی شوق و دلچسپی نہیں۔ زراعت سے ہم کو کوئی واسطہ نہیں صنعت و حرفت سے ہم کوسوں دور ہیں۔ بس لے دے کے ایک سرکاری ملازمت رہ گئی ہے جس پر ہم فدا ہیں۔ مگر خدا سلامت رکھے کالج کے نوجوان طلبا کو کہ اب یہ ملازمت

بھی عنقا ہوتی چلی جاتی ہے۔ ہر سال سینکڑوں کی کھیپ نکلتی ہے آخر کہاں تک کھپت ہو گی۔ جس کو دیکھو ادھر ہی گھسٹا چلا جاتا ہے۔ بھیڑیا چال ہے کہ ایک نے جدھر منہ اٹھایا سب اُسی طرف ہو لئے گویا کہ سوائے اس ایک راہ کے اور کوئی میدان ہی نہیں۔ لیکن اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو ملازمت میں کچھ بھی نہیں ہے۔ صرف خیال ہی خیال ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم سے کہیں زیادہ تو ہیر کٹنگ سیلون والا کما لیتا ہے۔ ادھر ہم اپنی شان ہی شان میں مرے جاتے ہیں۔ مگر در اصل اس میں ہمارا کچھ قصور نہیں۔ ہماری تعلیم کا ڈھنگ ہی کچھ ایسا ہے کہ سوائے ملازمت کے اور کسی طرف رغبت ہی نہیں ہوتی۔ حد تو یہ ہے کہ ایک کسان کا لڑکا بھی تعلیم پانے کے بعد اپنے آبائی پیشہ سے نفرت کرنے لگتا ہے اور اسی غلامی کی جستجو میں سرگرداں پھرتا ہے اور اس کی وجہ بھی معقول ہے یعنی یہ کہ اول تو اس انوکھی تعلیم کے کارن ہماری ذہنیت ہی تبدیل ہو جاتی ہے دوسرے ہم میں کسی کام کرنے کی صلاحیت بھی پیدا نہیں ہوتی۔ بس خالی خولی ڈگریوں پر اتراتے پھرتے ہیں ورنہ لیاقت و یافت تو اللہ کا نام ہے۔ مگر اس پر دماغ کی یہ حالت ہے کہ اپنے سے بڑھ کر کسی کو سمجھتے ہی نہیں اور ظاہری ٹیپ ٹاپ میں تو

جس روز سے انگریزی پر اُمر ختم کی ہے بس عین میں انگریز
بن گئے ہیں گو رنگت کالی سہی مگر رہتے اس قدر باقاعدہ
یعنی "اپ ٹوڈیٹ" ہیں کہ بڑے بڑے ولایتی صاحبوں
کو مات کرتے ہیں۔ سوٹ سے ورے پرے تو بات کرتے ہی
نہیں حتیٰ کہ عیدین کی نماز میں بھی اس لباس میں شرکت
کرتے ہیں کیونکہ اوّل تو اس سے جاہلوں پر بہت رعب
پڑتا ہے دوسرے اپنی انگریزیت کا بھی اعلان ہو جاتا
ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہماری وضع قطع بول چال
غرضکہ ہر چیز پر موجودہ تہذیب نے اس بُری طرح تسلّط
جما لیا ہے کہ ہم مجبور ہو گئے ہیں جیسا کچھ ملاحظہ ہو۔ رات کو
کوپی جاماز Pyjamas پہن کر سوتے ہیں۔ صبح
اٹھنے کے ساتھ ہی سرہانے سے سگریٹ کی ڈبیہ نکال کر
منہ کی کثافت دور کرتے ہیں۔ پھر بستر میں لیٹے ہی لیٹے
"بوائے" کی آواز لگاتے ہیں۔ فوراً کلو حاضر ہوتا ہے
گرم گرم چائے کی ایک پیالی پیش کرتا ہے۔ اس کو پینے
کے بعد بدن میں ذرا گرمی آتی ہے تو ہم بستر سے باہر
نکلتے ہیں کہ اتنے میں معدہ سے ٹیلیفون آتا ہے اور ہم
کموڈ پر بیٹھ کر اس کا جواب دیتے ہیں وہاں سے نکل کر
ڈاڑھی مونچھیں صاف کر کے گویا بھلے مانسوں کی شکل
بنتے ہیں۔ منہ ہاتھ دھونے کے بیسن میں پانی بھرا ہوتا
ہے ہم اس کے اوپر جھک کر چھپا چھپ منہ دھوتے ہیں
(مہینے میں ایک آدھ مرتبہ ٹب میں بیٹھ کر پانی بھی گھنگو
لیتے ہیں) اس عرصے میں کلو میز پر چھوٹی حاضری چن
دیتا ہے اور ہم کرسی پر ڈٹ کر نوش جان کرتے ہیں۔
وہاں سے اٹھ کر سنگار میز کے سامنے جاتے ہیں۔ نہایت
نفاست سے بالوں کی پٹیاں جماتے ہیں دو تین دفعہ
کھولنے و باندھنے کے بعد تو کہیں ٹائی درست ہوتی ہے
اس کے بعد جو پام بیچ کا سوٹ پہنکر۔ اوپر کی جیب میں
ایک اعلیٰ درجہ کی ریشمی دستی آدھی اندر آدھی باہر رکھ کر
منہ سے دھوئیں کے چھلّے اڑاتے اور ہاتھ ٹائی پر پھیرتے
ہوئے ہم گھر سے نکلتے ہیں تو بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ
صاحب سیدھا ولایت سے چلا آرہا ہے اور بہت سے
جاہل تو سوٹ سے مرعوب ہو کر ہم کو خواہ مخواہ سلام بھی
کر لیتے ہیں جس کے جواب میں ہم گردن منکا کر اپنی
انگریزی تہذیب کا ثبوت دیتے ہیں۔ اگر کسی سے
مصافحہ کرتے ہیں تو اس کی انگلیاں پکڑ کر اس طرح
جھنجھوڑتے ہیں گویا کہ ہاتھ میں سے برقی رو گزر رہی
ہے اور بات کرتے ہیں تو ہمیشہ اپنی آقائی زبان یعنی
انگریزی میں۔ لیکن اگر بدقسمتی سے کسی کالے آدمی سے
دیسی زبان میں گفتگو کرنی پڑ ہی گئی تو زبان کو اس طرح
توڑ مروڑ کر الفاظ ادا کرتے ہیں کہ اُس سے بحر اسود
کے غوطہ کے آثار بالکل نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی

غریب راستہ میں ہمارے مدمقابل ہوگیا تو اس پر نہایت حقارت آمیز نگاہ ڈال کر اور مغرورانہ لہجہ میں "یو۔ڈیم کدھر دیکھنی مانگتا" کہہ کر اس بچارے کو ایک طرف ڈھکیل دیتے ہیں۔مختصر یہ کہ جس وقت ہم انگریز نما بن کر نکلتے ہیں تو یقین مانئے کہ ہم کو اپنے آپ کو ہندی کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے اور جس چیز پر بھی ہندی کا اطلاق ہوتا ہے اُس کو اپنے لئے باعثِ ننگ سمجھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اگر اپنی ضرورت کو بھی کوئی شئے خریدنی مطلوب ہو تو کسی بڑی "شوپ" میں جاتے ہیں اور ولایتی چیز کی فرمائش کرتے ہیں گو یہ دوسری بات ہے کہ دیسی چیز کو ولایتی کے دھوکہ میں خرید لائیں مگر معلوم ہونے کے بعد تو ایسی غلطی ہرگز نہیں کرتے۔آپ یقیناً اس کو بُرا کہیں گے مگر ہم مجبور ہیں۔کیونکہ ہماری تعلیم ہی کچھ اس ڈھنگ سے ہوتی ہے کہ ہم کو اپنے ملک سے کچھ محبّت ہی نہیں پیدا ہوتی۔تاریخ ہند ہم نے ضرور پڑھی ہے بلکہ ایک دفعہ نہیں تین چار دفعہ۔ چنانچہ محمود کی بت شکنی۔سراج الدولہ کا واہیات پلیک ہول اور اورنگ زیبی ظلم و ستم سیواجی کے مکاری اور شقاوت رنجیت سنگھ کا تعصّب سب زبان کی نوک پر ہیں مگر دماغ پر ہنیبر از ورڈ الٹتے ہیں یاد ہی نہیں آتا کہ کہیں حب وطنی کے متعلق بھی کچھ پڑھا ہے یا نہیں اور نہ

کسی ہندی محبِّ وطن کا کچھ کارنامہ یاد آتا ہے ایسی صورت میں اگر آپ ہم سے یہ توقع رکھیں کہ ہم اپنے وطن وابنائے وطن سے محبّت کریں۔ اپنے ملک کے رسم ورواج کے پابند ہوں اور اپنی قومیت پر نازاں ہوں تو بھلا کیسے ممکن ہے۔یہاں تو معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے یعنی ہم سرزمین ہند اور اس کے رہنے والوں سے اس قدر بیزار ہیں کہ اگر بس چلے تو اس بدبخت ملک کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہدیں اور ولایت میں جاکر بودوباش اختیار کریں مگر صرف انجام سے ڈرتے ہیں کیونکہ ایک دوست کی قابل رحم حالت کا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔غریب کو شروع ہی سے ولایت جانے کا بے حد شوق تھا۔بی اے پاس کرنے کے بعد والد کو مجبور کرکے مکان کے کوڑے کپڑے اور دانتوں کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ولایت تشریف لے گئے چار پانچ سال وہاں کی آزاد فضا میں سانس لیا۔اس کے بعد مجبوراً واپس آنا پڑا۔چنانچہ واپس آئے مگر بالکل بدلے ہوئے۔اوّل تو اکہرے گئے تھے دوہرے ہوکر آئے یعنی ایک میم صاحبہ گلے پڑ گئیں۔ دوسرے ہندی ذہنیت پر ولایتی تہذیب کا اتنا زبردست ملمع چڑھا کہ یہاں کی ہر چیز تاریک و بدمزہ معلوم ہونے لگی۔چنانچہ جس وقت واپسی کے بعد

پہلی مرتبہ اپنے وطن پہنچے تو اپنے گھر والوں کو بھی اطلاع نہیں دی۔ ہوٹل میں مقیم ہوئے۔ بچارے باپ کو بھی پتہ چلا محبّت پدری نے جوش کھایا اور باپ بیٹے سے ملنے کے لئے ہوٹل پہنچا۔ سعادت مند بیٹے کو باپ سے ملنے میں بھی تکلف ہوا۔ بچارا باپ پرانی تہذیب کا آدمی تھا اسی وضع قطع سے ملنے آیا۔ صاحب بہادر تو ولایتی تہذیب کے نشہ میں سرشار تھے بھلا اس کو کیسے گوارا کر سکتے تھے۔ بہ ہزار دقت باپ سے ملنے کے لئے باہر تشریف لائے۔ ٹوٹی پھوٹی اُردو میں مزاج پُرسی کی اور بہت ضروری کام کا عذر کر کے اُن کو جلد رخصت کر دیا۔ میم صاحبہ کے استفسار پر باپ کو اپنے خاندان کا نہایت قدیم و نمک خوار ملازم بتا کر اپنی شان برقرار رکھی۔ معلوم ہوتا ہے اللہ میاں کو یہ گستاخی پسند نہ آئی اور صاحب بہادر کو اس کی سزا بھگتنی پڑی یعنی گو ولایت میں انھوں نے کسی نہ کسی طرح ڈگری تو حاصل کر لی تھی مگر ہندوستانی اتنے ناقدرے ثابت ہوئے ہوئے کہ بچارے کی قدر ہی نہیں کی۔ اور میاں کو اپنی صاحبی برقرار رکھنی مشکل ہوگئی۔ میم صاحبہ نے جو یہ رنگ دیکھا تو اُن کی بھی عقل ٹھکانے آگئی۔ سمجھیں کہ بڑی غلطی کی جو اس کے ساتھ یہاں آئی۔ چنانچہ اول کشیدگی ہوئی اور بالآخر میم صاحبہ نے سیدھا ولایت کا رُخ کیا مگر صاحب بہادر کی آمدنی پر ماہانہ ٹیکس لگا گئیں۔ اول تو آمدنی ویسے ہی کم تھی اس ٹیکس نے اور رہا سہا کام خراب کر دیا اب تو میاں جی کا مزاج بحال ہوگیا اور صاحبی کا سب نشہ کافور ہوگیا۔ آخر پھر دیسی ہی بنگئے اور باپ کے گھر واپس ہونا پڑا۔

بس ہم کو بھی یہی ڈر ہوتا ہے کہ کہیں ہمارا حشر بھی ان ہی جیسا نہ ہو ورنہ دل کی خواہش تو یہی ہے کہ ہم بھی ولایتی اور ولایتی کے باپ بن جائیں۔ فقط

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے
بنگلہ بھی ہے پرا بھی ہے صابون بھی ہے
لیکن میں یہ پوچھتا ہوں تجھ سے ہندی
مغرب کا تری رگوں میں کچھ خون بھی ہے

سمدھن کا گڈا

دوسرا جواب

ازجناب مرزا عصمت اللہ بیگ صاحب

ہمجولی کے گزشتہ نمبر میں مرزا عصمت اللہ بیگ صاحب کا ایک نہایت دلچسپ اور پرمذاق "خطبہ" شائع ہو کر بیحد مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ آج ہم حسب وعدہ ان کی وہ جوابی نظم پیش کرتے ہیں جس میں انتہائی دقت نظر سے کام لے کر مرزا صاحب موصوف نے اس مسئلہ کو پوری طرح حل کرنے کی کوشش کی ہے جس کے مطالعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انھیں اصلاحی خیالات کو اصلی لطافت کے ساتھ مزاحی رنگ میں پیش کرنے کی کیسی انوکھی قدرت حاصل ہے۔ ہیں در اصل اسی قسم کے "شافی" جوابات کی ضرورت ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ نظم ہر طرح اشرفی کے قابل ہے مگر ہمیں ابھی دیگر شعرا کے زوایائے نگاہ بھی بغور تعمق دیکھنے مقصود ہیں اس لحاظ سے بھی کچھ توقف ضروری ہے تاکہ قارئین کرام کے متفقہ فیصلے ہی سے انعام کا تصفیہ کیا جا سکے اس لئے یہ سلسلہ ابھی کچھ دن اور جاری رہیگا اور ہمجولی کے اگلے نمبر میں بیگم صاحبہ محمد علی تحصیلدار سیرٹم کا دلچسپ جواب درج کیا جائے گا جس میں دکھایا گیا ہے کہ بعض اعلیٰ خاندانوں میں کس طرح ادنی طبقے کی لڑکیاں بار پا جاتی ہیں **ہمجولی**

جو سنتا ہے کہتا ہے سمدھن سڑن ہے	خدا جانے جھگڑے کے اسباب کیا ہیں
جو سمدھی ہیں اُن میں بھی دیوانہ پن ہے	یہ روٹھے ہیں اُن سے وہ اِنسے خفا ہیں
کبھی ان کا دولہا تو اُن کی دلہن ہے	کبھی یہ ہیں ملتے کبھی وہ جدا ہیں
تلون ہے دونوں میں چرچا یہی ہے	زبردست گڑبڑ گھٹالا یہی ہے

بیاں کی وہ سمدھی نے گڈے کی صورت
کہ سب سننے والوں کو ہوتی ہے حیرت
مگر کچھ نہ فرمایا گڑیا کی نسبت
کہ یکطرفہ ڈگری ہیں ہوتا ہی ہے

نہ دونوں کا دل ہے۔ نہ سر ہے نہ بھیجا
ہے دونوں کی چار ابرُوں کا صفایا
لیا ہے صفائی کا دونوں نے ٹھیکہ
وہ ہیں فارغ البال چرچا یہی ہے

ہماری نظر میں ہے دونوں کا نقشہ
یہ بندی خدا کی وہ بندہ خدا کا
ہمیں ہی مُروت کا کچھ پاس آیا
کہ آدم سے آدم کا رشتہ یہی ہے

نہ گڈے کو ڈاڑھی منڈانا پڑے گا
نہ گڑیا کو زلفیں کٹانا پڑے گا
حجامت کا دونوں کے پیسہ بچے گا
بڑا اس زمانے میں خرچہ یہی ہے

بتاتے ہیں دونوں کی ہم شکل وصورت
دکھاتے ہیں ہم سب کو دونوں کی ہیئت
کہ شاید نکل آئے شادی کی صورت
سخن کا ہمارے خلاصہ یہی ہے

لکھائی پڑھائی میں خاصہ ہے گڈا
نہیں آتا گڑیا کو پر لکھنا پڑھنا
نہ کھانا پکانا نہ سینا پرونا
بزرگوں کی غفلت سے ہوتا یہی ہے

وہ صورت میں ہیں ایک سے ایک اعلیٰ
وہ ہیئت میں ہیں ایک سے اک زیادہ
اِک آلو ہے اُن میں اِک آلو بخارا
کہ بچوں کا بھلا نمونہ یہی ہے

ہیں دولہا دلہن دونوں ہندوستاں کے
محبت کے بھوکے اطاعت کے بندے
ہیں کم عقل پر ہیں دیانت کے پتلے
اثر خاکِ ہندوستاں کا یہی ہے

نہ گڈے کی آبرو۔ نہ مونچھیں نہ ڈاڑھی
نہ گڑیا کی پلکیں۔ نہ زلفیں نہ چوٹی
نہ لب ہیں نہ دنداں زباں ہے نہ ٹھوڑی
بہر شکل صورت کا خاکہ یہی ہے

نصیحت بزرگوں کی یہ مانتے ہیں
ہر اک کو وہ اپنا بڑا جانتے ہیں
اطاعت کو اک فرض گردانتے ہیں
لڑکپن سے اُن کا طریقہ یہی ہے

لٹادو جہاں تم وہ لیٹے رہیں گے
بٹھادو جہاں تم وہ بیٹھے رہیں گے
ہر اک شئے کو حیرت سے تکتے رہیں گے
اطاعت گزاروں کا شیوہ یہی ہے

شب و روز رہتے ہیں بیدار دونوں
ہیں جام محبت سے سرشار دونوں
نہیں آنکھ جھپکاتے زنہار دونوں
کہ الفت کے ڈورے میں رشتہ یہی ہے

ہیں دونوں کے دونوں محبت کے بھوکے
ہیں دونوں کی آنکھوں میں الفت کے ڈورے
سدا رہتے ہیں دونوں ہاتھوں کو کھولے
کہ ہو جائے شادی تمنا یہی ہے

بفضل خدا دونوں بچے جواں ہیں
وہ ہمشکل۔ ہمرنگ اور ہم زباں ہیں
وہ بے مثل ہیں ایسے ہوتے کہاں ہیں
ہزاروں میں بس ایک جوڑا یہی ہے

بڑی دھوم سے پہلے یہ بات ٹھہری
کہ گڑیا سے گڈے کی ہو جائے شادی
مگر یک بیک رسم پھر توڑ ڈالی
شریفوں کا بتلاؤ شیوہ یہی ہے؟

ہماری تو یہ سن کے ہمت ہوئی پست
کہ ہے سمدھیانہ کا ہر شخص بدمست
سنا ہے "ہمہ خانہ این آفتاب است"
بس اب روئیں کس کس کو رونا یہی ہے

وہ مشاطہ بھاگی ہے جو دُم دبا کے
اُڑاتی ہے بے پر کی ہر وقت آ کے
ہوائیں لگاتی ہے پھندے بلا کے
جو پوچھو تو شیطاں کی خالہ یہی ہے

ہے ان سب کے ہاتھوں میں سمدھن کی کنجی
نہیں فرق گڑیا و سمدھن میں کچھ بھی
وہ کپڑے کی مورت یہ لکڑی کی پتلی
سُنا ہم نے تازہ لطیفہ یہی ہے

یہ غیروں کی ہے سب لگائی بجھائی
جو ڈالی ہے دو سمدھنوں میں بُرائی
جہیز اور موٹر پہ ٹھہری لڑائی
پڑا عقد میں آکے پھندا یہی ہے

کسی نے یہ سلگایا پیٹرول جل کر
کہ دولہا ہے بے علم نوکر نہ چاکر
نہ گھر بار ہے بگھی نہ ٹمٹم نہ موٹر
لڑائی کے چکر کا پیتہ یہی ہے

کسی نے ٹکا سی زباں یہ ہلادی
گرہ میں نہیں سمدھیانے کے کوڑی
نہیں قرض دیتا انھیں مارواڑی
شب و روز سمدھی کو رونا یہی ہے

خدا کے لیئے ان خیالوں کو چھوڑو
اور اسراف سے اپنے ہاتھوں کو روکو
نمایش کی رسمیں بہرحال توڑو
؎ بام ترقی کا زینہ یہی ہے

نمایش کے میداں میں لاکھوں کو دیکھا
؎ مونچھوں پہ ہے تاؤ گھر میں ہے فاقہ
اگر دیکھو تو ایک سادہ لفافہ
؎ اس لاٹ کا کچا چٹھا یہی ہے

بہت ایسے ہیں صاحب بوٹ و کالر[1]
تلاشی اگر لے کوئی اُن کی۔ جا کر
تو نکلیں گے دو سوٹ اور دو سلیپر
؎ صاحب کے گھر کا اثاثہ یہی ہے

کرو اب تو کم اپنے اکسپینڈیچر
نکالو نہ تم پاؤں چادر سے باہر
قدم گر نکالا۔ تو کاٹیں گے مچھر
کفایت شعاری کا خطبہ یہی ہے

کرو فرض گر تم نے قرضہ لیا بھی
رقم سود در سود دینا پڑے گی
رہے گا کھڑا جان پر مارواڑی
زمانے میں ہم نے تو دیکھا یہی ہے

خیالات سمدھی کے لیکن ہیں اونچے
منگاتے ہیں لندن سے تاروں پہ جوڑے
ولایت سے کپڑے۔ تو پیرس سے جوتے
زمانے سے حضرت کو سودا یہی ہے

ہے جانسوز شعلہ نئی روشنی کا
جلادے اثاثہ نہ بجلی کا گولہ
دیوالی میں حضرت نہ نکلے دیوالہ
چراغ حماقت کا شعلہ یہی ہے

ولایت سے گڑیا کی جوتی منگائی
تو واللہ مثل ہم پہ صادق یہ آئی
؎ دمڑی کی بڑھیا ٹکا سر منڈائی
مسیح سننے والوں نے سمجھا یہی ہے

چلے جان بڑن سے اچکن سلانے
اٹھے ہو وہاں پر امارت دکھانے
؎ پڑتا ہوا وسط جہاں[2] ڈھائی آنے
جو روزانہ ہر شخص پاتا یہی ہے

---

[1] صاحب بوٹ و کالر کی ترکیب اگر دیکھنا ہے۔ تو حکیم معشوق علیخاں صاحب کی سوانحعمری کا انتظار کیجئے جو بہت جلد پیش کیجائیگی۔ ہجولی

[2] ماہرین فن معاشیات نے ہندوستان کی آمدنی کا اوسط ۲۰ روپئے بتایا ہے۔ ضروریات شاعری کے سبب ۹ مہینہ گئے ہیں۔ عصمت

نہیں خوف دولہا کی کچھ نوکری کا
نہیں تم کو معلوم یہ واقعہ کیا؟
ہر کیڑے کو ہے رزق پتھر میں ملتا
رہو مطمئن رنگ دنیا یہی ہے

اگر نوکری اب نہیں ہے تو غم کیا
وہ رزاق مطلق ہے رب توانا
وہی[1] دے گا کھانا کیا جس نے پیدا
ہمارا تو سمدھی عقیدہ یہی ہے!

وہ ہے سب کا مالک وہ ہے سب کا داتا
اسے نوکری سے بھلا واسطہ کیا
گدھوں کو وہ اپنے کھلاتا ہے خشکہ
ہر عالم میں ہوتا تماشہ یہی ہے

جڑے مجھ میں ہیں گرچہ لعل اور گوہر
زمانے سے بیکل ہوں۔ نوکر نہ چاکر
اڑاتا ہوں[2] اس پر بھی تازہ مزعفر
ہر ان داتا ہر روز دیتا یہی ہے

غلامی سے بچنا ہے ذی عقل انساں
ہر قدرت نے پیدا کئے لاکھ ساماں
تجارت کے رستے زراعت کے میداں
ہر عالم میں آزاد پیشہ یہی ہے

ضرورت ہے شادی میں پہنے جو دولہا
ہو کھادی کا پاجامہ کھادی کا کرتہ
دلہن کا بھی تن زیب سادہ ہو جامہ
ہر اس دیس کا بھیس سارا یہی ہے

بقیہ[3] جو رسمیں ہیں ان سب کو چھوڑو
یہ سب مہندی۔ ساچق۔ نچھاور اڑادو
یہ بدھی اور سہرے کی لڑیوں کو توڑو
ہر لکھے پڑھوں کا مقولہ یہی ہے

دلہن کو جہیز اتنا دینا ہے کافی
یہی چار جوڑے ظروف اور چوکی
توا۔ چھاج۔ چرخہ۔ پلنگ اور چکی
نئی زندگی کا اثاثہ یہی ہے

۱۔ شہر حیدرآباد میں تقریباً ۱۳۰۰۰ فقیر ہیں۔ جو چھوٹی حاضری بریک فاسٹ اور ڈنر توپ کی آوازوں پر اڑاتے ہیں۔ اور ہیلتھ آفیسر صاحب کی رپورٹ سے واضح ہے۔ کہ ان میں سے اکثر و بیشتر عمر طبعی سے بھی دو چار سال زیادہ گزار کر مرتے ہیں۔ عصمت

۲۔ غالباً توپ کی آوازوں پر؟ مجولی

۳۔ حال میں احمدآباد کے ایک کروڑپتی کے بیٹے سے گاندھی جی کی پوتی کی شادی ہوئی جس میں کل صرفہ [illegible] ہوا۔ عصمت

پرانے طریقے پہ بس مہر[1] ہو گا
کہ عنقا کا بھیجا ہما کا کلیجہ
نہ یہ لے سکے گی نہ وہ دے سکے گا
کہ ہندوستاں کا طریقہ یہی ہے

مگر دیکھنا ایسے قاضی کو لانا
کہ دولہا کا دادا ۔ دلہن کا ہو نانا
ہنسے دیکھ کر جس کو سارا زمانہ
اگر پوپلا ہو تو اچھا یہی ہے

یہ ڈالے ہیں بیکار شادی میں جھگڑے
دلہن دو مہینے سے بیٹھی ہے مانجھے
نہیں کھولتی منہ وہ شرم و حیا سے
کہ ہندی نژادوں کا شیوہ یہی ہے

وہ قاضی بھی آیا اُچکتا پھدکتا
قبا کو جھٹکتا ۔ عصا کو پٹکتا
وہ مصنوعی ڈاڑھی سراسر جھٹکتا
کہ سب قاضیوں میں پرانا یہی ہے

یہ بیٹھے ہیں ماں باپ دولہا دلہن کے
بہت خوش ہیں باتوں کو سن سن کے سرکے
سماتے نہیں پھولے شادی سے سالے
کہ ہو جائے شادی تقاضہ یہی ہے

جھٹکا اور دولہا دلہن کو اٹھایا
پڑھا عقد دونوں کو باہم ملایا
کیا بند آنکھوں کو اور گنگنایا
سنو گڈے گڑیا کا خطبہ یہی ہے

ہیں موجود ہجولی ساعت ہے اچھی
ہیں سمدھی بھی گڑیا بھی گڈے میاں بھی
یہ موقع ہے جلدی سے بن جاؤ قاضی
پڑھا ڈالو دو بول اچھا یہی ہے

"کہ گاجر[2] کی بیندی بگاین کے پھول"
"نہ گھوڑے کی زیں اور نہ ہاتھی کی جھول"
"میاں گڈے بولو ہے گڑیا قبول"
"نہ شرماؤ بیٹا طریقہ یہی ہے"

---

۱ ۔ بادی النظر میں یہ مہر ایک مہمل سا ہے ۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ زمانہ قدیم کے بعض من چلے نوابوں نے مہر میں گوبر کا پھول ۔ مکھی کا بھیجہ اور مچھر کی چربی باندھی ہے ۔ عصمت

۲ ۔ جہاں شادی کے دوسرے اسباب میں کمی کی گئی ہے ۔ وہاں کوئی وجہ نہیں شعر کے "سبب میں" بھی کمی نہ کیجائے ۔

نہ نوبت نہ ڈھولک نہ رسمِ فضول
نہ سہرا نہ بدھی نہ طُرّہ نہ پھول
کہو بی گڑیا کہ گُڈھا قبول
کہو "ہوں" تمھارا اشارہ یہی ہے

پکاؤ ولیمہ میں شب دیگ سمدھن
چڑھیں ہنڈکلیاں پکے اب تلنجن
مزیدار اور چٹ پٹے سب ہو سالن
کہ نعمت کی ماں کا کلیجہ یہی ہے

ہوا ختم خطبہ لٹاؤ چھوارے
کہ بیٹھے ہیں کھولے ہوئے منہ کنوارے
مگر قاضی صاحب کے یہ ہیں اشارے
ہیں پہلے دیدو کہ جھولا یہی ہے

کہیں جا کے بسکٹ پہ مت ٹال دینا
نہ پڑ جائے یورپ کی پریوں کا نشا
ہمیں دیکھنا ہے تمھارا سلیقہ
پکے گھر میں سب کچھ تمنا یہی ہے

مبارک سلامت[1] کی ہے دھوم دھام
براتی ہے کوئی نہ کچھ تام جھام
میاں گڈے کرتے ہیں سب کو سلام
کہو یارو آمین کہ موقع یہی ہے

خدا رکھے اب ہوگا بچہ[3] پہ بچہ
سبق دیکھیں ہجولی دیتی ہیں کیسا
پڑھاتی ہیں ان سب کو دیکھیں وہ کیا کیا
نئی پود کا کیونکہ تجربہ یہی ہے

لو کر ڈالی عصمت نے گڈے کی شادی
بی ہجولی پلو سے کھولو اشرفی[2]
یہ قاضی کو اب نذر دینی پڑے گی
کہ ہم سب میں صدقہ کا بکرا یہی ہے

تمنّا نہ مخفی رہے دل کے اندر
لکھیں واقعہ یہ زمانہ کے پیپر
"رچی خوب شادی" مچے دھوم گھر گھر
نمونے کی شادی سراپا یہی ہے

---

[1] یہاں یہی سب ترک کیا گیا ہے ـ
اور اشارہ ـ جھولا ـ نشا ـ تمنا ـ تجربہ ـ اور گھپلا کا قافیہ "موقعہ" حسب سابق ضرورتاً جائز ہے ـ عصمت

[2] اشرفی ـ یہ طلائی سکہ بازار میں عام طور پر چلتا ہے اگرچہ زر قانونی نہیں ہے ـ عصمت
یہی منہ مانگی اشرفی انشاء اللہ آپ کو نذر دیجائے گی ـ ہجولی

[3] بچہ کی پیدائش چھٹی، چھلّا، عقیقہ، تسمیہ اللہ غرض جملہ مروجہ رسوم پر انشاء اللہ آئندہ اسی ترتیب و انداز سے روشنی ڈالی جائے گی ـ اور اس کے لئے ہمارے صرف دردمند شعرا کو توجہ فرمانے کی ضرورت ہے ـ دیکھیں اس انوکھے باب میں ان کی فکر رسا کہاں تک کام کرتی ہے ـ یہ ایک حقیقی قومی خدمت ہوگی اور کیا عجب ہے کہ یہ انوکھا اصلاحی انداز کم از کم نئی پود ہی کے لئے مفید ثابت ہو ـ ہجولی

فیشن کی رَو

از محترمہ بنت ڈاکٹر شیخ ابوالفضل ۔ کپورتھلہ

یہ دیکھکر سخت افسوس ہوتا ہے کہ اکثر مسلمان تعلیم یافتہ فیشن کی دلدادہ بہنوں نے اپنی مذہبی روایات کو پس پشت ڈالکر فیشن پرستی کو اپنا فرضِ اولین خیال کر لیا ہے۔

انگریزی فیشن کی دلدادہ بہنوں نے دین دنیا کی بہتری اسی میں سمجھ رکھی ہے کہ فیشن اچھا ہونا چاہیئے اور جدید فیشن کا تقاضا یہ ہے کہ گھر کے کام کاج سے بالکل بے پروا اور امورِ خانگی سے مطلق بے تعلق ہوں۔ نیم عریاں لباس پہنیں۔ تھیٹر اور سینماؤں میں بے پردہ شرکت کریں۔ اور پارکوں کی سیر میں وقت ضایع کریں۔ ہر وقت غازے یا پوڈر کا استعمال بکثرت کریں۔ اور بناؤ سنگار کی مشغولیت سے دنیا و مافیہا سے بے خبر رہیں۔ بے جا اسراف کریں اور حیا و شرم سے کوسوں دور رہیں جسے قدرت نے نسائیت کیلئے جوہر بے بہا بنایا ہے۔ تربیت اولاد سے غافل ہونا بھی ایسی ہی فیشن پرست بہنوں کا شعار ہے لیکن وہ یہ بالکل محسوس نہیں کرتیں کہ اب خود یورپ نے بھی ان کے تباہ کن اثرات کا احساس کر لیا ہے۔

چنانچہ فرانس کے ایک فلیسوف فری نیڈ نے مستورات کی موجودہ روش پر نہایت معقول تبصرہ کیا ہے جو اس وقت میرے پیش نظر ہے۔

آپ لکھتے ہیں گویا یہ کوئی بات نہیں کہ فرانس کی آبادی اور نسل کم ہو گئی ہے اور ہوتی چلی جاتی ہے۔ یا یہ امر باعث حیرت نہیں ہے کہ نئی نسلوں سے صفات اعلیٰ گم

ہو چلے ہیں بلکہ اگر یہ اوصاف اب فرانس میں ہوتے
بھی تو تعجب ہوتا، کیونکہ فرانس میں اب وہ مائیں اور فرض
شناس بیبیاں نہیں رہیں جو اگلے زمانے میں ہوا کرتی
تھیں۔ سیر و تاریخ کی کتابوں کو دیکھو کہ گذشتہ فرانسیسیوں
کی مائیں وہ مائیں تھیں جو اپنی اولاد کو آغوش تربیت
میں ہی آدمی بنا دیتی تھیں اب ایسی مائیں کہاں ہیں
کہ جنھوں نے اپنے بچوں کو پیار و محبت کی میٹھی میٹھی
لوریوں، ہاتھ کی تھپکیوں۔ تقوی و تدین کے بھرے
گیتوں سے شاعر بنا دیا ہمیشہ کے لئے متقی و پارسا
کر دیا ہر وقت ان کے حال کی نگراں رہیں۔ اور اسی
ٹوہ میں لگی رہیں کہ بچے کی طبیعت کس چیز کی طرف
مائل ہے؟ ابتدا ہی سے بچے کو جس قابلیت کا دیکھا اسی
علم و ہنر میں لگا دیا۔ اور ابتدا سے اس کی تدبیریں
کیں۔ اگر دیکھا کہ بچہ نحیف الخلقت ضعیف الطبع ہے تو
پہلے ہی سے اپنی قوم کے ان یگانہ روزگار اشخاص کی
کہانیاں سنانی شروع کیں جو سیرت و اخلاق اور
علم و ہنر میں یکتا ہوتے تھے۔ تاکہ بچہ جب ہوش
سنبھالے اور بڑا ہو تو انھی کے سے رنگ ڈھنگ
اختیار کرے انھی کی سی شہرت و ناموری کا خیال
اس کے دل میں جاگزیں ہو۔ اگر دیکھتیں کہ بچہ تن و توش
کا اچھا ہے۔ اور آگے چلکر شہ زور ہونے والا ہے تو
— جہاں وہ غوں غاں کرنے لگا اور انھوں نے رزمیہ
گیت اس کے کانوں میں ڈالنے شروع کر دئیے۔ کچھ
سمجھنے لگا تو قوم کے بہادروں کے کارنامے سُنانے لگیں
رحم و قہر کے مواقع بتائے وطن پرستی کے سبق پڑھائے
تاکہ جوان ہو کر وہ بھی ناموران قوم کی طرح دل چلا
ننگ و ناموس پر مرنے والا شجاع و رحم دل بنے۔"

بے شک فرانسیسی ادیب کے یہ مشاہدات حقیقت
ثابتہ کے مظہر ہیں۔

بہت سی متمول بہنیں طنزاً یہ کہیں گی کہ کیا ہمارے
شایان شان ہے کہ ہم خود گھر کا انتظام کریں۔ کھانا
پکانا، سینا پرونا سیکھیں۔ اور پھر خود یہ کام کریں۔ کیا
ماماؤں کے کرنے کے کام خود ہمیں کرنے پڑیں گے۔ لیکن
وہ متکبر ذرا ہمیں بتائیں کہ کیا وہ شاہان فرانس کی
ماؤں کے ان حالات سے ناواقف ہیں؟ جو اپنی
لڑکیوں کو بہترین باورچیوں کی شاگردی میں کھانا
پکانا سکھاتی تھیں۔ خود پکاتی تھیں اور اپنی بیٹیوں کو
سکھاتی تھیں۔ وقت پڑنے پر بغیر کسی مددگار کے
تمام خاندان کے کھانے کا خود انتظام کر لیتی تھیں،
اور اپنے پکائے ہوئے کھانے کی خوش مزگی کی سب سے
داد لیتی تھیں۔ کیا وہ محترم بہنیں اپنا رتبہ (نعوذ باللہ)
حضرت الزہرا خاتون جنت رضی اللہ عنہا سے بھی بلند

وبرتر سمجھتی ہیں کہ وہ انصرام امورخانگی کی یکہ و تنہا ذمہ دار
تھیں جنھوں نے اپنی ساری مقدس حیات میں کبھی اور کسی
وقت بھی غیر کی محنت سے شرمندہ ہونا منظور نہیں کیا۔
جب آقائے دوجہاں کی نور نظر کی یہ کیفیت تھی تو ہماری
بہنیں کیوں خود کام کرنے میں اپنی ہتک سمجھتی ہیں۔

گو آج کل مستورات میں زیادہ تعلیم اور ہنرمندی
پیدا ہو چلی ہے۔ لیکن افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ تعلیم
یافتہ بہنوں میں سے شاید ہی کوئی ایسی بہن ہوں جن کے
قوائے جسمانی صحیح طور پر تندرست کہے جاسکیں۔ ورنہ
عام طور پران کی صحت کمزور رہتی ہے جو صرف فیشن
پرستی کا نتیجہ ہے۔

زیادہ تر وقت بیٹھے بیٹھے مطالعہ کرنے یا کشیدہ
کاڑھنے میں صرف کیا جاتا ہے۔ اور یہ ایسے کام کرنے
سے اکثر گھبراتی ہیں جن میں ہاتھ پاؤں ہلانے پڑیں
اور ورزش جسمانی کا موقع ملے کیونکہ یہ فیشن سے بعید
ہے۔

انگریزی فیشن کی رو میں بہنے والی بہنیں نہ خود آپ
نئی آزادی کا شکار ہو رہی ہیں بلکہ اپنی دوسری بہنوں
اور بچیوں کو بھی غیر ضروری اور ناجائز آزادی کا سبق دے
رہی ہیں۔ اس فیشن کے طفیل جو آزادی پھیلی اور پھیلتی
چلی جارہی ہے وہ بے حیائی کے درجے تک پہنچ گئی ہے۔

مشکوٰۃ کی ایک صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ حیا و
ایمان لازم و ملزوم ہیں جب کسی شخص سے ان دونوں میں سے
ایک اٹھ جائے تو دوسرا خود بخود اٹھ جاتا ہے لیکن فیشن کی دلدادہ
بہنوں نے اسے بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ اور نیم عریاں
لباس میں ملبوس ہو کر مردانہ ملبوس میں اور مخلوط پارٹیوں
میں شریک ہو کر نامحرموں سے ہنسی مذاق اور ہینڈشیک
کرنے کو قابل فخر سمجھ لیا ہے جو کہ مذہب اسلام نے عورتوں
کے لئے کسی صورت بھی جائز نہیں رکھا۔

میرا روئے سخن اس وقت معمر خواتین کی طرف نہیں بلکہ
اپنی ہم سن بہنوں کی طرف ہے کاش! کہ وہ اپنی مذہبی اور
اسلامی روش کو پیش نظر رکھتے ہوئے صحیح اسلامی زندگی بسر
کرنا سیکھیں اور جناب سیدہ خاتون جنت کی مبارک حیات
مقدسہ کی پیروی کرکے اپنی بے دینی سے تائب ہو جائیں اور
اس تباہ کرنے والی فیشن کی رو کے تھپیڑوں سے کنارہ کشی
اختیار کریں۔ نسوانی تعلیم کا مقصد یورپ کی بیجا تقلید کرنا
نہیں بلکہ مستورات کو امور خانہ داری بہ طریق احسن سرانجام
دینے کے لئے ماہر و کامل بنانا ہے۔

کیونکہ خانہ داری کے انتظام و انصرام بمنزلہ ایک سلطنت
کے ہیں جس میں ماہر و کامل ہونا ہی مستورات کا جوہر ذاتی ہے۔

خدا سب بہنوں کو راہ مستقیم پر گامزن فرما کر فیشن کی
بے جا رو میں بہنے سے بچائے آمین۔ فقط

زیور اور عورت کا مناسب درجہ

بہ اجازتِ خاص۔ ایف۔ ایل۔ براین اسکوئر۔ ایم سی۔ آئی سی ایس

F. L. BRAYNE Esq., M. C., I. C. S.

(کمشنر لاہور پنجاب)

(ترجمہ از جناب محمد ظفر صاحب ایم۔ اے، ایل ایل بی)

ستمبر کے ہمجولی میں پانچ قلندروں کی سیر کا دلچسپ اور پُرمذاق مضمون پڑھ کے گاؤں کی خراب حالت کا نقشہ پیش نظر ہوگیا۔ ان بیچاروں پر اندھیرے میں بڑی مصیبت پڑی لیکن دن میں وہاں کے حالات اور دلدوز ہوتے: ہمارے ضلع میں ہمارے سابق ڈپٹی کمشنر مسٹر ایف ایل براین صاحب بہادر نے **اصلاح دیہات** کی تحریک کی بنیاد رکھ کے آٹھ سال ہر قسم کا تلقینی کام جاری رکھا۔ دیہاتی میلے، فانوس جادو کے تماشے، تقریریں، مضمون نگاری، اشتہار غرض کہ جس طرح بھی ہوسکا یہ کام کیا گیا۔ چونکہ ہمارے ملک میں عملی کام کرنے والوں کی کمی ہے اور دیہات میں سرکاری امداد کی توقع رہتی ہے اس لئے وہ سب کام اُن کے ضلع سے تشریف لے جانے کے بعد سست گیا۔ ایک ہم اور ہمارا ڈسٹرکٹ گزٹ رہ گیا اور ابھی یہ تلقینی کام برابر جاری ہے۔ اسے ہمارا شوق سمجھئے یا اس کام سے دلچسپی۔ صاحب بہادر اب لاہور میں کمشنر ہیں اور یہ سلسلہ اب ساری کمشنری میں جاری ہے۔ اُن کی اس تلقین کا ایک مضمون ان کی خاص اجازت اور ان سے خاص انتظام کرنے کے بعد ہم ہمجولی کی نذر کرتے ہیں۔ اس علاقہ میں یہ طرز ضرور دلچسپی پیدا کرے گا اور ان بڑی بڑی ڈگریوں

والے نئی روشنی کے قلندروں کے دیہاتی تذکرہ کے سلسلہ میں مزے سے پڑھا جائے گا۔

(محمد ظفر)

گاؤں کے بڑے بوڑھے سقراط کے اردگرد بیٹھے ہوئے اِدھر اُدھر کی باتیں ملکا رہے تھے کہ دو عورتیں پاس سے گزریں جن میں سے ایک پانی اٹھائے لئے جاتی تھی اور دوسری کے سر پر چارہ کا گٹھا تھا۔ دانا نے کہا۔ دوستو! میں تم سے زیور کے معاملہ میں کچھ بات چیت کرنا چاہتا ہوں۔ میرا دل کچھ عجیب چکر میں ہے اور میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔

دیہاتی۔ اے دانا ایسی کیا مشکل ہے؟

سقراط۔ تمھاری عورتیں زیور کیوں پہنتی ہیں؟

دیہاتی۔ یہ کیا سوال ہے ہم اور ہمارے بچے خواہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں زیور پہنتے ہیں اور عورتیں تو خوب زیور پہنتی ہیں۔

سقراط۔ یہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ ایسا کیوں ہے؟

دیہاتی۔ میرے خیال میں اس کے چند وجوہ ہیں رواج بھی ہے۔ اور یہ ذرا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ وہ اور ہم سب اسے پسند کرتے ہیں۔

سقراط۔ تم اس لئے پسند کرتے ہو کہ رواج ہے اور اگر تم نے رواج پر عمل نہ کیا تو تمھیں بُرا کہا جائے گا لیکن میری رائے میں کوئی چیز صرف اس لئے اچھی نہیں کہلا سکتی کہ اس کا رواج ہے۔

دیہاتی۔ کیوں نہیں؟

سقراط۔ اگر چند گاؤں چوری کی رسم جاری کردیں تو کیا تم اُسے ٹھیک کہو گے؟

دیہاتی۔ نہیں۔ بالکل نہیں۔

سقراط۔ تو رواج لازمی طور پر محض اس لئے ٹھیک نہیں کہلا سکتا کہ وہ رواج ہے۔

دیہاتی۔ بیشک، میری رائے میں نہیں کہلا سکتا۔

سقراط۔ تو تمھیں زیور پہننے کو رواج کے علاوہ کسی اور عمدہ لحاظ [illegible] جائز ٹھرانا چاہیے۔

دیہاتی۔ [illegible] ہم اسے اس لئے پہنتے ہیں کہ بھلا معلوم ہوتا ہے۔

سقراط۔ لیکن یہ عورتیں بے نہائی دھوئی تھیں اور نہایت میلے کچیلے چیتھڑے پہن رہی تھیں۔ وہ سامنے کھیلتے ہوئے بچے ہاتھوں اور پاؤں میں تو چاندی کے کڑے کڑولے پہن رہے ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کبھی پانی کی شکل دیکھی ہی نہیں نہانا دھونا تو الگ رہا اور ان کے کپڑے تار تار ہیں۔

دیہاتی۔ کچھ بھی ہو زیور پہن کے تو وہ بھلے ہی معلوم ہوتے ہیں۔

سقراط۔ کیسی عجیب بات ہے! تم خود اپنے آپ کو اور اپنے کنبہ کو گندہ میلا کچیلا اور پھٹے حالوں رکھنے میں خوش ہو۔ حالانکہ نہانے میں کچھ لاگت نہیں آتی اور نہ کپڑے دھونے میں کچھ ایسا خرچ ہوتا ہے۔ اور پھر مزا یہ کہ پھوہڑپن اور چکٹ کو قیمتی زیوروں سے دور کرنا چاہتے ہو؟

دیہاتی۔ نہیں تو۔ زیور تو انھیں سوہنا بنا دیتا ہے۔

سقراط۔ خدا نے تو انھیں خوبصورت بنایا۔ لیکن تم اس خوبصورتی کو چیتھڑوں اور میل کچیل سے خراب کر دیتے ہو۔ اور پھر اس کا علاج تم زیور سے کرنے کی کوشش کرتے ہو۔

دیہاتی۔ اجی آپ تو واقعی ہم کو شرمندہ کئے ڈالتے ہیں۔

سقراط۔ اور پھر سب سے بڑھ کے یہ کہ جتنا زیادہ تم اس کمبخت ٹوم چھلے کو پہنتے ہو وہ جلدی گھستا چلا جاتا ہے۔

دیہاتی۔ ہے تو یہی بات۔

سقراط۔ اور عورتوں کا یہ حال ہے کہ جتنا زیادہ زیور پہنتی ہیں اتنا ہی وہ دوسروں کے زیور کو دیکھ دیکھ کے حسد میں پھکی جاتی ہیں۔ اور اپنے مردوں کے آگے اور لاؤ اور لاؤ کا گیت گاتی ہیں۔

دیہاتی۔ ہاں ہے تو ایسا ہی!

سقراط۔ تو جتنا کم اسے پہنا جائے گا اتنا ہی ضرور ہر طرح اچھا ہوگا؟

دیہاتی۔ ضرور ہوگا۔

سقراط۔ اور سب سے زیادہ بیوقوفی ہے کہ ان عمدہ اور اچھے زیوروں کو روزمرہ کے گندہ کپڑوں میں اور ہر طرح کے گھر کے اور کھیت کے کام کے وقت پہنا جائے۔ اصل میں عقل کی بات تو یہ ہے کہ تم اپنے سارے ٹوم چھلے کو میلوں ٹھیلوں تیہج تہواروں اور شادی بیاہ وغیرہ کے موقعوں پر پہنا کرو۔ اور اس وقت پہنو جب تم نہا دھو چکو اور اچھے اجلے کپڑے ہوں۔

دیہاتی۔ یہ بات ضرور دل کو لگتی ہے؟

سقراط۔ سچ یہ ہے کہ اسی وقت زیور کچھ بہار بھی دیگا۔

دیہاتی۔ بیشک۔ لیکن اسے کیا کریں کہ ہماری عورتیں ہٹ کرتی ہیں اور مانگے چلی جاتی ہیں۔

سقراط۔ اگر وہ زہر مانگیں اور ہٹ کئے جائیں تو کیا تم انھیں دیدو گے؟

سقراط۔ بس تو انکی طرح تمھیں بھی زیور پسند ہے؟

دیہاتی۔ اگر یہی بات ہے تو واقعی ہمیں زیور پسند ہے
سقراط۔ تو اپنی عورتوں کو اس زبردست روپیہ کی بربادی پر نام نہ دھرو۔
دیہاتی۔ یہ تو کسی طرح روپیہ کی بربادی نہیں۔ زیور پاس رہتا ہے اور بڑے مول کی چیز ہے۔
سقراط۔ تو زیور پر سو روپیہ خرچ کر کے بیچتے وقت کیا لے لیتے ہو؟
دیہاتی۔ اگر سنار ایماندار ہو تو اسی کے قریب ورنہ ساٹھ ستر۔
سقراط۔ خوب! اور یہ گھٹتا رہتا ہے یہاں تک کہ دس سال میں بس بیس روپیہ کا ہی رہجاتا ہے؟
دیہاتی۔ ہاں۔
سقراط۔ اور اگر کوئی چور چکار آجائے تو یہ ایک ہی رات میں اُڑ جاتا ہے؟
دیہاتی۔ ہاں؛ ٹھیک بات ہے۔
سقراط۔ اور اگر تمہارے پاس زیور زیادہ ہو تو چوروں کے ڈر سے رات کو تمھاری آنکھ نہیں لگتی اور گھروں میں روشندان اور کھڑکیاں نہ بنانے سے تم اپنی صحت برباد کر دیتے ہو۔ واہ کیا قیمتی چیز ہے! اچھا فرض کرو تم سو روپیہ زیور پر خرچ کرنے کی بجائے سنٹرل بنک میں جمع کر و تھیں معلوم ہے دس سال میں کیا ہو جائے گا؟
دیہاتی۔ یہ تقریباً دو سو روپیہ ہو جائیں گے۔
سقراط۔ تو اس کے مقابلہ میں تمہارے زیور کہاں قیمتی رہے؟
دیہاتی۔ ہم تو سچ مچ ریت رسموں کے نکھدے غلام ہیں۔
سقراط۔ لیکن اگر تمہارے پاس روپیہ نہ ہو اور تمہاری بی بی زیور کا تقاضہ کرے تو تم کیا کرو؟
دیہاتی۔ ہم اُدھار لے لیتے ہیں۔
سقراط۔ ہوں! زیور تو گھس گھس کے گھٹتا جاتا ہے اور قرضہ بڑھتا چلا جاتا ہے؟
دیہاتی۔ میں قایل ہوں، ہے تو ایسا ہی!
سقراط۔ ہائے ہائے۔ مورکھ گاؤ دیئو! تباہی بربادی آخر تم میں کب سمجھ آئے گی؟
دیہاتی۔ اجی ہماری بیوی بچے بنا اس کے خوش ہی نہیں ہوتے؟
سقراط۔ میرے خیال سے ہم سب کو خوبصورتی پسند ہے۔ اور سب ہی خوش ہونا چاہتے ہیں یہ تو ہم سب میں کچھ قدرتی بات ہے۔
دیہاتی۔ اے صاحب! آپ نے تو ہمارے دل کی بات لپک لی جسے ہم زبان سے کہنے کی طاقت

نہ رکھتے تھے۔

سقراط۔ تمہاری رائے میں زیور سے تمہاری خواہش پوری ہو جائے گی؟

دیہاتی۔ اور بھلا ہم گاؤں میں بیٹھے بیٹھے کیا کریں؟

عین اس وقت ایک گھوڑی وہاں سے گذری جس کے ساتھ ساتھ اس کا بچہ کلیلیں کرتا جا رہا تھا۔

سقراط۔ یہ دونوں خوبصورت اور خوش ہیں اور زیور بھی نہیں پہن رہے۔ اور یہ بھی بات ہے کہ آدمی مویشیوں سے اچھا ہے یہی بات ہے نا؟

دیہاتی۔ ہاں کہتے تو ایسا ہی ہیں لیکن اے سقراط آپ تو اپنے ان سوالوں اور پہیلیوں سے اس معاملہ میں ہمارے دل میں کچھ شک سا پیدا کئے دیتے ہیں۔

سقراط۔ مجھے ایسا کھٹکتا ہے کہ شاید تمہارے بچے ہمیشہ خوش نہیں رہتے؟

دیہاتی۔ بات یہ ہے کہ وہ خوب کھیلتے ہیں۔ لیکن روتے چیختے بھی خوب ہیں!

سقراط۔ تو بھئی اس گھر میں ہنسی خوشی کہاں سے ہو سکتی ہے جہاں گندگی دکھ دانتا کلکل اور بیماری بھری پڑی ہو! تمہارے پاس اس کا کیا جواب ہے کہ جانور تو خوش و خرم اور خوبصورت ہوں اور تمہاری عورتوں اور بچوں میں اکثر دونوں باتیں نہیں ہوتیں؟

دیہاتی۔ اے سقراط! اس کا جواب ہمارے بس کا روگ نہیں!

سقراط۔ میں بتانے کی کوشش کروں؟

دیہاتی۔ بڑی مہربانی ہوگی۔

سقراط۔ لو سنو۔ مجھے یقین ہے کہ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ جانور صاف ستھرے رہتے ہیں۔ صفائی سے تندرستی اور تندرستی سے خوشی پیدا ہوتی ہے۔ وہ کھلے میدانوں میں رہتے ہیں اور اپنے آپ کو اور اپنے بچوں کو نہایت ہی صاف رکھتے ہیں۔ تم گندے گاؤں میں رہتے ہو جہاں ہر طرح کی گندگی کوڑا کرکٹ کاٹھ کباڑ چاروں طرف پڑا پڑا سڑا کرتا ہے۔ جسے ہوا اُڑا اُڑا کے تمہارے مونہوں پر اور پانی میں لا ڈالتی ہے تم اسے سانس کے ذریعہ پھیپھڑوں میں لیجاتے ہو۔ مکھیاں ان پر بھنک بھنک کے تمہارے کھانے پر اور تمہارے بچوں کی آنکھوں پر اور ہونٹوں پر آ بیٹھتی ہیں۔ تم بے کھڑکیوں کے اندھیرے مکانوں میں رہتے ہو جہاں ہوا اور روشنی کا دخل نہیں ہوتا۔ تمہاری عورتیں نہ خود نہاتی ہیں نہ بچوں کو نہلاتی ہیں تمہاری صحت کمزور ہوتی جاتی ہے۔ اور جو بیماری نمودار ہوتی ہے اس کے جھپٹ میں تم فوراً آ جاتے ہو۔ خود صاف ہو اور اپنے بچوں کو بھی صاف ستھرا رکھو اور اپنے کپڑوں کو

دھوتے رہو گھروں میں روشندان کھڑکیاں بناؤ
گاؤں کو صاف رکھو رہنے سہنے کی صحت بخش عادتیں
اختیار کرو ۔ تمہاری بیوی بچے صاف تندرست ۔ لہذا
خوش رہیں گے ۔
دیہاتی ۔ اجی آپ تو بڑے سخت آدمی ہیں ۔ یہ سب باتیں
ہمارے بس کی نہیں ۔
سقراط ۔ میں نے تمھیں جتنی باتیں بتائیں کیا ان میں
کوئی بھی ایسی ہے جس میں تمھارا کچھ خرچ ہوتا ہے ؟
دیہاتی ۔ یہ تو بات نہیں ہے ۔
سقراط ۔ تو پھر ہمت اور حوصلہ ہی کی ضرورت ہے
جو تم میں نہیں ؟
دیہاتی ۔ بات دل کو لگتی ہے آپ کا الزام بالکل
ٹھیک ہے ۔
سقراط ۔ اصل بات یہ ہے کہ میرے اس طریق علاج
سے تمہارا روپیہ بچ جائے گا اگر تم میری نصیحت پر چلو
تو تمھیں اسقدر اس کمبخت ٹوم چھلے کی ضرورت
نہ پڑے ۔
دیہاتی ۔ ٹھیک بات ہے ۔
سقراط ۔ سچ مچ بلا زیور کے صاف ستھرے تندرست
عورتیں بچے زیور سے لدے پھندے میلے کچیلے گھنا
ؤنے بال بچوں سے کہیں اچھے اور خوبصورت معلوم دینگے ۔

دیہاتی ۔ بالکل ٹھیک !
سقراط ۔ اور پھر اس طرح بچائے ہوئے روپیہ کو کیوں
نہ انھیں لکھانے پڑھانے ان کے بیمار پڑنے کے وقت
ان کو زمین دینے اور ان کی دوا درمن کرنے اور برسات
میں مچھردانیاں خریدنے میں خرچ کیا جائے ؟
دیہاتی ۔ اجی سقراط ۔ یہ باتیں دل لگتی اور سمجھ بوجھ کی
ہیں ۔ اور ہیں ہی ! لیکن ہماری عورتیں تو زیور مانگیں
ہی گی ۔
سقراط ۔ ضرور تم انھیں دو لیکن سوچ سمجھ کے دو اور
ہو سکے تو بلا قرض لئے دو ۔ اے دیہاتیوں میں کٹر کٹھ
ملا نہیں ہوں ۔
دیہاتی ۔ اس سے تو وہ نہ مانینگی ۔
سقراط ۔ کیوں ؟
دیہاتی ۔ وہ اپنے گھروں میں ہمیشہ خوش و خرم
نہیں رہتیں ۔ ہم قایل ہیں کہ انھیں کوئی حق حاصل
نہیں اور ان کا خیال ہے کہ اگر وہ زیوروں سے
لدی پھندی ہوں تو ان کے مردان کی زیادہ عزت
کریں گے اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کریں گے اس
ڈر سے کہ وہ زیور سمیت نکل بھاگیں گی ۔
سقراط ۔ تو بس زیور ہی اس کا دمن ہے ؟
دیہاتی ۔ ہاں ! یہی بات ہے ۔

سقراط۔ تو ان کا خیال ہے کہ جب تک ہو سکے اور جو کچھ انھیں مل سکے وہ لئے جائیں۔ اسی لئے وہ تمھیں زیور کے لئے تنگ کرتی رہتی ہیں۔

دیہاتی۔ ایسا ہی ہے۔

سقراط۔ تو تم لوگ اپنی بیویوں کی کچھ ایسی عزت نہیں کرتے؟

دیہاتی۔ بالکل نہیں۔ وہی ہماری عزت کرتی ہیں۔

سقراط۔ تو عورتوں کی کچھ زیادہ وقعت نہیں؟

دیہاتی۔ بیشک کچھ بھی نہیں۔

سقراط۔ تم عورتوں سے پیدا ہوئے، تمہارے بچے عورتوں سے ہوئے اور تمہاری لڑکیاں تمہاری نواسی نواسوں کی مائیں ہوں گی؟

دیہاتی۔ ہاں!

سقراط۔ تو تمہاری عورتیں تم میں ہی سے ہیں؟

دیہاتی۔ ہاں۔

سقراط۔ اگر وہ قابل عزت نہیں تو تم تمہارے بچے پوتے نواسے سبھی قابل عزت نہیں؟

دیہاتی۔ معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

سقراط۔ تمھیں اپنے بچوں سے محبت ہے؟

دیہاتی۔ محبت! ہم تو ان پر مٹے ہوئے ہیں؟

سقراط۔ اس پر یہ حالت ہے کہ تم اس ایک ہستی کو حقیر سمجھتے اور اس سے بدسلوکی کرتے ہو جو ان کی ذمہ دار ہے۔ جس سے انھیں اپنی پرورش سیرت اور تربیت اپنی زندگی کے نہایت اہم سالوں میں حاصل ہوتی ہے تمہاری حرکتیں تو کچھ مجنونانہ معلوم ہوتی ہیں۔ اصل میں تو تمہارے مقابلہ میں تمہاری عورتوں کی زیادہ ضرورت ہے۔ کیوں کہ وہ تمہارے بچوں کی پیدائش اور پرورش اور بقائے نسل اور انتظام خانہ داری کا ذریعہ ہیں۔

دیہاتی۔ ٹھیک ہے۔

سقراط۔ دراصل وہ اس کام میں تمہارے برابر کی شریک ہیں۔

دیہاتی۔ ہاں۔

سقراط۔ اگر تم ان کے ساتھ برابر کا برتاؤ کرو جس عزت کی وہ مستحق ہیں اتنی عزت ان کی کرو اور انھیں تعلیم دو کہ انھیں بچوں کی مناسب تربیت کرنی آجائے تو شاید وہ تم سے اتنا زیور گہنا نہ مانگیں بلکہ اپنے اُجلے تندرست اور خوبصورت بچوں اور اپنے چہل پہل کے گھروں پر قناعت کئے رہیں۔

دیہاتی۔ بیشک صاحب یہی نتیجہ ہوگا۔

سقراط۔ کیا دنیا میں خدا نے بچے اور چھوٹے چھوٹے

جانوروں کے سوا اور کوئی چیز خوبصورت نہیں بنائی؟

دیہاتی۔ کیوں نہیں خدا نے پھول بھی تو بنائے ہیں۔

سقراط۔ تمھارے گھروں میں خوب پھل پھلواڑی ہوگی کیونکہ تمھیں خوبصورت چیزیں پسند ہیں اور تمھیں ان کے لئے قرض میں بھی دب جانا منظور ہوتا ہے؟

دیہاتی۔ (ہنستے ہوئے) نہیں۔ پھولوں کا ہم کیا کرتے؟

سقراط۔ تو تمھیں سچ مچ خوبصورت چیزوں سے محبت نہیں؟

دیہاتی۔ نہیں ہمیں محبت ہے۔ ہمیں پھول پھلواڑی لگانے کی چھوٹ نہیں ہے۔ نہ ہمیں لگانا ہی آتا ہے اور نہ یہ خبر کہ بیج کہاں سے ملتے ہیں۔

سقراط۔ تمہارے گھروں کا شریک کیوں نہ پھولوں کا کام سیکھ لے؟ مجھے یقین ہے کہ اُسے اتنا وقت تو مل ہی جائے گا کہ گھروں میں پھول لگا کے انھیں خوبصورت بنائے۔ اچھی اور سلیقہ کی عورتیں اپنے گھر سنوارنے اور بارونق بنانے کے لئے وقت نکال ہی لیتی ہیں۔ میں ایک بات بتاؤں۔ اگر انھیں اب بھی زیورات کی خواہش تو نہیں اپنے بچپن میں زری دوزی اور کاڑھنے بننے کا کام سیکھ لینا چاہیے اور اپنی بچیوں کو بھی سکھا دینا چاہیے تاکہ وہ زیوروں میں تمہارا روپیہ ضائع کرنے کی بجائے لیس اور زردوزی خوبصورت چیزیں بنانے میں ایکدوسرے سے مقابلہ کریں۔ پھر سب سے ہوشیار عورت باقی عورتوں کی سردار ہوگی نہ کہ وہ عورت جسے سنار کا سب سے زیادہ روپیہ دینا ہو۔

دیہاتی۔ اے سقراط ہم ان باتوں پہ عمل کرنیکی کوشش کرینگے۔

سقراط۔ تو اب معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام باتوں کا یہ نتیجہ ہے کہ تمھیں چاہیئے کہ اپنی عورتوں کو تعلیم دو اور اپنا شریک زندگی سمجھ کے ان کے ساتھ عزت کا سلوک کرو اور گھر کو خوبصورت بنانے اور بچوں کو صاف اور خوش رکھنے میں ان کا ہاتھ بٹاؤ اور انھیں اپنی انگلیاں اپنے آپ کو اور اپنے بچوں کو خوبصورت بنانے میں استعمال کرنا اور گھروں میں پھول لگانا سکھلاؤ۔ تم اپنے گاؤں کو بھی صاف رکھو اور رہنے سہنے کے قابل بناؤ۔ اسوقت زیور کی کم ضرورت رہ جائیگی اور تم اپنا روپیہ بنک میں داخل کرسکو گے جہاں ہر سال تم اسے بڑھتا دیکھو گے بجائے اس کے کہ تم زیور بنوا کے اسے سال بسال گھٹتا اور قرض بڑھتا دیکھو۔ سب سے زیادہ یہ کہ تمہاری اور تمہارے کنبہ کی زندگی خوش و خرم اور بیفکر ہو جائے گی۔

دیہاتی۔ بے شک جناب آپ کی نصیحت بالکل ٹھیک ہے ہم اس پر چلنے کی کوشش کریں گے لیکن ان ساری باتوں پہ عمل کرنا سالہا سال تک بھی نہایت مشکل ہے۔ فقط

چند اہم سوالات

از ڈاکٹر سید عبداللطیف پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن)

(خاص ہمجولی کے لئے انگریزی میں لکھا)

حیات انسانی کے تقدس کی حفاظت میں عورت کا بہت بڑا حصہ ہے عورت جہاں سرچشمۂ نجات ہے وہیں موجب آفات بھی ہے اور جب اس کی زندگی کا یہی مقصد ٹھہرا تو ارباب فہم و ذکا کے لئے اس کا دورِ حیات ایک اہم اور غور طلب مسئلہ بن جاتا ہے اس ضمن میں مجھے ہر ملت کے مرد و عورت سے سوالات ذیل کے جواب مطلوب ہیں تاکہ میں معلوم کرسکوں کہ اس بات میں اُن کے ذاتی خیالات کیا ہیں اور ان کے رجحانات کی موجیں انہیں کس طرف لے جارہی ہیں۔

اس سے میرا دراصل منشا یہ ہے کہ ان کے احساسات معلوم کروں اور یوں ان کو خود ان ہی آنکھوں سے دیکھوں۔ اس طرح جو کچھ نتیجہ ہوگا اس کی روشنی میں ان احساسات کو ان اہل بصیرت کی خدمت میں پیش کرسکوں گا جن تک میری رسائی ہوسکتی ہے پھر ان کی جو بھی رائے ہوگی اس کو اپنی رائے کے ساتھ پیش کرونگا

میں اب تک کسی خاص نتیجہ پر نہیں پہنچ سکا ہوں اس لئے اس احساسات سے واقف ہونا چاہتا ہوں احباب کی خواہش ہے کہ میں ہندوستانی قومیت کی موجودہ تعمیر میں جو عورت اور مرد دونوں کی پاکیزگی حیات پر مبنی ہو اظہار خیال کرکے یہ بتلاؤں کہ اس میں ان دونوں کا کیا حصہ ہے اور اس باب میں میرا تجربہ بہت محدود ہے۔ خیر تو سوالات یہ ہیں۔

(۱) کیا نسائیت اس نہج پر ترقی کررہی ہے جس سے ایسی نسل پیدا ہوسکے جو تہذیب کی ترقی یعنی فکر و احساس تخیل و عمل اور بحیثیت مجموعی زندگی میں ہم آہنگی پیدا کرسکے۔

(۲) بعض تعلیم یافتہ گھرانوں نیز کم تعلیم یافتہ مگر خوش حال گھرانوں میں بچوں کو ماں کا دودھ نہیں پلایا جاتا بلکہ کسی ایک انا کو مقرر کیا جاتا ہے جو بسا اوقات ماں کے رتبہ کی نہیں ہوتی بلکہ گرے ہوے اخلاق کے ساتھ کبھی کبھی شدید امراض میں بھی مبتلا ہوتی ہے کیا اس قسم کی پرورش بچوں کے ذہن اور کردار کی صحت بخش نشو ونما کی ضامن ہوسکتی ہے ؟ مجھے ایک ایسے خاندان کا حال معلوم ہے جس میں ماں اپنی حد تک بچوں کی پرداخت میں بھی محتاط تھی۔ ایک دن وہ اپنے بچے کو جو سال بھر کا ہوگا خادمہ کے سپرد کر کے گھر کے کاروبار میں مصروف ہوگئی۔ بچہ رونے لگا جس کی آواز سن کر وہ واپس آئی مگر اس کے آتے آتے بچہ خاموش ہوگیا تھا۔ اس نے خادمہ سے بچے کے رونے کا سبب پوچھا جس کے جواب میں خادمہ نے کہا کہ میاں بھوکے معلوم ہوتے تھے میں نے ان کو اپنا دودھ پلا دیا ہے ۔ یہ سنکر ماں نے خادمہ سے تو یہ کہدیا کہ کہ خیر تم نے اچھا کیا مگر الگ لے جا کر اس کی زبان پر آہستہ آہستہ نمک مل دیا اور اس طرح پیا ہوا دودھ قے کرا دیا۔ اس لئے کہ اس کو خوف تھا کہ کہیں بچے میں خادمہ کے دودھ کے اثرات نہ آجائیں۔ کیا وہ اپنے خوف میں حق بجانب تھی ؟ کیا واقعی خون میں کچھ بات ہوتی ہے ؟ ———

(۳) بعض خاندانوں میں بچوں کی دیکھ بھال کے لئے آیائیں مقرر کی جاتی ہیں جو معمولی طبقے کی ہوتی ہیں۔ کیا ہمیں اپنی اولاد کو ان کی نگرانی میں دیدینا چاہئے مائیں اپنی اولاد کی پرداخت کا پاکیزہ فرض کیوں ایسی عورتوں کو سونپ دیتی ہیں جو خود ان سے عقلی اور بعض اوقات اخلاقی حیثیت سے گری ہوی ہوتی ہیں تو پھر اس قسم کی عورتوں کیساتھ رہتے سہتے سے عہد طفلی میں ہمارے بچوں کی گفتار، کردار اور سیرت پر کیا اثر پڑیگا ؟

(۴) بعض عورتیں کیوں ایسے سینما دیکھنے جاتی ہیں جہاں خلوت اور معاشقے کے مناظر دکھائے جاتے ہیں اور کیوں اکثر اوقات وہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو بھی اپنے ساتھ لیجاتی ہیں

(۵) بعض اشخاص اپنی آرام گاہوں میں عریاں تصاویر آویزاں کرتے ہیں کیا اس میں کوئی خاص مصلحت پوشیدہ ہے اور کیا اس میں کوئی اخلاقی یا جمالی مقصد مضمر ہے ؟

(۶) کیا ہماری مستورات لباس اپنے گھر ملو سکھ چین کے کے لئے پہنتی ہیں یا دنیا دکھاوے کے لئے ۔

(۷) کیوں بعض عورتیں دوکانوں پر خرید وفروخت کے لئے جاتی ہیں اور بظاہر بند گاڑیوں میں بیٹھے بیٹھے دکان کے ملازمین کی موجودگی میں پردہ اٹھا اٹھا کر جھانکا کرتی ہیں خصوصاً جبکہ وہ اپنے لوگوں کے ساتھ نہیں ہوتیں ۔

(۸) ہماری لڑکیوں کے جمالی ذوق کی تکمیل یورپی

موسیقی سے کیوں کرائی جاتی ہے خصوصاً ایسے مدارس میں جو ہمارے صرفہ سے چلائے جاتے ہیں۔ کیا ہماری غریب لڑکیاں آیندہ زندگی میں اِس یورپی ذوق موسیقی کو قائم رکھ سکتی ہیں۔ ہندوستانی موسیقی سے اس قدر بے التفاتی کیوں برتی جاتی ہے جبکہ اِس موسیقی کا سازوسامان سستے داموں خریدا جاسکتا ہے اور ہمارے گھروں کی زینت بن سکتا ہے؟

(۶) ہمارے شہر میں دیکھا گیا ہے کہ بعض عورتیں بظاہر پردہ دار معلوم ہوتی ہیں لیکن جب گاڑیوں میں باہر نکلتی ہیں تو ان کی نشست نمایاں اور جاذب نظر ہوتی ہے، اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں کی شکریں جن میں لڑکیاں مدرسے جاتی ہیں ایسی ہوتی ہیں کہ لڑکی تو ہر ایک کو دیکھ سکتی ہیں لیکن اُسے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ پردے کی کیا تعریف ہے؟ کیا پردہ آنکھ کا ہوتا ہے یا دل کا؟

میری یہ استدعا ہے کہ ٹھنڈے دل سے اِن سوالات کے جواب عنایت فرمائے جائیں جن کو میں نے اپنے ملک کے بہترین مفاد کے لئے قلمبند کیا ہے۔

ایک اشرفی

حسب اعلان سابق ایسے صاحبِ قلم کو دی جائے گی جو جنوری نمبر کے لئے "ہمدردی" پر بہترین مضمون لکھنے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے

جملہ مضامین ۵ ڈسمبر ۱۹۳۱ء تک دفتر ہذا میں وصول ہو جائیں مزید وضاحت کیلئے

ہمجولی نمبر (۴) ملاحظہ فرمایا جاے۔ اِدارہ

گائے کے دودھ پر بچے کی پرورش

ڈاکٹر سید عبدالرحمٰن ایم۔بی۔سی۔ایچ۔بی۔ڈی۔پی۔ایم۔اینڈ ایچ (اڈنبرا)

گزشتہ اشاعت میں گائے کے دودھ کے نقائص پر بحث کی گئی تھی اور یہ بتلایا گیا تھا کہ گائے کے دودھ میں پروٹین کی مقدار عورت کے دودھ کے بہ نسبت دوگنی ہوتی ہے۔ کاربوہیڈریٹ کی مقدار کم اور چربی کی مقدار برابر ہوتی ہے۔ جب ہم بچہ کو گائے کے دودھ یا اور کسی اور جانور کے دودھ پر پرورش کرنا چاہتے ہیں تو ہماری یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ اس دودھ کو حتی الامکان عورت کے دودھ کے مماثل کر دیا جائے۔ چونکہ گائے کے دودھ میں پروٹین کی مقدار دوگنی ہوتی ہے۔ لہٰذا اس میں دودھ کی مقدار کی برابر گرم کیا ہوا پانی ملا دینے سے پروٹین کی زیادتی کی تلافی ہو جاتی ہے۔ لیکن اس طرح کرنے سے کاربوہیڈریٹ جو پہلے سے کم ہوتا ہے اور بھی کم ہو جاتا ہے۔ اور چربی کی مقدار بھی کم ہو جائے گی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے Mork's Glucose یا Lactose استعمال کرنا چاہیئے۔ اور چربی کی کمی Cod Liver Oil یا Cook's 50 p.c emulsion کے اضافہ سے ہو سکتی ہے۔

اس لئے پانی ملے ہوئے دودھ کی مقدار جو بچہ کو پلانی چاہیئے اس حساب سے نکالی جا سکتی ہے کہ بچہ کا وزن جتنے پونڈ ہو۔ اس کو ڈھائی سے ضرب دیں اور اتنے اونس دودھ اس کو روز پلایا جائے مثلاً اگر بچہ کا وزن آٹھ پونڈ ہو۔ تو اس کو بیس اونس دودھ یومیہ پلانا چاہیئے۔ اور چونکہ چربی کی مقدار بھی کم ہوتی ہے اس لئے بچہ کو آدھا چمچہ (چائے کا

.... دودھ کے ساتھ ملاکر دن میں تین مرتبہ دینا چاہئیے۔ ہندوستان میں عام رواج ہے کہ دودھ گرم کرنے کے بعد اس پر سے ملائی نکال کر بچوں کو پلاتے ہیں۔ اس رواج کے متعلق ڈاکٹر گوٹھوسکر صاحب جون ۱۹۳۱ء کے Indian Medical Gazette میں لکھتے ہیں:-

یہ رواج میں نے عام طور سے شمالی اور جنوبی ہندوستان میں دیکھا ہے۔ ایک مرتبہ میرے لیکچر کے بعد ایک ضلع کے ڈپٹی کلکٹر صاحب نے مجھ سے کہا کہ میں ہی پہلا ڈاکٹر ہوں جس نے دودھ کو ملائی نکالنے کے بغیر پلانے کی ہدایت کی ہے۔ ایک اور ڈپٹی کلکٹر صاحب نے جن کا ایک لڑکا جگر کے مرض میں مبتلا ہو کر فوت ہو چکا تھا مجھ سے کہا کہ تمام ڈاکٹروں نے ان کو دودھ میں سے ملائی نکالنے کی ہدایت کی تھی مختلف مقامات میں جہاں میں نے لیکچر دئے ہیں لوگوں کو بہت تعجب ہوتا تھا جب میں ان کو دودھ ملائی نکالنے کے بغیر پلانے کی ہدایت کرتا تھا۔

عموماً رواج یہ ہے کہ گائے کے دودھ میں اسی قدر پانی ملا دیا جاتا ہے اور اس میں سے ملائی نکال لی جاتی ہے اور شکر کا اضافہ نہیں کیا جاتا۔ یہ ایک عام توہم کی بنا پر ہے کہ شکر کے اضافہ سے پیٹ میں کیچوے پڑ جاتے ہیں۔ اس طرح بچہ کو دس بارہ ماہ کی عمر تک دودھ دیا جاتا ہے۔ اور بچہ کی عمر کی فزونی پر اس میں کوئی تغیر نہیں کیا جاتا۔ اگر قبض ہو جائے تو اس گمان پر کہ قبض دودھ کے گاڑھے ہونے کی وجہ سے ہے۔ اس میں اور پانی ملا کر دیا جاتا ہے۔

اس قسم کا دودھ اصل دودھ نہیں ہے۔ اور عورت کے دودھ سے اس میں بہت کم مشابہت ہوتی ہے بچہ کو پروٹین کی مقدار تو کافی ملتی ہے۔ لیکن چربی اور شکر کی مقدار بہت کم ملتی ہے۔ بچہ کی عمر تو بڑھتی جاتی ہے لیکن دودھ میں شکر اور چربی کا توازن ویسا ہی قائم رہتا ہے۔ اس کی وجہ سے بچہ کو قبض ہو جاتا ہے۔ اس قبض کو دور کرنے کی خاطر دودھ کو اور پتلا کر دیا جاتا ہے۔ جس سے اس کی غذائیت اور کم ہو جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آٹھ۔ نو۔ ماہ کی عمر کو پہنچنے تک بچہ سوکھ کر لکڑی ہو جاتا ہے۔ اور اس کو روزانہ اجابت لانے کی خاطر گلیسرین کا حقنہ دینا پڑتا ہے .... اس کے بعد جگر اور طحال بڑھنا شروع ہوتے ہیں۔ اب بچہ کو ڈاکٹر کے پاس لایا جاتا ہے۔ یہاں اس کی خرابی جگر Infantile Billary Cirrhosis کی تشخیص ہوتی ہے اور اس کی زیست سے ناامیدی ظاہر کی جاتی ہے

ہیں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اکثر و بیشتر ہندوستانی بچے جن کی پرورش گائے کے دودھ پر ہوتی ہے۔ اور جن کو ماں کا دودھ کبھی میسر نہیں ہوتا۔ بالآخر اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں"۔

گائے کے دودھ کے نقصانات گذشتہ اشاعت میں بیان کردئے گئے ہیں۔ یہ کسی حالت میں بھی عورت کے دودھ کی برابری نہیں کرسکتا۔ اس لئے ہر طرح کی احتیاط کے باوجود بھی سوء ہضمی کی شکایت بچوں کو ہوجایا کرتی ہے۔ اس کا باعث غذا کے اجزا میں سے کوئی بھی جزو ہوسکتا ہے۔ سوء ہضمی کے وجوہات کی شناخت ضرور ہے۔

(۱) پروٹین کی وجہ سے سوء ہضمی

گذشتہ اشاعت میں بیان کیا گیا ہے کہ دودھ میں دو قسم کے پروٹین ہیں جس میں سے ایک ترسیب پذیر پروٹین ہے (Protein)۔ سوء ہضمی اس کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے موٹے موٹے ڈلے معدہ میں بنتے ہیں جس کو بچہ ہضم نہیں کرسکتا۔ پیٹ میں درد ہوتا ہے اور بچہ روتا ہے۔ اور بے چین رہتا ہے۔ دودھ پینے کے بعد قے کردیتا ہے جس میں ڈلے نکلتے ہیں۔ اکثر قبض رہتا ہے۔ اجابت سخت چکٹ اور سفیدی مائل ہوتی ہے۔ بچہ کا وزن بڑھنا موقوف ہوجاتا ہے بلکہ ممکن ہے کہ کم ہوجائے۔ جب یہ علامات پائی جائیں تو اس کا علاج یہ ہے کہ دودھ میں خفیف مقدار سوڈیم سٹریٹ Sodium Citrate کی ڈالیں۔ ایک وقت کے دودھ میں ۲ گرین سوڈیم سٹریٹ کافی ہے اگر اس سے بھی فائدہ نہ ہو تو دودھ پھاڑ کر دینا چاہئے۔ النبری فوڈ نمبر ۱ Allenbury's Food No. 1 بھی ایسی حالت میں بہت مفید ہے یہ سوکھا ہوا دودھ ہوتا ہے جس میں سے Protein کی کچھ مقدار نکال کر اس کے بجائے البومن اور ملائی کا اضافہ کیا جاتا ہے۔

(۲) کاربوہیڈریٹ کی وجہ سے سوء ہضمی

اس میں پیٹ میں بہت درد ہوتا ہے۔ بچہ روتا رہتا ہے۔ اجابت میں کف ہوتا ہے۔ دست آنے لگتے ہیں۔ اور پاخانہ کے مقام پر خراش ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں Lactose کا استعمال موقوف کردینا چاہئے اور اس کے بجائے Mellin's Food استعمال کرنا چاہئے Mead's Protein Milk بھی بہت مفید ہے

(۳) چربی کی وجہ سے سوء ہضمی

اس میں ابتدا میں قبض ہوجاتا ہے۔ اجابت چکنی

اور سفیدی مائل ہوتی ہے اور کپڑے پر ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتی ہے ۔ اس کی ترکیب میں صابن زیادہ ہوتا ہے ۔ بچہ کا وزن بڑھنا موقوف ہوجاتا ہے ۔ جب مرض زیادہ ترقی کرتا ہے تو پیٹ میں مروڑ ہونے لگتا ہے جس کی تکلیف سے بچہ اکثر اوقات روتا رہتا ہے ۔ دودھ پینے کے آدھ ایک گھنٹے کے بعد بچہ قے کر دیتا ہے ۔ اس سے بھی جب حالت گزر جاتی ہے تو پیچش ہوجاتی ہے ۔ اجابت جلد جلد ، سبزی مائل اور کھٹی بو کی ہونے لگتی ہے ۔ اس میں آؤں اور چکنے ڈلے پائے جاتے ہیں ۔ اگر اس وقت شافی علاج نہ کیا جائے تو حالت بہت خراب ہوجاتی ہے اور بچہ کا وزن سرعت کے ساتھ کم ہونا شروع ہوتا ہے یہاں تک کہ بچہ کے زیست کی امید باقی نہیں رہتی ۔

اس سوء ہضمی کا علاج یہ ہے کہ دودھ میں چربی کی مقدار کم کر دینی چاہیے ۔ دودھ کو چھان کر ملائی نکال لینی چاہیے ۔ Lactose کو بھی حذف کر دینا چاہیے اور اس کے بجائے ملن فوڈ کا استعمال بچہ کی حالت سنبھلنے تک جاری رکھنا چاہیے ۔ اگر اس پر بھی حالت درست نہ ہو تو دودھ پھاڑ کر چھان لینا چاہیے اور اس کو استعمال کرانا چاہیے ۔

ہمجولی کی دلچسپیوں میں اضافہ

کرنے کے لئے آیندہ سے دلچسپ لطایف، کارٹون اور طرح طرح کی تصاویر اور معموں کا بندوبست کیا جارہا ہے ۔ یہ قرار پایا ہے کہ ایک انگریزی نظم معہ اردو منظوم ترجمے کے ہمجولی میں ضرور شائع کی جائے تاکہ ہمارے شعرا کو اپنی ادبی کاوشوں میں انگریزی تخیل سے استفادہ حاصل کرنے کا کماحقہ موقع ملتا رہے امید ہے کہ اس باب میں خاص توجہ فرما کر اس قسم کے منظوم ترجمے بھیج کر ہماری ضرور مدد کی جائے گی ۔

ادارہ

رنگ آمیزی

از جناب تاتاری دہلوی

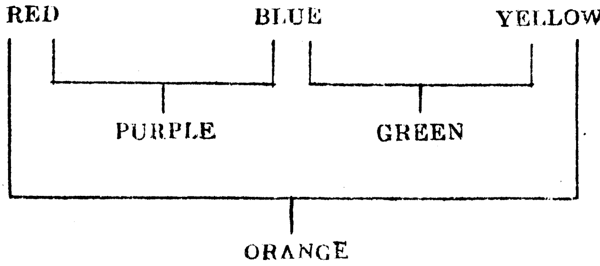
ہمجولی میں رنگ بھرنے کی مشق کے لئے جو خاکے دیے جاتے ہیں وہ بڑے مقبول ہو رہے ہیں جن سے بچوں میں دلچسپی کی ایک لہر دوڑ گئی ہے بعض لائق اور مخلص اساتذہ نے بھی اس ضرورت کا احساس فرما کر ہماری ممکنہ اعانت کا وعدہ فرمایا ہے۔ چنانچہ اس باب میں پیش قدمی کا سہرا مولوی وحیدالدین صاحب تاتاری دہلوی کے سر ہے جنھیں فنونِ لطیفہ سے دلی لگاؤ ہے آپ دہلی کے ایک نامور خاندان کے رکن اور حکیم آغا جان عیش کے پوتے ہیں جو شاہی طبیب ہونے کے علاوہ استاد ذوق کے بعد حضرت بہادر شاہ کی استادی کا فخر رکھتے تھے۔ جن کے کارنامے انجیات میں موجود ہیں۔

تاتاری صاحب کی ابتدائی تعلیم دہلی میں ہوئی اور تکمیل لاہور کے آرٹ کالج میں کی۔ چنانچہ آپ بیس سال سے یو۔پی کے مختلف گورنمنٹ اسکولوں میں بچوں کی ذہنیت کا مطالعہ فرماتے ہوئے ڈرائنگ اور مختلف دستکاریوں کی تعلیم دے رہے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ آپ اپنی بیش قیمت معلومات اور وسیع تجربے سے ہمجولی کے ان صفحات میں نت نئی دلچسپیاں پیدا کر دیں گے۔ جو نئی پود کے لئے ہر طرح مفید اور دلکش ثابت ہونگی۔ ہمجولی

ہمجولی میں جو تحریک نقشہ کشی کی پیش کی گئی ہے اس پر ہم قابل مدیرِ رسالہ کی جدتِ طبع اور دقت شناسی کی داد دیتے ہیں، ہمارا خیال ہے کہ یہ تحریک جلد از جلد مقبول عام ہونے کے ساتھ ہی ساتھ بچوں کی تعلیم میں ایک قابل قدر اضافہ ثابت ہوگی۔

میری رائے میں اگر اس کوشش کے لئے بچوں کی عمر کا تعین کر دیا جاتا تو زیادہ اچھا ہوتا کیونکہ فیصلے کے وقت عمر کا لحاظ رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ دوسرے چھوٹے

بچوں کے لئے یہ کام ذرا مشکل ہے اِن کے لئے کنڈر گارٹن
کی وہ ایک شکلیں جو ہندوستانی طرز میں پیش کی گئی ہیں
اور باقاعدہ بنانے کی ترکیب بتدریج نقشوں کے ساتھ بیان
کی گئی ہے روانہ کرتا ہوں یہ شکلیں بچوں سے زیادہ ماؤں
کے لئے بھی دلچسپی کا باعث ہوں گی جو اُن کے ذریعہ بچوں
کی تعلیم ایک حد تک کھیل ہی کھیل میں پوری کر سکتی ہیں
(یہ اشکال آئندہ درج ہونگی ادارہ) اس کے علاوہ ان نقشوں میں رنگ بھرنے کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ رنگوں کے ملانے کے ہنر سے تھوڑی
بہت واقفیت رکھتے ہوں اِس لئے رنگوں کی آمیزش
کے لئے ابتدائی باتیں روانہ کرتا ہوں اِن میں جو رنگوں کے
شجر سے دیئے گئے ہیں وہ رنگوں ہی میں ہوتے تو زیادہ
مناسب تھا مگر ابتدائی رنگوں کے علاوہ مخلوط رنگوں کا صحت
کے ساتھ چھپنا زیادہ مشکل ہے اور قیمتی بھی اس لئے اُن کی
جگہ صرف نام لکھ کر چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ بہتر ہے کہ



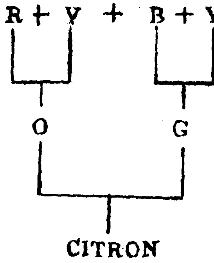
طالب علم خود ان کو ملا کر اپنے تجربے میں اضافہ کریں۔
رنگوں کی عملی بحث اور مختلف اصولوں کی تحقیقات
میں بچوں کو نہیں پڑنا چاہئے۔ اِس لئے ہم صرف
رائج طریقہ ہی اختیار کرتے ہیں۔ ابتدائی رنگ تین
مانے گئے ہیں، لال۔ زرد۔ اور نیلا ان کی خصوصیت
یہ ہے کہ اِن کو ملا کر ہم کم و بیش تمام دوسرے رنگ
بنا سکتے ہیں مگر یہ رنگ خود اور رنگوں کی آمیزش سے نہیں بن سکتے یہی وجہ ہے کہ ہم اِن رنگوں کو مفرد
یا ابتدائی رنگ (Primary Colour) کہتے
ہیں اِن میں لال اور زرد کو ملانے سے نارنجی
رنگ (Orange) بنتا ہے۔ زرد اور نیلا ملانے
سے سبز (Green) رنگ پیدا ہوتا ہے۔ لال اور
نیلا ملانے سے اُودا (Purple or Violet) بن جاتا ہے
یہ بعد کے تینوں رنگ جو پہلے تینوں رنگوں سے

مل کر بنتے ہیں ثانوی رنگ (Secondary colour) کہلاتے ہیں۔ نیچے دیا ہوا رنگوں کا شجرہ دیکھ کر ان رنگوں کو ملانے کی کوشش کرو۔

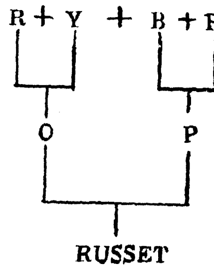
جس طرح پہلے تین رنگوں کے ملانے سے ثانوی رنگ پیدا ہوئے تھے اب ان تینوں ثانوی رنگوں کو باہم ملانے سے تین اور نئے رنگ پیدا ہوں گے جن کو ثالثی رنگ (Tertiary Colour) کہتے ہیں ان کے علحدہ علحدہ نام یہ ہیں:۔

(۱) Citron ترنجی (۲) Olive زیتونی

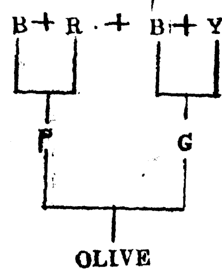
(۳) Russet سیبی جیسا کہ رنگوں کے دوسرے شجرے سے ظاہر کیا گیا۔ اس شجرے کی مدد سے تم خود ان رنگوں کو ملانے کی کوشش کرو۔



(Yellow Grey)



(Red Grey)



(Blue Grey)

مخلوط رنگ

Broken Colour

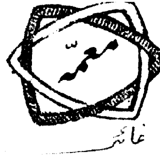
اوپر دیے ہوئے ابتدائی رنگ خالص رنگ ہیں لیکن قدرت کی چیزوں میں خالص رنگ بہت کم پائے جاتے ہیں برخلاف اس کے یہ رنگ تھوڑی سی سیاہی، سفیدی یا گرے کی آمیزش کے ساتھ قدرت کی چیزوں میں نظر آتے ہیں اوران کو مخلوط رنگ (Broken Colour) کہتے ہیں۔ اس لئے استعمال کے وقت مفرد رنگوں کو قدرے، سیاہی، سفیدی یا گرے (Grey) حسب موقع ملا کر مرکب کرلینا چاہیئے اس کا مفصل ذکر گرے (Grey) رنگوں کے ساتھ آئے گا۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان رنگوں میں لال، اور زرد گرم رنگوں کے نام سے پکارے

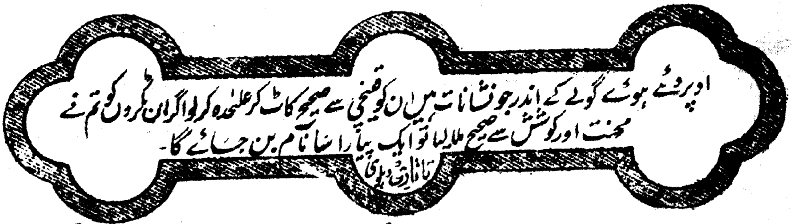
جاتے ہیں یہ رنگ نباتاتی ہیں اور اکثر گرم چیزوں
میں پائے جاتے ہیں مثلاً سورج آگ ، غ
رنگ سرد مشہور ہے۔
کے بنانے میں
وغیرہ سبز ، گ
یہ رنگ

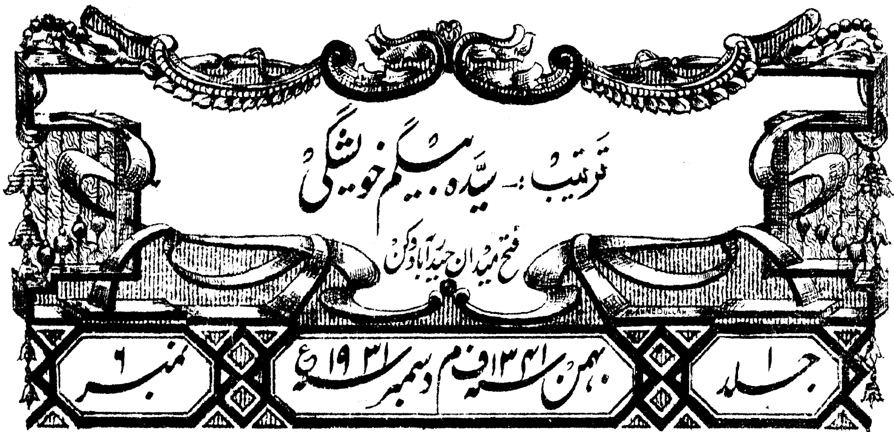
آمیزش ہے جس سے مختلف تاثرات پیدا ہوتے
کہ ، کی جبلت جدا ہے۔ اس لئے ہر ایک
ہوتے ہیں۔




معمّہ

غائب


اوپر دیئے ہوئے گولے کے اندر جو نشانات ہیں ان کو قینچی سے صحیح کاٹ کر علیحدہ کر لو اگر ان ٹکڑوں کو تم نے
محنت اور کوشش سے صحیح ملا لیا تو ایک پیارا سا نام بن جائے گا۔



تاج پریس میں چھپ کر دفتر رسالہ ہمجولی سے شایع ہوا

ہیروں کی وادی

۲

مسز مائیکل پم (واشنگٹن) کی خاص اجازت سے طبع کیا گیا

مترجم: جناب عزیز احمد صاحب بی۔ اے سابق مدیر رنگون ڈیلی نیوز واسٹار الہ آباد
حال مددگار ناظم سررشتہ معلومات عامہ سرکار عالی

ان نامزدگیوں پر بھی بعض شرائط عائد کی گئی ہیں یعنے ایک علاقہ پائیگاہ سے ہو تو ایک پبلک میں سے اور دو کونسل کے ان غیر عہدہ دار اراکین میں سے جن کی میعاد قریب الختم ہو یا بصورت دیگر ان ماہرین فن میں سے جن کی خاص مدد کونسل کے کسی مسودہ قانون کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہو۔

ایسے مسودات قانون جن کا تعلق مالگزاری یا کسی رعایا کے مذہب یا مسائل فوج یا امور خارجہ سے ہو صدر کی اجازت کے بغیر نہ مجلس میں پیش کئے جا سکتے ہیں اور نہ فرمانروائے وقت کے دستخط کے بغیر قانون کا درجہ حاصل کر سکتے ہیں۔ دوسرے مسودات صدر کی منظوری کے ساتھ ہی قانون بن سکتے ہیں لیکن حضور نظام جب چاہیں ان میں ترمیم فرما سکتے ہیں۔

مجلس وضع قوانین کی ہر حالت میں رہنمائی شرع محمدی، شاستر، ریاست کے دوسرے مذہب والوں کے خاص قوانین، رسم و رواج جو قانون کا درجہ حاصل کر چکے ہیں اور تعزیرات ہند و قوانین دیگر مہذب اقوام سے ہوا کرتی ہے۔

مجلس مذکور جس پھرتی کے ساتھ کام کیا کرتی ہے وہ اس حقیقت سے ظاہر ہے کہ ایک سال کے اندر اس نے پینتالیس قوانین اور ترمیمات قوانین منظور کئے جن کا تعلق سمیات، دفائن، اصلاح اطفال، سکہ جات، موٹر گاڑیاں، انجمن ہائے اتحاد باہمی، مردم شماری، عدالت ہائے خفیفہ، ضابطہ فوجداری،

اقوام جرائم پیشہ، قوانین ٹپہ وغیرہ جیسے مسائل سے تھا۔
باب حکومت نو اراکین پر مشتمل ہے یعنے صدر اعظم جن کے تفویض وضع قوانین کا بھی قلمدان وزارت ہوتا ہے اور سات دیگر اراکین جن کے پاس فینانس، مالگزاری عدالت، فوج، تعمیرات عامہ، تجارت و حرفت اور سیاسیات کے قلمدانہائے وزارت ہوا کرتے ہیں باقی ایک رکن کے پاس کوئی قلمدان وزارت نہیں ہوتا۔ گیارہ معتمدیاں ہیں جو زراعت، فینانس، کوتوالی، اعداد و شمار، حفاظت صحت، تعلیمات، آثار قدیمہ، تعمیرات عامہ انجمن ہائے اتحادی، ریلوے وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ ممالک محروسہ کو کئی اضلاع میں منقسم کیا گیا ہے، اور ہر ضلع تعلقوں میں اور ہر تعلقہ متعدد دیہاتوں میں، ہر تعلقہ ایک تحصیلدار کے سپرد ہوتا ہے جو محصول جمع کرتا ہے اور دیوانی اور فوجداری کا کام انجام دیتا ہے اور ہر تحصیلدار اپنے متعلقہ تعلقدار کو جواب دہ ہوتا ہے جو حاکم ضلع ہوتا ہے۔ ہر گاؤں میں پٹیل اور پٹواری بھی ہوتے ہیں
یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حیدرآباد میں عہدہ داروں کا تقرر کس طرح ہوا کرتا ہے۔ اس اہم امر کا انتظام تین طریقوں سے ہوتا ہے۔ چند ماہرین فنون باہر سے براہ راست مقرر کئے جاتے ہیں یا حکومت ہند سے ان کی خدمات مستعار لی جاتی ہیں۔ حیدرآباد بالکل ملکی (جس کا انگریزی میں ترجمہ قوم پرست ہوسکتا ہے) واقع ہوا ہے یہی وجہ ہے کہ غیر ملکی اشخاص جن میں ماہر تعلیم اور اعلیٰ افسران طبابت شامل ہیں نسبتاً کم پائے جاتے ہیں چند اعلیٰ ترین انتظامی عہدوں پر حضور نظام بعض عہدہ داروں کا بذات خود تقرر فرماتے ہیں جنھیں اپنی ہی رعایا میں سے منتخب کیا جاتا ہے۔
ایک سول سروس ٹریننگ اسکول بھی قائم ہے جہاں سے بذریعہ امتحان مقابلہ عہدہ داروں کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ اس اسکول میں داخلہ کیلئے زیادہ تر گورنمنٹ کی جانب سے نامزدگی ضروری ہے۔ ان عہدہ داروں کے ماتحتوں کا تقرر اعلیٰ افسروں کی منظوری کے بعد خود وفائز کیا کرتے ہیں جائدادیں اوّل، دوم اور سوم تین قسم کے گریڈوں پر مشتمل ہوتی ہیں جن کی تنخواہوں میں سالانہ اضافہ ہوتا ہے اور بعد ختم ملازمت وظیفہ دیا جاتا ہے۔
متذکرہ بالا نقشہ ایک شرقی مطلق العنان بادشاہ سے جو اپنے خزانوں میں بدمست پڑا ہو کہیں مختلف نظر آتا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اعلیٰحضرت حضور نظام ایک نہایت ہی قابل شخص ہیں جو اپنی ریاست کے کاروبار کا ذاتی علم رکھنے کی غرض سے صبح پانچ بجے بیدار ہوکر تمام دن کام میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کے نج کے اخراجات ریاست کے موازنہ سے بالکل علیحدہ

سر اکبر حیدری کی ذات ان بہت سے روایتی غلط تصورات کو زائل کرتی ہے جو اہل مشرق کی سستی اور کاہلی کے متعلق پائے جاتے ہیں۔ وہ کوئی تعطیل نہیں مناتے ہفتہ کے ساتوں دن ان کی مصروفیت کے ہوتے ہیں جن میں وہ روزانہ ۱۰ گھنٹے بلا تکان کام کرتے ہیں گویا در وہ کام کرنے کی ایک مشین ہیں۔ ان کے کام کی کثرت اور تنوع حیرت انگیز ہے ایک معمولی شخص سے لیکر بڑے سے بڑے آدمیوں سے لگاتار ملاقات، مثلوں کے گٹھوں کے گٹھوں کا پھرتی کے ساتھ مطالعہ، کمیٹی پر کمیٹی کی شرکت اور اثنائے طعام میں ٹیلیفون کی گفتگو کے جوابات کا غیر مختتم سلسلہ اور پھر ان سب جھمیلوں کے بعد ان کی تازگی چستی، شگفتہ مزاجی اور دنیا کی ہر چیز میں گہری دلچسپی باعث صد حیرت و استعجاب ہے۔

ان کی خانگی زندگی سادگی اور اتقا کا آئینہ ہے۔ بحیثیت ایک پکے مسلمان کے وہ عدیم الفرصتی کے باوجود فریضۂ نماز ادا کرنے کے لئے کسی نہ کسی طرح وقت نکال لیا کرتے ہیں اور نماز فجر کے لئے علی الصباح بیدار ہوتے ہیں جب کبھی شاذ و نادر انہیں تعطیل حاصل ہو جاتی ہے تو ان کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ چند اشخاص کے ہمراہ صبا رفتار عجلت کے ساتھ کسی مشہور عمارت یا آثار قدیمہ کے معائنہ کے لئے چل نکلیں۔

دقت نظر کا یہ حال ہے کہ اس عجلت کے باوجود کوئی باریک سی باریک چیز یہاں تک کوئی اینٹ کوئی تصویر کوئی کتبہ نظر انداز نہیں ہوتا۔ اور واپسی پر لوح دل پر ہر شئے کا نقش صاف و شفاف طریقہ پر ثبت ہوتا ہے۔

انھیں دیکھو تو معلوم ہوگا کہ وہ ایک پستہ قد بھرے بھرے جسم کے سفید بال اور سفید ڈاڑھی والے شخص ہیں جن کی عینک میں سے نہایت تیز آنکھیں چمکتی ہوئی نظر آتی ہیں جسمانی آرائش سے وہ بالکل بے پروا ہیں انھیں دفتر کو پیوندار پتلون بخیال کفایت شعاری پہن کر جانے میں کوئی عار نہیں ہے اور اگر اس پر انکی بیوی حیرت زدہ ہو کر ٹوکیں تو وہ اظہار تعجب کرینگے۔ ان کے شوقیہ مشغلے فنون لطیفہ اور سخاوت ہیں لیکن موخر الذکر کے متعلق وہ کبھی زبان نہیں ہلاتے ان کی داد و دہش اس طریقے سے ہوتی ہے کہ اس کا کسی کو علم تک نہیں ہوتا۔

انھیں کی وجہ سے ایک نہایت زبردست تعلیمی تجربہ معرض وجود میں آیا جس کا ہندوستان کے تعلیماتی خیالات پر گہرا اثر پڑ رہا ہے۔ مختصر الفاظ میں اس تجربہ کو "مادری زبان میں اعلیٰ تعلیم" کہا جاسکتا ہے اور در اصل یہ خیال نہایت معقول ہے



سر اکبر حیدری نوّاب حیدر نواز جنگ بہادر صدر المہام فینانس

سراکبر حیدری نے اپنی یادداشت میں ریاست کے تعلیمی ناکامی کے اسباب بتلاتے ہوئے ان خامیوں کا بھی ذکر کیا تھا جو ہندوستان کے موجودہ طریقہ تعلیم میں پائی جاتی ہیں مثلاً طالب علم کے حافظہ پر غیر معمولی بار، اسکے وقت کا کسی مضمون کے مطالعہ میں غیر زبان کی پیچیدگیوں پر عبور حاصل کرنے میں ضائع ہونا جسکی وجہ سے اسکی جدت طبع کا خون ہوتا ہے اور بی۔اے کامیاب ہونے کے بعد وہ اپنے خیالات سے اپنے ہم وطن بھائیوں کو ان کی مادری زبان میں مستفید نہیں کر سکتا نتیجتاً تعلیم یافتہ طبقوں اور عوام کے درمیان ایک ناقابل عبور خلیج پیدا ہو جاتی ہے۔

حیدرآباد کی آبادی کا تین فیصدی حصہ انگریزی داں ہے، ۹ فیصدی کا مادری زبان اردو، تلنگی، مرہٹی یا کنڑی ہے اور تین فیصدی ایسے ہیں جو باقی آٹھ زبانوں میں سے ایک نہ ایک بولتے ہیں۔ یہ آٹھ زبانیں بعض قبیلوں کی بولیاں ہیں جنکا کوئی ادبی ذخیرہ نہیں ہے اردو ریاست کی سرکاری زبان ہے جو دربار میں اور شائستہ سوسائٹی میں رائج ہے۔ علاوہ ازیں وہ بذات خود ایک وسیع ادبی ذخیرہ رکھتی ہے لیکن اسمیں موجودہ سائنٹیفک علوم کی کتابیں بہت کم تھیں لہذا جامعہ عثمانیہ کے قیام کے ساتھ جو اعلیحضرت حضور نظام کی شاہانہ فیاضی کے باعث وجود میں آئی ایک دارالترجمہ کی بھی بنیاد پڑی جہاں نہ صرف انگریزی بلکہ فارسی اور عربی کتابوں سے اردو میں ترجمہ کئے جاتے ہیں۔ یہ امر کہ جامعہ کا قیام مفید ثابت ہوا اس چیز سے ظاہر ہے کہ اسکے طالب علموں کی تعداد ایکہزار تک پہنچ رہی ہے اور ان میں سے بعض نے اعلیٰ تر تعلیم کے سلسلہ میں یورپ وغیرہ میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔

جگہ کی قلت کے باعث حیدرآباد کی آبپاشی کے کام، صنعتی و حرفتی ادارے، مدارس نسواں، انجمن ہائے اتحادی ریلوے زراعتی مظاہرات اور دیگر دلچسپ امور کا ذکر یہاں نہیں کیا جا سکتا اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ایک حد تک نقائص اور مشکلات بھی موجود ہیں لیکن اصل چیز یہ ہے کہ ریاست میں زندگی کی ایک لہر دوڑ رہی ہے جسکے باعث وہ شاہراہ ترقی پر تیزی کے ساتھ گامزن ہے یہاں تک کہ بہت سے اہم امور میں وہ برطانوی ہند پر بھی سبقت لیگئی ہے۔ شہر یا اضلاع کے معائنہ سے پھرتی اور امید افزا مستقبل کے آثار نظر آتے ہیں رعایا اپنے کاروبار میں نہایت خوشحالی اور شائستگی کے ساتھ مصروف دکھائی دیتی ہے۔ حیدرآباد اور سکندرآباد کے بڑے ریلوے اسٹیشن پر کاروباری لوگوں کا ہجوم نظر آتا ہے۔ موٹر ٹکسیاں، گھوڑے گاڑیاں، بائیسکل اور بنڈیاں سڑکوں پر رواں دواں دکھائی دیتی ہیں جنھیں پولیس والے پھرتی کے ساتھ راستہ بتاتے رہتے ہیں۔

حیدرآباد اپنے جملہ نشیب و فراز کے باوجود اس

کوشش کی نہایت عمدہ مثال پیش کرتا ہے جو ہندوستان خود مختار ہونے کے بعد کر سکتا ہے۔ وہاں اگرچہ کوئی پارلیمنٹری ادارہ نہیں ہے لیکن اس کے بجائے ایک ایسی دستوری حکومت قائم ہے جس میں موثر طریقہ پر عوام کی نمائندگی کیجاتی ہے۔ سازشوں کا وجود ضرور ہے لیکن اسی حد تک جیساکہ لندن، پیرس، واشنگٹن یا دہلی میں پایا جاتا ہے نہ ان سے کم نہ ان سے زیادہ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کا مستقبل متعدد صورتوں میں انکی دیسی ریاستوں سے وابستہ ہے فقط

ایک اور نیا نستعلیق ٹائپ

مسٹر قریشی بی۔اے نے اپنے مجوزہ ٹائپ کا ایک چھپا ہوا نمونہ ہمارے پاس بھیجا ہے جو بظاہر بہت دلکش ہے۔ اس کے جوڑ بھی اس خوبی سے ملے ہوئے ہیں کہ بالکل لائن بلاک کا دھوکہ ہوتا ہے حروف کی کڑیاں اپنی اپنی جگہ نگینہ معلوم ہوتی ہیں تاہم جب تک خود ٹائپ بہ کمال و تمام ہماری نظروں کے سامنے نہ آئے صرف نمونہ دیکھ کر یہ بتلانا مشکل ہے کہ تجارتی نقطۂ نظر سے اس کی کامیابی کہاں تک ممکن ہے نستعلیق ٹائپ کی ساخت میں جہاں اور طرح طرح کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان میں "قرن" kern کا عدم جواز بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے ہمیں اس نمونے سے اس کا پورے طور پر اندازہ نہ ہو سکا اور نہ یہ معلوم ہو سکا کہ ٹائپ کی تقسیم میں کہاں تک آسانیاں پیدا کی گئی ہیں۔ نمونے میں الفاظ کے ساتھ یائے مجہول کا استعمال بھی نہیں دکھایا گیا ہے تاکہ قرن کے لاینحل مسئلہ پر کچھ روشنی پڑ سکتی۔

تاہم مسٹر قریشی کی ہمت نہایت قابل قدر ہے جنھوں نے اس خارزار میں یکہ و تنہا گامزن ہوکر ترویج نستعلیق ٹائپ کے وسیع امکانات پیدا کر دئے ہیں۔ ہمیں قوی امید ہے کہ سرکار عالی اپنی ان تھک کوششوں میں قریشی صاحب کی محنت کے اشتراک کو کشادہ دلی سے قبول فرماکر بہت جلد کسی صحیح نتیجہ پر پہنچ جائیگی۔

ادارہ

واہ رِی ہماری تعلیم!

از جناب مرزا عبدالحمید بیگ صاحب بی اے۔ بی۔ ٹی (علیگ)

عام طور پر موٹر کار چار پہیے والی ہوتی ہے گو زمانہ حال میں بعض ایسی موٹریں بھی ایجاد ہوئی ہیں جن کے تین پہیے ہیں لیکن ہماری زندگی کی جو تعلیمی موٹر کار ہے اُس کے صرف دو ہی پہیے ہیں یعنی ایک جسم دوسرا دماغ۔ انہی دو پہیوں کے بل پر یہ گاڑی چلتی ہے اور اخلاق کے پٹرول سے اس کی کھنچائی ہوتی ہے اس گاڑی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان تینوں چیزوں میں سے اگر کوئی نہ بھی ہو تب بھی یہ گاڑی برابر چلتی رہتی ہے البتہ اس کی رفتار میں فرق آجاتا ہے، اگر اخلاق کا پٹرول کافی مقدار میں ہو اور جسم و دماغ دونوں پہیے بھی اچھی حالت میں ہوں تو اس گاڑی کے کیا کہنے۔ ایسی سبک رفتاری اور خموشی سے چلتی ہے کہ بیٹھنے والے کو معلوم بھی نہیں ہوتا کیونکہ اس کے گدے استقدر لچکدار ہوتے ہیں

اگر اس کی راہ میں مشکلات کے گڑھے بھی آجائیں تو بھی ان پر سے اس طرح گذر جاتی ہے کہ ہم کو خبر تک نہیں ہوتی۔ اگر اخلاق کا پٹرول کم ہو مگر دونوں پہیے صحیح و سالم ہوں تب بھی گاڑی تو برابر چلتی رہتی ہے مگر ہمیشہ اس کے بے موقع رک جانے کا خدشہ لگا رہتا ہے اسی طرح اگر دونوں پہیوں میں سے ایک پہیہ خراب بھی ہو تب بھی وہ رکتی نہیں البتہ ایسی صورت میں اس کے ایک طرف الٹ جانے کا ڈر لگا رہتا ہے۔ اس لئے زندگی کی گاڑی کو اچھی حالت میں چلانے کے لئے یہ امر نہایت ضروری ہے کہ اس میں پٹرول بھی کافی مقدار میں ہو اور دونوں پہیے بھی اچھی حالت میں ہوں۔ دونوں پہیوں کو اچھی حالت میں رکھنے کیلئے چاہیے کہ اس میں "استعمال" کا تیل برابر پڑتا رہے اگر یہ تیل نہ ڈالا گیا تو اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ پہیے

زنگ آلود ہو کر بیکار ہو جائیں گے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ ہم اپنی سائیکلوں اور موٹروں کی تو اس قدر احتیاط کرتے ہیں کہ روزانہ ان کو صاف کر کے اس میں تیل وغیرہ لگاتے رہتے ہیں مگر اپنی زندگی کے موٹر کی طرف سے بالکل بے پرواہی و غفلت برتتے ہیں اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ اس گاڑی کی خرابی ہم کو فوراً محسوس نہیں ہوتی۔ اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ اس میں کوئی نقص پیدا ہی نہیں ہوا۔ اور سچ بھی یہ ہے کہ ہم کو خود اس نقص و خرابی کا اندازہ نہیں ہوتا۔ دراصل یہ کام ہے ہمارے والدین و اساتذہ کا کہ وہ ہمیشہ اس چیز کو مدنظر رکھیں کہ ہماری زندگی کی کل کا ہر ایک پرزہ اچھی حالت میں رہے۔ اگر ان دونوں طبقوں نے اس طرف کافی توجہ کی تو یقیناً ہماری گاڑی بہت ہی عمدہ طور پر چلتی رہے گی مگر ہماری بدقسمتی سے اس چیز پر کما حقہٗ توجہ نہیں کیجاتی۔ والدین کا لاڈ و پیار اور استادوں کی عدم توجہی کے باعث ابتدا ہی سے ہم میں نقص پیدا ہو جاتے ہیں جو رفتہ رفتہ جڑ پکڑتے رہتے ہیں اور بالآخر ہم میں اس قدر مستحکم ہو جاتے ہیں کہ پھر اُن کو ترک کرنا اگر انسانی قوت سے باہر نہیں تو بے انتہا مشکل ضرور ہو جاتا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ جب یہ حالت پیدا ہو جاتی ہے تو سب ہم کو ہی بُرا بُرا کہتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ اس کی اصلی وجہ کیا ہے۔ چنانچہ اس قسم کی ناقص گاڑی کی ایک مثال ہمارے پیش نظر ہے جو آپ کی تفریح طبع کی خاطر پیش ہے وھوا ھذا

میاں اکبر بقول شخصے پوتڑوں کے نواب تھے۔ اکلوتے ہونے کی وجہ سے ماں کی آنکھ کا نور اور باپ کے دل کا سرور تھے یہی وجہ تھی کہ ان کی پرورش بھی بہت ناز و نعم اور لاڈ و پیار سے ہوئی تھی۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ ان کو ذرا ٹیڑھی نگاہ سے تو دیکھ لے۔ دولت کی لچھمی ہر وقت ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔ کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ ادھر ان کے منہ سے بات نکلی اُدھر اس کی تکمیل ہوئی۔ ان کے والد نواب مختصر نواز جنگ بہادر گو لکھے پڑھے اور سمجھدار آدمی تھے اور ان کو معلوم تھا کہ اس لاڈ و پیار کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ مگر اول تو خود اپنی محبت سے مجبور تھے دوسرے بیگم صاحبہ کی مروت کا بہت پاس تھا کہ کہیں میاں اکبر کے معاملہ میں ان کا دل میلا نہ ہو وہ اپنے نور چشم پر پروانہ وار فدا تھیں۔ اور ان کو یہ ہرگز گوارا نہ تھا کہ اکبر کا ننھا سا دل و دماغ زمانہ حال کی تعلیم کی الجھنوں میں پھنس کر زیر بار ہو اسلئے نواب صاحب نے بھی ان کی تعلیم کے معاملہ میں

ڈور بالکل ڈھیلی چھوڑ دی تھی۔ اوّل تو انتہائی لاڈو پیار اوس پر دولت کی ریل پیل اور پھر اللہ کے فضل سے تعلیم و تربیت کی طرف سے عدم توجہی سب پھر کیا تھا ان سب چیزوں نے مل کر کریلے کو نیم پر چڑھا دیا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ میاں اکبر کی دماغی و ذہنی نشو و نما بالکل نہ ہوئی اور بچارے کا ننھا سا دماغ ٹھٹھر کر رہ گیا۔ آپ ہی فرمایئے اس میں اس غریب کا کیا قصور ؟

ابتدائی زمانہ جو دراصل حقیقی تعلیم و تربیت کا وقت ہوتا ہے وہ تو والدین کی عنایت سے بالکل بیکار گزر گیا لیکن جب میاں اکبر ذرا بڑے ہوئے تو اونکو بھی طور پر مدرسے میں داخل کر دیا گیا۔ جہاں انھوں نے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ بیٹھ کر تعلیم حاصل کرنی شروع کی۔ بچارے استاد بھی پریشان تھے کہ ان کو کیا پڑھائیں۔ سختی ان پر کر نہیں سکتے تھے۔ خود سے ان کو کوئی شوق نہ تھا کام چلے تو کیسے چلے۔ تکمیل ضابطہ کیلئے گھر پر بھی دو دو استاد مقرر تھے لیکن وہ بھی اتنے بیوقوف نہ تھے کہ خواہ مخواہ ان پر دماغ پاشی کر کے ان سے خود بُرے بنتے اس لئے تھوڑی دیر ان کی ہاں میں ہاں ملا کر اپنا وقت گزار دیتے اور پھر ٹھنڈے ٹھنڈے گھر سدھارتے۔

اب آپ خود اندازہ لگا لیجئے کہ ایسے پیل و نہار میں ان کی تعلیم کیا خاک ہوئی ہوگی۔ مگر اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ اس نے ان کے دولت و اثر کو ان کے لئے ترقی کا ذریعہ بنا دیا اور میاں اکبر کو سال بہ سال ترقی ملتی رہی حتیٰ کہ وہ جماعت میٹرک میں پہنچ گئے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ آپ سب حضرات خود اس منزل سے گزر چکے ہیں اور آپ کو معلوم ہے کہ یہ راہ کس قدر کٹھن ہوتی ہے۔ اس جماعت کی پڑھائی اور وہ بھی خاص کر موجودہ زمانہ میں بڑی ٹیڑھی کھیر ہو گئی ہے پڑھنے والے کو بس ناک چنے چبوا دیتی ہے۔ مضمونوں ہی کی اتنی بھرمار ہوتی ہے کہ صرف اس کے نام ہی سے روح خشک ہو جاتی ہے۔ اس جماعت کے امتحان پر نہ دولت و اثر کا جادو چلتا ہے اور نہ سفارش ہی کام دیتی ہے (گو دنیا میں کوئی اصول بلا استثنیٰ کے نہیں مل سکتا) یہاں جو چیز کام دیتی ہے وہ اپنی محنت ہے اور بچارے اکبر محنت کے نام سے کوسوں دور۔ اب بھلا ان کا گزر کیسے ہوتا۔

مختصر یہ کہ وہ مدرسہ صرف تفریح کرنے تشریف لیجاتے اور واپس آ جاتے۔ امتحان میٹرک کے مضمون سمجھنے کی اول تو ان میں صلاحیت ہی نہ تھی دوسرے وہ کبھی کوشش بھی نہیں کرتے تھے۔ اساتذہ بھی سمجھدار تھے

اُن کو جماعت میں ان کی موجودگی چنداں بار نہ گزرتی تھی۔ کیونکہ ہر جماعت میں ایسے پنشن خوار اور آنریری ممبر ہوا ہی کرتے ہیں۔ البتہ طلباء کو اس سے ایک یہہ فائدہ تھا کہ بچاروں کو دل بہلانے کا موقع ملجاتا تھا۔ طلبا اور وہ بھی میٹرک کے طلباء آفت کا پرکالہ ہوتے ہیں وہ بھلا ان نواب صاحب کو کب بخشنے والے تھے ذرا موقع ملتا کہ وار کرجاتے اور ان کو بنانے میں کوئی کسر باقی نہ رکھتے۔ مگر لطف یہ کہ نواب صاحب کو اس کا احساس بھی نہ ہوتا کہ اُن کو بنایا جارہا ہے کیونکہ اُن کو تو خوشامدانہ باتیں صبح و شام سننے کا اتفاق ہوتا تھا وہ ہمیشہ یہی سمجھتے کہ یہ لوگ میری تعریف کررہے ہیں۔ اس سادہ لوحی کا آخر کیا علاج ہوسکتا ہے اور طلبا کی یہ حالت کہ ادھر نواب صاحب بیٹھ موڑتے ادھر یار دوست ایک دوسرے کی کمر ٹھونکتے کہ واہ میاں واہ خوب بنایا!۔

غرض اسی طرح ہنسی خوشی سب کا وقت کٹ جاتا تھا۔ ایک روز ایک نہایت ناگوار واقعہ پیش آگیا۔ انگریزی کا گھنٹہ تھا استاد صاحب ہملٹ کے ڈرامہ کا ایک نہایت ادق حصہ یعنی "To be or not to be" لڑکوں کو پڑھارہے تھے۔ بہت دیر تک الٹ کر پلٹ کر اور طرح طرح کی مثالیں دیکر اس کا مطلب طلبا کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کرتے رہے اس کے بعد جو لڑکوں سے پوچھا کہ کہو بھئی سمجھ میں آیا تو کسی نے تو بے پرواہی سے فوراً "جی ہاں" کہدیا۔ کسی نے رکتے رکتے "جی نہیں" کی آواز نکالی اور کسی نے دوبارہ سمجھانے کی فرمائش کی۔ ایک منچلے صاحب جرأت کرکے یہ کہہ اٹھے کہ ماسٹر صاحب ہم تو ہم ایک دفعہ سمجھانے میں تو شاید لغات کمیٹی کے رکن بھی اس کو نہ سمجھ سکینگے۔ فقرہ کچھ چبھتا ہوا ضرور تھا مگر استاد سمجھدار تھے پی گئے اور ہنس کر ٹالدیا مگر واقعی اس ستم ظریفی کو تو ملاحظہ فرمایئے کہ کہاں بچارے میٹرک کے کم استعداد طلباء اور کہاں شکسپیر۔ قہر درویش بجان درویش والا مضمون تھا اب بچارے کرہی کیا سکتے تھے کیونکہ وہ نصاب میں شریک تھا استاد کو پڑھانے اور طلبا کو رٹنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا چنانچہ اس سبق کو از سر نو شروع کرنے کا ارادہ کیا چونکہ وہ نفسیات سے واقف تھے اس لئے ان کو معلوم تھا کہ بچے کسی ایک مضمون پر زیادہ دیر تک توجہ قائم نہیں رکھ سکتے اس لئے سوچا کہ لاؤ پہلے ان کا دل بہلادوں پھر سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ اس خیال سے بچوں سے کہنے لگے دیکھو بھئی ہم ایک پہیلی کہتے ہیں تم اس کو بوجھنا۔ دیکھیں سب سے پہلے کون بوجھتا ہے۔ پہیلی کا نام سنتے ہی لڑکے خوشی سے اچھل پڑے اور کہنے لگے

"فرمائیے ماسٹر صاحب"۔ استاد صاحب بولے "ایک جانور
ایسا جس کی دُم پر پیسہ" پہیلی بالکل معمولی تھی اور ظاہر
ہے کہ اس سے مقصد محض تفنن طبع تھا۔ ہر ایک لڑکے
نے جواب دینے کے لئے ہاتھ اٹھا دیا۔ میاں اکبر نے
بھی اپنے دماغ پر زور ڈالا مگر جب اس نے یاری نہ کی
تو پوچھنے لگے مولوی صاحب اس کا اتا پتا تو بتائیے
ماسٹر صاحب نے مسکرا کر کہا کہ میاں وہ ایک خوشنما پرندہ ہے
اکثر باغوں اور جنگلوں میں............ "استاد صاحب
ابھی اپنا فقرہ پورا بھی نہ کرنے پائے تھے کہ میاں اکبر
جھٹ سے بول اٹھے کہ "اُلّو ہے ۔ ماسٹر صاحب"۔

ان کی زبان سے یہ فقرہ نکلنا تھا کہ جماعت
میں ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔ کسی نے ماسٹر صاحب کی
شکل دیکھی کسی نے نواب صاحب کی۔ اور اسی دل لگی
میں گھنٹہ پورا ہو گیا۔ ابھی "اُلّو ہے مولوی صاحب"
کی دل لگی ختم بھی نہ ہوئی تھی ایک اور دل لگی کا سلسلہ
شروع ہو گیا۔ نواب صاحب جو کمرے سے باہر نکلے تو
خود ایک تماشہ بن گئے۔ لڑکوں کا ایک غول کا غول
ان کے پیچھے پیچھے ہو گیا اور طرح طرح کے فقرے چست
ہونے لگے۔ نواب صاحب اول تو بہت گھبرائے بیچارے
کی سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ یہ کیا ماجرا ہے لیکن ایک دفعہ
ہی جو مڑ کر دیکھا تو پیچھے کوٹ میں ایک دُم لٹکتی نظر آئی۔
گویا یاروں نے ان کو آدم کے زمرے سے خارج کر کے
ڈارون کی فہرست میں شریک کر دیا تھا۔ نواب صاحب
اس پر بہت جھنجھلائے۔ دُم کو نوچ کر جو دیکھا تو اس
پر جلی حروف میں "بو دم بے وال" لکھا ہوا تھا۔ ہم
سبقوں کی اس ناشائستہ حرکت سے نواب صاحب
کے مزاج کا پارہ بہت چڑھ گیا تھا۔ اس قدر برہم
ہوئے کہ فوراً مدرسہ چھوڑ کر گھر آئے اور سارا ماجرہ اپنے
والد صاحب سے کہہ سنایا۔ خوش قسمتی سے ان کے والد
سمجھدار آدمی تھے اور مدرسے کے بچوں کی شرارت
سے بھی واقف تھے۔ ہنس کر بولے بیٹا برا کیوں مانتے
ہو بچے تو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ شرارت
کیا ہی کرتے ہیں تمھاری تعلیمی حالت ناقص ہے اور
تم بلا سوچے سمجھے بول اٹھتے ہو اس لئے تمھارے
ساتھیوں کو موقع ملجاتا ہے۔ چلو جانے دو محنت کر کے
ساتھیوں کے برابر آجاؤ پھر تم کو کوئی نہیں ستائے گا

معلوم نہیں یہ کونسی نیک ساعت تھی کہ نواب
صاحب کے ان لفظوں نے میاں اکبر کے دل پر
بہت گہرا اثر کیا اور انھوں نے اسی وقت دل میں
ٹھان لی کہ اب وہ بھی محنت کر کے اپنے ساتھیوں
کے برابر آجائیں گے

دن توجوں توں کر کے گزر گیا اب رات آئی۔

کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر انھوں نے اپنے پڑھنے کا انتظام شروع کیا۔ میز پر کتابیں جمائیں۔ قلم دوات اور پنسل لاکر سامنے رکھی اور آرام کرسی پر لیٹ کر سوچنے لگے کہ کونسی کتاب شروع کروں۔ ایک ایک کر کے سب کتابوں پر نظر دوڑائی ایک کا سرورق پڑھا دوسری کے چند ورق الٹے مگر فیصلہ نہ کرسکے کہ کیا پڑھنا چاہیئے اسی ادھیڑبن میں رات زیادہ ہوگئی مگر ان کا فیصلہ نہ ہوسکا۔ آخر کار ادھر گھنٹے نے ٹن ٹن بارہ بجائے اُدھر میاں بے دال کے بودم نے کتاب سنبھالی۔ آخر تھے نا بے دال کے بودم۔ مگر وہ وقت بھی ہیں بھلے آدمیوں کے پڑھنے کا ہوتا ہے تھوڑی دیر تک تو بغیر کسی ارادے کے ورق گردانی کرتے رہے آخر کتاب میز پر رکھ آرام فرمانے لگے۔ اس طرح آرام کرتے ابھی زیادہ دیر نہ گذری تھی کہ باہر سے شوروغل کی آواز سنائی دی۔ معلوم ہوا کہ شہر میں ڈھنڈورا پیٹا جارہا ہے کہ انجمن افتراق المسلمین کے صدر حامی جدل مانع امن بدر الجہلا امام السفہا مولانا مولوی غافل الدین ادام اللہ فتنہٗ کی صدارت میں آج شام کو محلہ جہل پورہ کے بڑے میدان میں ایک جلسہ منعقد ہوگا جس میں پروفیسر جہاندیدہ خانصاحب آئی۔بی۔سی۔ایچ ”موجودہ تعلیم“ پر لکچر دیں گے۔ چونکہ میاں بے دال کے بودم کے دماغ کی تعلیمی کوٹھری کا دروازہ کھل چکا تھا اس لئے ”موجودہ تعلیم پر لکچر“ کے الفاظ نے بھی وہاں جگہ پالی اور انھوں نے ارادہ کرلیا کہ یہ لکچر ضرور سننا چاہیئے۔ اور بے چینی کے ساتھ گھڑیاں گننے لگے۔ شام کرنی ان کے لئے جوئے شیر لانے سے کم نہ تھی۔ اللہ اللہ کر کے وقت کٹا۔ شام ہوئی اور میاں اکیسر نہا دھو بید ھے محلہ جہل پورہ کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ راستہ میں انھوں نے دیکھا کہ لوگ جوق جوق اُس طرف چلے جارہے ہیں لوگوں کی ایک لین ڈوری ہے کہ تمام شہر سے سمٹ کر اس محلہ کی طرف چلی آرہی ہے کسی طرح تانتا ختم ہی نہیں ہوتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مسلمان نماز پڑھنے عید گاہ چلے جارہے ہیں ایک طرف ان کو اپنے ہم سبقوں کی ٹولی بھی نظر پڑی مگر آنکھیں چار ہوتے ہی صبح کا واقعہ ذہن میں چکر کھانے لگا۔ تیور پر بل آگئے اور انھوں نے فوراً ادھر سے منہ موڑلیا۔ ساتھی بھی تاڑ گئے کہ آج نواب صاحب برہم ہیں۔ قریب جانا ٹھیک نہیں لہٰذا انھوں نے بھی مسکرا کر اپنا منہ پھیرلیا اور اپنی راہ لی آخر محلہ جہل پورہ آپہونچا اور سامنے ہی ایک بڑا سا میدان نظر پڑا جس میں سینکڑوں آدمی جمع تھے قریب پہنچے تو دیکھا کہ املی کے ایک گھنے

درخت کے نیچے ایک تخت نئی اور پرانی تہذیب کا سنگم بنا ہوا ہے۔ ہر دو تہذیب کے نمائندے آپس میں ملے جلے بیٹھے ہیں ایک دراز ریش مولوی صاحب کرسی صدارت پر جلوہ افروز ہیں ان کے سامنے ایک کرزن فیشن مسٹر کھڑے تقریر فرما رہے ہیں یہ ایک غیر معمولی اور عجیب منظر تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی قومی ہمدرد نے شیر اور بکری کو ایک گھاٹ پانی پلانے کی خاطر آپس میں آرمسٹس کرا دیا تھا۔ مقرر صاحب کے سامنے دور دور تک چاروں طرف آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ کہیں تل رکھنے کو بھی جگہ نہ تھی غالباً مولوی کی صدارت اور مسٹر کی تقریر نے جادو کا کام کیا اور شہر کی تمام آبادی کو گھسیٹ بلایا تھا مقرر کے قریب جانے کا خیال کرنا تو عبث تھا اس لئے میاں اکبر جہاں جگہ ملی اسی کو غنیمت جان التی پالتی مار بیٹھ گئے اور کان مقرر کی طرف لگا دیئے مگر اتنے بڑے مجمع میں آخر کہاں تک آواز جاتی "گنجارے" یعنی "لاؤڈ اسپیکر" سے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا مگر وہ بدبختی ایجاد تھی اس لئے اس کا استعمال جائز نہیں خیال کیا گیا اور مجبوراً سامعین کو صرف اپنے ہی کانوں پر بھروسہ کرنا پڑا۔ غرضیکہ جو کچھ سنائی دیا اسی پر اکتفا کیا اور وہ یہ ہے۔

"عزیزو زمانہ نازک ہے۔ خواب غفلت سے جاگو۔ علم کی قدر و قیمت پہچانو اس وقت اگر سستی کی تو یاد رکھو پھر برا حشر ہوگا۔ کیونکہ اب تو وہ زمانہ آنیوالا ہے کہ بغیر علم کے جینا تو جینا مرنا بھی مشکل ہوگا........

مانا کہ کسی زمانہ میں تم علم کے میدان میں سب سے آگے تھے۔ دنیا تمھاری رہین منت ہے لیکن آخر پدرم سلطان بود کے گیت کب تک الاپوگے۔ ذرا سوچو تو سہی اب تمھاری کیا حالت ہے۔ اب تو تمھاری رفتار کچھوے سے بدتر ہے گو یہ سچ ہے کہ تمھاری رگوں میں ابھی پرانا خون باقی ہے۔ اگر دل پہ لے لو تو خرگوش سے آگے بڑھ جاؤ گے مگر تمھاری نیند بلا کی ہے اب جا........"

اس جگہ پر ایک ناگوار واقعہ پیش آگیا۔ جس کی وجہ سے بڑی گڑبڑ ہو گئی اور مقرر صاحب کو بھی رکجانا پڑا۔ کالج کے ایک نوجوان طالبعلم اور ایک ڈاڑھی والے مولوی میں جگہ کے معاملہ پر چل گئی۔

اوّل مولوی صاحب اس نوجوان طالب علم پر خوب برسے اس کو ڈاڑھی منڈا کافر مردود اور نہ معلوم کیا کچھ کہہ ڈالا۔ مگر اس صدی کا ڈاڑھی منڈا بھی بھلا کب چوکنے والا ہے اس نے بھی مولوی صاحب کو

خوب آڑے ہاتھوں لیا دل کھول کر صلواتیں سنائیں
منافق ریاکار گندم نما جو فروش وغیرہ وغیرہ کے خطاب
عطا فرمائے آخر توتو میں میں سے بڑھتے بڑھتے نوبت
ہاتھا پائی پر آگئی مگر قریب کے لوگوں نے بیچ بچاؤ
کر دیا۔ یہ حالت دیکھ کر صدر جلسہ نے خوب ٹھنڈا آہ
یہی تو ہماری حالت ہے جس کی وجہ سے دنیا ہم پر ہنستی
ہے۔ ہائے افسوس وہ قوم جس نے دنیا کو تہذیب
سکھائی ہو جس نے سب سے پہلے اتحاد و اخوت کا
سبق سکھایا ہو آج ایسی ذلیل و خوار ہو گئی ہے کہ
نفاق و شقاق اس کی خصوصیات میں داخل ہو گئے
ہوں۔" بارے بڑی مشکل سے دونوں ٹھنڈے ہوئے
کسی طرف سے لعنت و پھٹکار کی آواز آئی اور کہیں
سے شرم شرم کی۔

خیر صاحب اِن دونوں کی لڑائی جھگڑے سے
ہمارے دوست نواب صاحب نے خوب فائدہ اٹھایا
مجمع میں جو بد انتظامی و بد نظمی پھیل گئی تھی اس کو انھوں
نے تائید ایزدی سمجھی اور دھکا پیل کرتے ہوئے کسی
نہ کسی طرح مقرر صاحب کے سامنے جا بیٹھے اب تو پورا
اطمینان ہو گیا کہ سب کچھ سنائی دیگا جب مجمع میں پھر
سکون ہو گیا تو مقرر صاحب نے اپنی تقریر جاری کی۔

"تو ہاں حضرات میں آپ کو یہ بتا رہا تھا کہ
آج کل تعلیم کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہو گیا ہے۔ ہمارے
کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبا بچارے لدّو اونٹ
سے کم نہیں۔ غریبوں پر مضمونوں کی اس قدر بھر مار
اور ٹھونسم ٹھانس ہوتی ہے کہ یا تو دماغ بالکل ہی
نِکل جاتا ہے اور اگر نکلتا نہیں تو چل ضرور جاتا
ہے۔ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ خود میں آپکے
سامنے اس کی زندہ مثال کھڑا ہوں مجکو دیکھئے اور
عبرت حاصل کیجئے بھائیو! بی۔ اے پاس کرنے
تک تو کبھی میرے ذہن میں بھی یہ نہیں آیا کہ آخر میں
دنیا میں کروں گا کیا۔ مگر جب بی۔ اے پاس کر چکا
تو اس کی فکر دامنگیر ہوئی بالآخر "علم الخرافات و
لغویات کی اعلیٰ ڈگری حاصل کرنے کی خاطر میں "عدم
یونیورسٹی" میں شریک ہو گیا۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے
کہ میں نے وہ ڈگری بھی حاصل کر لی اور اب میں اس
فن کا ماہر مانا جاتا ہوں مگر دوستو! سچ عرض کرتا
ہوں کہ اس کے حصول میں مجکو جس قدر دیدہ ریزی
و دماغ پاشی کرنی پڑی ہے بس میرا ہی دل جانتا ہے
میاں علم کی یہ دلفریب اور صبر آزما دیوی بغیر قربانی
کے ہاتھ نہیں لگتی۔ سنئے سب سے اول تو مجکو اپنی
عزیز ترین شئے یعنی بصارت اس کی بھینٹ
چڑھانی پڑی۔ لیکن اگر صرف یہی نذر کافی ہو جاتی تو

"Dust thou art—to dust returnest,"
Was not spoken of the soul.

Not enjoyment, and not sorrow,
Is our destined end or way;
But to act, that each to-morrow
Finds us farther than to-day.

Art is long, and Time is fleeting,
And our hearts though stout and brave
Still, like muffled drums, are beating.
Funeral marches to the grave.

پیوند خاک ہوگا کہ ہے خاک سے بنا
بے شبہ ہوگا قالب خاکی ترا فنا
پر روح ہے وہ شئے کہ نہیں جس کی ابتدا
ہے ابتدا ازل تو ابد اس کی انتہا
زینت پہ اس چمن کی نہ اترا تو زینہار
بن کر بگڑ گیا ہے یہ جوبن ہزار بار
محو عمل ہو ایکٹ سب رنج و انبساط!
پژمردہ تجھ کو کردے ہے کیا رنج کی بساط!
رنج و خوشی نہیں ہے تو پھر کیا ہے اور کچھ؟
ہاں رنج و انبساط سے اعلیٰ ہے اور کچھ!
اس طرح گامزن ہو کہ بڑھتا سدا رہے
دی شب سے آج - آج سے فردا سوا رہے
دعویٰ ہنر کا یہ ہے کہ مشکل ہے سیکھنا
اور وقت کہہ رہا ہے کہ "لے دیکھ میں چلا"
اور اس پہ طرہ یہ ہے کہ شل ہو رہا ہے دل
اک طبل الرحیل ہے سینہ میں کیا ہے دل
کہتا زبان حال سے اپنی ہے برملا
"یہ ہے صدائے کوچ جنازہ ترا چلا"
گر مرد ہے تو کرلے نبرد آزمائیاں
موقع ہے آج کل تیری ہونگی نہ ہڈیاں

دنیا مصاف ہستی ہے دن بھر کارزار

In the world's broad field of battle,
In the bivouac of Life,
Be not like dumb, driven cattle!
Be a hero in the strife!

اور رات ہے پڑاؤ کہ سستا لے ہوشیار
میدان جنگ میں ہو رہ ہو تو خیام میں
آرام سے ہو رات کو یا دن کو کام میں
انساں نہیں جو بن کے یہاں بے خرد رہے

وہ کام کر کہ نام ترا تا ابد رہے
اس معرکے سے تو نہ مثال غبار اٹھ
اٹھتا ہے گر تو بن کے کوئی شہسوار اٹھ
شانہ کشی گیسوئے فردا کا کیا خیال
تاریکی عدم میں جو ہے اس کا کیا ملال؟

Trust no Future, howe'er pleasant!
Let the dead Past bury its dead!
Act—act in the living Present!
Heart within, and God o'erhead!

دیروز کے تعلق سے ترا دل ہے کیوں بھرا
کیوں دردِ سر ترا ہے گزشتہ کا ماجرا؟
امروز کے ہے آئینہ پر تیری دسترس
صیقل کر اس طرح کہ نہ باقی رہے ہوس

ہمت ہو دل میں اور بھروسہ خدا پہ ہو
کشتی کو آسرا نہ کسی ناخدا پہ ہو
وہ شہرت مدام کے ساحل سے ہمکنار
کہتے ہیں تجھ سے اہل وطن چیخ سی پکار

Lives of great men all remind us
We can make our lives sublime,

"دنیا کی کشمکش سے ہو دمساز زندگی"
"بس کی ہے بات تیری ہو ممتاز زندگی"

And, departing, leave behind us
Footprints on the sands of Time;

"جب بادبانِ نفس کا ہو خاموشی آشنا"
"جب کشتیٔ حیات کی ہو موت ناخدا"
"فردائے دہر میں بھی ترا کیف کم رہے
ریگِ روانِ وقت پہ نقشِ قدم رہے"
شاید کہ تیرا نقشِ قدم رہنما بنے
اُس تیرہ بخت کے لئے جس پر کچھ آ بنے

Footprints that perhaps another,
Sailing o'er Life's solemn main,
A forlorn and shipwrecked brother,
Seeing, shall take heart again.

جو لطمۂ ہراس میں لنگر گسستہ ہو
اس بحرِ بے کنار میں کشتی شکستہ ہو
سرگشتۂ تلاطمِ امواجِ زندگی
جوئندۂ ترقیِ معراجِ زندگی
تاریک شب کو صبحِ طرب سے اسے دے بدل
اکھڑے جو سانس وہ دمِ عیسیٰ سی دے بدل
تو خواب کے خیال میں بیٹھا ہوا ہے کیا
بس اُٹھ کھڑا ہو مانگنے سے مدعا ہے کیا

Let us, then, be up and doing,
With a heart for any fate.
Still achieving, still pursuing,
Learn to labour and to wait.

LONGFELLOW.

دشتِ عمل میں آبلہ پائی ہمیں دکھا
ہستی کے خارزار کو گلزار تو بنا
لغزش بس اب نہ تیرے قدم میں ذرا رہے
ہموار جستجو ہو تگاپو سدا رہے
راہِ طلب میں آگ پہ چل اور ہوا پہ چل
محنت کر اور رکھ تو بھروسہ خدا پہ چل

دُکھیا

از جناب میاں ایم اسلم صاحب لاہور

گیہوں پک چکے تھے اور کسان فصل کاٹنے کی تیاریوں میں تھے

آج بیساکھی تھی اور گاؤں والے "بیساکھی نہانے" ندی کی جانب جا رہے تھے۔ رُوپا گھر میں خاموش بیٹھی سامنے سے گذرنے والوں کو دیکھ رہی تھی۔ پاس ہی اس کی سال خوردہ ماں کھاٹ پر پڑی اپنے کرموں کو رو رہی تھی۔

"اے رُوپا" کسی نے دروازے پر آکر آواز دی "اشنان کرنے نہ چلوگی ؟"

"راما کی آواز ہے" بڑھیا بیٹھے بیٹھے بولی۔

ساتھ ہی ایک نوجوان لڑکی اندر آئی۔ یہ راما تھی جو رُوپا کی سہیلی بھی تھی اور پڑوسن بھی۔ راما رنگدار کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ رُوپا نے اس کی طرف ایک نظر دیکھا اور پھر سر جھکالیا۔ اس کی آنکھوں سے خود بخود آنسو گرنے لگے۔

راما۔ سہیلی کو مغموم دیکھ کر اس کے پاس ہی بیٹھ گئی اور پوچھا:-

"رُوتی کیوں ہو؟"

یہ سُن کر رُوپا نے پھر ایک بار کچھ اس حسرت کے انداز سے اپنی سہیلی کی طرف دیکھا کہ اب راما نے آنکھیں جھکالیں۔ دونوں خاموش بیٹھی تھیں۔ بڑھیا بولی۔

"راما! بیساکھی نہا آئی ؟"

راما بولی:-

"میں تو رُوپا سنگ جاؤں گی" اور پھر رُوپا کا ہاتھ پکڑ کر "لو اٹھو نا۔ دھوپ چڑھتی ہے۔"

"راما!" بڑھیا بولی "تم رُوپا ساتھ جاؤ گی۔ تمھارے گھر والے برا نہ مانیں گے ؟"

ماں! راما نے جواب دیا۔ "وہ کیوں برا ماننے

لگے"۔ اور پھر روپا سے "لو اب اٹھو بھی چلو نا"۔

"جاؤ بیٹی جاؤ"۔ بڑھیا نے بھی ایک آہ بھر کر کہا۔

"اے بھگوان!" کہتے ہوئے روپا اٹھی اور دونوں نے ندی کی راہ لی۔

روپا کی شادی کو دو سال گذر چکے تھے اور سہاگ چھوٹے دو مہینے۔ اٹھارہ انیس سال کی عمر میں رانڈ ہو جانا قہر الٰہی نہیں تو اور کیا ہے۔

اسے وہ دن خوب یاد تھا جب گئے برس وہ اپنے شوہر کے ساتھ بیساکھی نہانے ندی پر گئی تھی۔ اس روز وہ دلہن بنی ہوئی تھی۔ اور سینہ ابھارے قدم ٹھمکاتی ہوئے شوہر کے پیچھے پیچھے چلتی تھی۔ اس کی پازیب کی جھنکار فتنۂ محشر سے کم نہ تھی لیکن آج رفیق زندگی سے چھوٹے پورے دو مہینے ہو چکے تھے۔ آج وہ بیوہ تھی بدنصیب تھی۔ اور دکھیا۔ دنیا میں بوڑھی ماں کے سوا اور کوئی نہ تھا اور بڑھیا بھی قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔

راما اور روپا میں بہت پیار تھا۔ اور راما کو روپا کے دکھ کا احساس بھی بہت تھا۔ وہ گھر کے دھندوں سے فارغ ہو کر چرخہ لے کر روپا کے پاس آ بیٹھتی سوت کاتتی جاتی اور روپا کے ساتھ مل کر گاتی جاتی۔ کبھی راما چپ رہتی تو روپا اکیلے ہی گاتی۔ اور جب شوہر کی یاد میں اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگتے تو راما بھی رونے لگ جاتی۔ وہی گھر جو کبھی اس کے لئے راحتوں اور مسرتوں کا گہوارہ تھا اب کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔ اس بدنصیب کی راحت اور سکھ کا زمانہ ایسے گذر گیا جیسے ہوا کا جھونکا۔ روپا کے سامنے اب ایک ایسی زندگی تھی جو موت سے بدتر تھی۔ وہ نہ تو کسی کے سامنے کھل کر رو سکتی تھی۔ نہ کسی سے دکھ درد کی بات کہہ سکتی تھی۔ خدا کی ذات تھی پالے دے کے ایک راما تھی جو سگی بہنوں سے زیادہ محبت کرتی اور طرح طرح سے اس کا دل بہلاتی

ندی پر آج خاصہ میلا تھا۔ کوئی حال مست کوئی مال مست۔ سبھی قسم کے لوگ تھے جب راما اور روپا گھاٹ پر گئیں تو اکثر نوجوان لڑکیاں روپا کی طرف نفرت کی نگاہوں سے دیکھتیں۔ روپا ندی میں اتری دو چار اشلوک جو یاد تھے پڑھے۔ سورج دیوتا کو پانی دیا اور ندی سے نکل آئی۔ جب دونوں گھر کو لوٹیں تو راما بولی

"اے روپا تمھارے کھیت بھی تو پک گئے"

روپا بولی:-

"ہاں پک تو گئے لیکن ...."

"لیکن کیا؟ روپا! کچھ کہو تو"۔

روپا آب دیدہ ہو کر بولی
"کھیت تو پک گئے راما۔ اب کاٹے گا کون؟"
یہ سن کر راما نے ایک آہ بھری اور خاموش ہو گئی۔



گاؤں سے ملحق ہی جوہڑ کے کنارے نیم کا ایک بہت گنجان پیڑ تھا۔ یہاں چند چھوکریاں

پیا میں سنگ تورے جمنا کو جاؤنگی

میٹھے میٹھے سروں میں ڈھولک کے ساتھ گا رہی تھیں۔ راما اور روپا کھڑی ہو کر سننے لگیں۔ غریب روپا کی

وہ چلتی جاتی تھی گاتی جاتی تھی اور آنچل سے آنسو
پونچھتی جاتی تھی۔ اسی طرح وہ کھیتوں میں پہنچ گئی اور
اور برگد کے نیچے جا بیٹھی۔ اور گاہے گاہے بڑی حسرت
کے انداز سے ادھر ادھر دیکھنے لگتی۔ جیسے کوئی کسی کو ڈھونڈتا
ہو۔ روپا اسی طرح خاموش بیٹھی اپنی قسمت پر آنسو
بہا رہی تھی مگر اچانک طوطوں کا وہی جوڑا کسی جانب سے
اڑتا ہوا آگیا۔ نر اور مادہ دونوں ایک شاخ پر بیٹھ گئے
اور گردنیں جھکا جھکا کر روپا کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ دیکھتے
بھی تھے اور اپنی زبان میں کچھ کہے بھی جاتے تھے۔

روپا نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ اس وقت
دونوں محوِ اختلاط تھے نوجوان بیوہ کے دل پر ایک
چرکا سا لگا۔ اور اس کی آنکھوں سے ساون بھادوں
کی سی جھڑی لگ گئی۔ وہ اپنے پیا کی یاد میں۔ اس
پیا کی یاد میں جو بہت لانبے سفر کو گئے تھے خوب پھوٹ
پھوٹ کر روئی۔ اچانک اسے پیچھے سے کسی کے آنے
کی آہٹ سنائی دی دوپٹہ سے آنسو پونچھتے ہوئے پلٹ کر
جو دیکھا تو راما کھڑی تھی۔

"روپا اس طرح تو تم اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالوگی"

روپا پھر رونے لگی۔ راما کی آنکھوں سے بھی آنسو
گرنے لگے۔

"روتی کیوں ہو بہنیا؟" راما نے خود روتے ہوئے
پوچھا۔

"سکھی!" روپا بولی۔ "روؤں نہیں"۔ پھر کھیتوں
کی طرف اشارہ کر کے۔

"وہ بونے والے کہاں گئے؟"

"راما اس کے پاس بیٹھ گئی۔ کچھ دیر اسے تسلی دیتی
رہی پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ "چلو اٹھو! میں تمھارا
ہاتھ بٹاؤنگی"۔

اب دونوں اٹھ کر گیہوں کاٹنے لگیں۔ کبھی باتیں
کرنے لگیں گاہے گانے لگیں۔ کچھ دیر بعد راما اٹھی
اور کمر پر ہاتھ رکھ کر ایک انگڑائی لے کر بولی۔

"روپا میں روٹی لینے جاتی ہوں۔ چلوگی؟"

روپا سر ہلا کر بولی۔

"میں کس کی روٹی لینے جاؤں؟"

"ہائے دکھیا!" راما ایک آہ بھر کر بولی۔ "یوں کیسے
کٹے گی؟"

"بھگوان کاٹ دیں گے"۔

راما کے جانے کے بعد روپا بھی تھک کر برگد کے
نیچے آ بیٹھی۔ اور جو روکھی سوکھی ساتھ لائی تھی وہی کھانے
لگی۔ طوطوں کا جوڑا پھر نیچے اتر آیا۔ اب روپا کو دانے
نکال کر ان کو کھلانے لگی۔ اور بے زبانوں سے دل بہلانے لگی۔

اسی حالت میں نظر اٹھا کر جو دیکھا تو اکثر عورتیں سروں پر روٹی اٹھائے کھیتوں کی جانب آ رہی تھیں یہ سماں دیکھ کر اس بدنصیب نے خیال کیا کہ جن کے لئے روٹی آ رہی ہے وہ کس اشتیاق سے ان کی راہ دیکھ رہے ہوں گے کبھی اس کی بھی کوئی راہ دیکھا کرتا تھا۔ اس خیال سے اس کے قلب مضطر پر پھر بجلی سی کوند گئی۔ اور رنج و غم کی بدلیاں ہجوم کر آئیں اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ بوندیں گرنے لگیں۔ لیکن روپا بہت رو چکی تھی۔ سر میں شدت کا درد تھا۔ آہیں بھرتی ہوئی اور



سجن کو یاد کرتی ہوئی برگد کی چھاؤں میں لیٹ پڑ گئی اور کلائی پر سر رکھ کر سو گئی۔

راما گھر سے لوٹتے ہوئے روپا کے لئے بھی روٹی لے آئی تھی۔ جب وہ اس کے کھیتوں میں پہنچی تو روپا دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑی سوتی تھی۔ چہرے پر دھوپ پڑ رہی تھی۔ راما کچھ دیر اس کے پاس کھڑی رہی اور پھر برگد سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گئی۔ اس طرح بیٹھے بیٹھے اسے بھی اونگھ ہی آگئی۔ اچانک منہ پر پانی کے دو ایک قطرے پڑنے سے

اس کی آنکھ کھل گئی اور وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

اوپر جو نگاہ کی تو وہی طوطوں کا ایک جوڑا ایک شاخ پر بیٹھا تھا۔ ان کے پر بھیگے بھیگے نظر آرہے تھے۔ دونوں سورج کے رُخ پر اس طرح پر پھیلائے بیٹھے تھے کہ روپا کے چہرے پر ہلکا سا سایہ ہو رہا تھا۔ یوں ہی بیٹھے بیٹھے جو ذرا پروں کو ہلا دیتے تو سونے والی کے چہرے پر پانی کی ہلکی ہلکی خوشگوار بوندیں پڑنے لگتیں۔

رآما بڑے تعجب سے کچھ دیر یہ نظارہ دیکھتی رہی پھر دونوں ہاتھ جوڑکر اور آسمان کی طرف دیکھ کر بولی۔

"اے بھگوان! سچ ہی جس کا کوئی نہ ہو اس کا تو ہے"

ہمجولی نہیں بھیجا جاسکتا!

جو حضرات ہمجولی کے سابقہ پرچے قیمتاً طلب کر رہے ہیں افسوس ہے کہ اب ان کی تعمیل نہیں کی جا سکتی۔ سب پرچے تقریباً ختم ہوچکے ہیں "سالگرہ ہمایونی نمبر" قیمتی ایک روپیہ اب پانچ روپیہ میں ملے گا۔ نئے مستقل خریدار بھی از راہ کرم سابقہ پرچوں کا مطالبہ نہ فرمائیں اور وی پی کے ساتھ جتنے پرچے بھی بھیجے جائیں انہیں غنیمت سمجھیں۔ ہمجولی کی ہر دلعزیزی حیرتناک ہے! پوسٹ مین حضرات کی خدمت میں ادباً گذارش ہے کہ دو چار پرچے اڑانے سے نہ خود ان کے پاس ہمجولی کا فائیل مکمل رہے گا اور نہ خریدار حضرات کے پاس لہذا جو پرچہ وہ ہڑپ کرنا چاہیں تو بے تکلف ہم سے مفت طلب فرمالیا کریں اور اس کا ذمہ لیا جاتا ہے کہ انشاء اللہ سوائے متعلقہ پوسٹ ماسٹر جنرل یا ناظم صاحب ڈاک کے اور کسی کو کانوں کان (خبر نہ ہوگی)

منیجر ہمجولی حیدرآباد دکن

معیارِ داخلۂ جامعات

از جناب مرزا محی الدین بیگ بی۔ اے۔

زمانہ بدلا، ذہنیت میں فرق آگیا، اپنی اپنی وضع کی جدت طرازیاں شروع ہوگئیں۔ دور ہی کایا پلٹ تھا، ہندوستانی قسمتوں نے بھی پلٹا کھایا پرانی روشیں جدید خیالات کے تحت آراستہ ہونے لگیں نیا ماحول پیدا ہوگیا۔

میدانِ کارزار میں کبھی تلواریں کھنچا کرتی تھیں، اب زبانیں چلتی ہیں۔ دشمن کو نیچا دکھانے کے لئے زورِ بازو کی ضرورت تھی، اب صرف قوتِ دماغی کا خرچ ہے۔ مقدمۃ الجیش میں جوانمرد دادِ سپاہ گری حاصل کرتے تھے اب عورتیں تسخیر پر تلی نظر آتی ہیں۔ فتح کا راز کبھی نقصانِ اعدا میں پنہاں ہوگا اب تو اس میں ہے کہ "مٹ جاؤ، ہاتھ نہ اٹھاؤ" خدمتِ مذہب کا طریقہ اشاعت و تلقین نہیں، خاموشی و خود فراموشی ہے۔ اب نماز وظیفہ، پوجا پاٹ ہے تو پولیسی کے مدنظر، روزے اور برت کا جواز ہے تو ڈاکٹر کی تجویز کے تحت۔

یہ ہی ہماری تبدیلی، یہ ہے ہماری سیاسی ترقی کا رنگ، جس کے سحرکن تاثرات نے "علمی جدوجہد اور تعلیماتی کاوشوں کو مدھم کر رکھا ہے۔ مگر یہ اسلئے نہیں ہے کہ موجودہ رہبرانِ قوم "قومیت" اور "قومی فلاح و بہبود" کے لئے تعلیم کی اہمیت کچھ کم سمجھتے ہیں بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ ان مایہ ناز ہستیوں میں سے ہر ایک موجودہ طریقۂ تعلیم کی بے مائگی کا معترف ہے اور اس میں انقلابی تبدیلیاں کرنا، انسان کا فرضِ اولین تصور کرتا ہے۔ لیکن کیا کیا جائے سیاسی محویت اسطرف

کافی طور پر متوجہ ہونے کی اجازت ہی نہیں دیتی، یہ
کیا کم ہے کہ انھوں نے کھینچ تان کر کہیں سے وقت
نکالا اور جدید جامعات کے ڈھانچے کھڑے کر دئے
تکمیل کی امید ارباب حل و عقد سے باندھی اور پھر پھر
بھول سے گئے نتیجہ کیا ہوا؟ ڈگریوں کی بوچھار ہوئی
ناامیدوں نے فائدہ اٹھایا، نام نہاد "تعلیم یافتہ
طبقے" میں توسیع ہوئی غرض یہ کہ ہر طرف "تعلیمیافتہ"
اور "سندیافتہ" بیکاروں کا ہجوم و اژدحام ہے۔ یہ
کیوں؟ اس لئے کہ ذمہ دار ہستیوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ
کلیات کے دروازے کھول دئے، بلا امتیاز داخلہ
تھا، لنگڑے لولے، جوان بوڑھے کسی کی روک تھام
نہ تھی، نائی قصائی کنجڑے بربھونجے غرض کہ کہتر و بہتر
دماغی کشمکش میں پڑ گئے۔ ادھر جامعات میں مختلف النوع
انسانوں کی بھرتی ہو رہی ہے سندوں پر سندیں
تقسیم ہوتی ہیں، اُدھر بازار میں تعلیمیافتہ بے روزگاروں
کی فراوانی ہے اسناد کا بھاؤ گرتے گرتے اب اس
نوبت کو پہنچا ہے کہ بس پنہاری ہی ان کی کچھ قدر
کرے تو کرے۔ تعلیمیافتہ اور سندیافتہ نونہالان قوم
در بدر ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں، کوئی ان سے
سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتا۔ غضب تو یہ ہے کہ تعلیم
پاکر وہ مزدوری کر کے پیٹ پالنے کے قابل بھی نہ رہے
والدین نے اپنا پیٹ کاٹ کر انھیں تعلیم دلائی
کیوں کہ انھیں تعلیم سے بہت کچھ امیدیں تھیں، خود
پیڑا نہ پہنا کہ بچوں کو کتابوں کی ضرورت ہے تکلیفیں
اٹھائیں کہ محنت کرنے والا اچھا کھائے پئے صاحبزادے
نے گھر کا سرمایہ صرف کر کے سند حاصل کی اور تلاش روزگار
میں نکلے تو گردش زمانہ نے تعلیم یافتہ کے لئے وہ سماں
کھینچا کہ اگر یہ کشتہ ہائے جامعات "خطائے بزرگاں
گرفتن خطا است" کی سنہری تعلیم کو ڈھکوسلہ تصور کرنے
لگیں تو در اصل کوئی تعجب کی بات نہیں۔

ان اہل "تعلیم یافتہ ہستیوں" سے اگر ملک کے
کسی فرقہ کو تقویت پہنچی تو وہ سیاسی جتھا ہے لیکن نتیجہ
وہی ہے جو بے اصول تکمیل کار کے انہماک کا ہوا کرتا ہے
یعنے زیان بے سود۔ اس طرح جو کھپ گئے سو کھپ گئے
جو باقی رہے وہ خودکشی کے گھاٹ کی تلاش میں ہیں
اخباروں میں کشتہ ہائے جامعات کی خاموشی کے
ساتھ ملک عدم کو سدھارنے کی اطلاعیں آتی رہتی ہیں
مگر ایسی خبروں کی تعداد ابھی اتنی بڑھی ہوئی نہیں ہے کہ
"رہبران قوم" کو چونکا دے۔ لیکن وہ دن دور نہیں
کہ اس طلب علم کی بدولت دنیا کی آبادی جو اب
ضرورت سے زیادہ بڑھی ہوئی ہے، بہت ہی گھٹ
جائے گی اور زندہ ہستیوں کی ترقی کے لئے بہت میدان

صاف ہو جائے گا۔ اگر یہ صحیح ہے کہ "ہر چہ آمد عمارتِ نو ساخت" تو خدا کرے کہ ایسا ہی ہو اور آئندہ تو میں اس دور کی غیر امتیازی تعلیم کے مضر اثرات سے سبق لیں اور تعلیم کو اتنی عمومیت حاصل نہ ہو لینے دیں کہ ہر کس و ناکس، مرد و نامرد کو تعلیمی خبط ہو جائے۔

ہمیں نہ سہی متمدن افراد کو اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہے اور وہ قوم کی فلاح و بہبود کی خاطر توقیرِ اسناد کی روک تھام کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ ایک اور صرف ایک ہندوستانی کی آواز اس بارے میں بلند ہوئی اور وہیں کی وہیں دب کر رہ گئی۔ اس جرات کا سہرا اچاریہ رے کے سر ہے جنھوں نے (معلوم نہیں کس دھن میں) کہا تھا کہ "اگر میں ڈکٹیٹر بنا دیا جاؤں تو فوراً تمام کالجوں کو بند کر کے چھٹیاں دیدوں!" یہ بھی ایک عقل کی بات جو کسی ہندوستانی لیڈر کی زبان سے صحیح جذبات کے تحت نکلی۔ مجھے کبھی ڈکٹیٹر بننے کا موقع ملے تو میں اچاریہ رے کے حقوق کو ہرگز نظر انداز نہ کروں گا۔

سمندر پار سے آنے والے اخبارات و رسائل میں مدت ہوئی کہ متعدد مضامین حصول معیار داخلۂ جامعات کے بارے میں میں نے پڑھے تھے جن کا لب لباب یہ ہے کہ قوم کی بقاء کا دار و مدار داخلۂ جامعات کی پابندیوں پر منحصر ہے، دورانِ جنگ کی فوجی بھرتی کی طرح جامعات میں نااہل بے جوڑ ہستیوں کی آؤ بھگت کرنا قرینِ مصلحت نہیں، مناسب تو یہ ہے کہ عوام پر جامعات کے دروازے بند کر دیئے جائیں۔ ان مضامین کی بلند آہنگی کے مدِ نظر مجھے خیال ہوا تھا کہ شاید ہندوستان بھی اس بانگِ درا سے جاگ اٹھے مگر میری امیدیں ہندی سند یافتہ ہستیوں کی امیدوں کی طرح بے بنیاد نظر آتی ہیں۔ میں نے اس زمانے میں "لندن اوپی نی ان" جیسے رسائل سے کچھ سطریں کاٹ لی تھیں ان میں سے جو اس وقت دستیاب ہوئیں ان کا ترجمہ ہندوستان کے بہی خواہوں کے سامنے پیش کرتا ہوں کہ شاید اب ہی وہ "قائل تقلید ہندی ہستیوں کو خواب تعلیمی سے جگانے میں میری امداد کریں اور ملک و قوم کی فلاح کی خاطر موجودہ نظام جامعات سے دست و گریباں والا رشتہ جوڑ لیں۔ ؎

حافظ وظیفہ تو دعا گفتن است و بس
در بند آں مباش کہ نشنید یا شنید

"[1] ـــــ یونیورسٹی

طلباء کے قواءِ دماغی کا امتحان لیا جائیگا

"یونیورسٹی کے اربابِ حل و عقد نے حال ہی میں

---

[1] نام تلف ہو گیا اور مجھے یاد نہیں (مرزا)

یہ تصفیہ کیا ہے کہ طلباء کو یونیورسٹی سے خارج کرنے
کی خاطر ان کے دماغوں کا مکمل طریقہ پر امتحان
کیا جائے۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ کون کون
طلباء جامعہ میں شریک رہنے کے قابل ہیں
ہر ایک طالب علم کے سر کی پیمائش "علم
تشریح الانسان" کے تحت کیجائے گی آئندہ
سے ایسے انڈر گریجویٹ کو تعلیم جاری رکھنے
کی اجازت نہ دیجائے گی جس کا دماغ اعلے
قسم کے بندر کے دماغ سے ڈیڑھ گنا زائد ہونا
ثابت نہ ہوجائے۔

" اس کے ساتھ ساتھ امتحان بصارت
کی مدد سے ایسے تمام طلباء جو اندھیرے میں
کم از کم بلی کی طرح نہ دیکھ سکتے ہوں رجسٹر کلیہ
سے خارج کردئیے جائیں گے..........

........ان طلباء سے جن کے کان چار انچ سے
بڑھے ہوئے ہوں درخواست کیجائے گی کہ وہ
فوراً کالج سے علحدگی اختیار کریں کیوں کہ
ڈر ہے کہیں وہ استادان کلیہ کی تقاریر
کا زائد از ضرورت حصہ نہ سن پائیں......"

یہ جدید اسکیم تھی جس پر اس جامعہ کے ارباب حل و عقد اور
فدایان علم و فن لوٹ تھے؛ وہ فخریہ دعویٰ کرتے تھے کہ
اس طریقۂ عمل سے ستر فی صد طلباء کا اخراج عمل میں آئیگا
بقیہ تیس فیصدی کے لئے بھی وہ نئے معیار آزمائش
کی جستجو میں منہمک نظر آتے تھے۔

مختلف جامعات میں مختلف النوع معیار داخلہ
زیر غور تھے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو:—

"یارمتھ انسٹیٹیوٹ کا معیار جسامت"

"یارمتھ کالج ـــــ بہ تعمیل فیصلۂ مجلس علوم
داخلۂ یارمتھ انسٹیٹیوٹ کے قدیم تحریری امتحان
کا طریقہ بالکلیہ مسدود کیا جاتا ہے۔ آئندہ صرف
معیار جسامت داخلۂ کلیۂ ہذا کے لئے مستعمل ہوگا
اور طلباء بلحاظ جسامت و وزن درسگاہ ہذا میں
شرکت حاصل کرسکیں گے........"

اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے، درسگاہ مذکور کے ایک
با اثر رکن نے تحریر کیا تھا:—

"ہم اس جدید طریق عمل پر نازاں ہیں۔
دبلے پتلے طلباء کے ہم قائل نہیں کیونکہ تجربہ
شاہد ہے کہ فربہ طلباء زیادہ وزن سہارتے
ہی نہیں بلکہ لے بھی خوب جاتے ہیں......
........یہاں اس کا اظہار بھی ضروری
ہے کہ ہمیں ہرگز ہرگز کسی قسم کے تعصب یا
کسی کی طرفداری سے لگاؤ نہیں ہے......

ہم مقر ہیں کہ طلبار کے وزن میں بوجہ کشش مرکزی فرق ہوتا ہے پس ہر ایک معزز جامعہ میں جسامت کے ساتھ ساتھ وزن کا لحاظ کیا جانا ضروری ہے .... ہم اسکے لئے بھی تیار ہیں کہ بشرط ضرورت طلبار کی اپنی ہڈیاں نکال دیں کہ وہ ہمارے معیار پر پورے اتر آئیں۔ ایک اصولی معیار پر کاربند ہونیکے علاوہ ہمیں غیر ضروری طلباء کو کلیہ سے دور رکھنے میں کامیابی حاصل ہوگی اور موخرالذکر وہ اہم مقصد ہے جسے کسی بڑے درسگاہ کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے ...."

یہ ہیں ایک ترقی کنان تعلیم گاہ کی جدت طرازیاں! وہ صرف خیالی گھوڑے ہی نہیں دوڑاتے بلکہ میدان عمل میں ان کی تگاپو ہمیشہ جاری رہتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ منزل مقصود پر کامیاب پہنچتے ہیں۔ یہ ہی نہیں کہ وہ داخلہ کی سختیوں پر ہی اکتفا کرکے بیٹھ رہیں۔ ہرگز نہیں۔ طلباء کے داخل ہو جانے کے بعد بھی وہ اسی قسم کے صحیح اور سائن ٹی فک جانچ پرتال کے طریقے طلباً کی ترقی کے قدم قدم استعمال کرتے رہتے ہیں کہ کہیں ان کا مقصد فوت نہ ہونے پائے اور بے کار طلباء کی زندگی کا کوئی بھی حصہ معاش تعلیم کے حصول میں ضائع نہ ہو جائے۔

سمندر پار تو تعلیمی جد و جہد نے یہ رنگ اختیار کر رکھا ہے اور ہندوستان میں موجودہ سیاسی ماحول جسکا ہم نے ابتدا میں ذکر کیا ہے اور اس کے جدت نواز تاثرات کے باوجود ہماری جامعات جدید سائنٹفک معیار داخلہ کی جستجو کی طرف متوجہ نہیں ہوتیں! ؎

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی بھی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنھیں تصویر بنا آتی ہے!

مونچھوں والوں کی نہیں۔ مونچھیں منڈے افراد کی ہمجولیاں بھی درسگاہ عالم میں کچھ کم گل افشانی نہیں کر رہی ہیں۔ مصلحتاً اسبارے میں صرف ایک خبر پر اکتفا کرتا ہوں:۔

"ویزلی گرلز کالج میں امتحان آزمائش ازدواج"
"ویزلی گرلز کالج ـــــــ پروفیسر میری جین گوتیت، صدر شعبۂ علم تشریح الطیور نے طالبات کالج کے لئے حال میں ایک سلسلۂ امتحان جاری کیا ہے جس سے لڑکیوں کی استعداد ازدواج کا بہ طریق احسن پتہ چلایا جاسکتا ہے۔ اس جدید امتحان کے لئے مختلف جماعتوں سے پچاس لڑکیاں منتخب کی گئیں اور انھیں یکے بعد دیگرے ایک ایسی روش پر

دوڑایا گیا جس کے ہر دو جانب قد آدم گنجان
جھاڑیاں تھیں اور اوپر بیلیوں کی چھت۔ یہہ
روش کوئی ۳۰ فٹ جاکر یک لخت ایک طرف
مڑ جاتی ہے۔ اس موڑ پر دونوں جانب دو
نوجوان خوبرو مرد پہلے ہی سے کھڑے کردئے
گئے تھے لیکن اس کی اطلاع لڑکیوں کو نہ تھی

....

.... اس طریق عمل سے یہ امتحان کرنا مقصود
تھا کہ ہر ایک لڑکی اچانک طور پر مرد کو دیکھتے
ہی کتنی بڑی چھلانگ مارے گی۔
"نتیجۂ امتحان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جانب
واری چھلانگ کا اوسط ساڑھے چھ انچ ہے
.... سب سے بڑی چھلانگ
سال اول کی ایک دیہاتی لڑکی کی تھی جسنے
چارفیٹ کی ذقند ماری..........
..... سال چہارم کی اکثر لڑکیوں میں کچھ
محسوس کن حرکت نظر نہ آئی۔ ان کو اس سال
ڈگری دیدی جائے گی..........
...... اس کا بیان کرنا تحصیل حاصل ہوگا کہ
طریقۂ عمل کی موجودگی میں قدیم طریقہ پر
ڈگریاں جاری کرنا بالکل بے سود اس لئے
ہے کہ قابلیت کے اظہار کے جدید صحیح
سائنٹفک اور کامیاب معیار نہایت
کثیر تعداد میں موجود ہیں۔"

میں اس سلسلہ کو یہاں ختم کر چکا تھا کہ چند کاغذات
اور دستیاب ہو گئے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ انکا
ترجمہ بھی ناظرین کرام کے روبرو پیش کردوں:۔

"مسدودی اسناد

"ہالیوارڈ یونیورسٹی ـــ ہالیوارڈ یونیورسٹی
کی کارپوریشن نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ
صادر فرمایا ہے کہ اس جامعہ میں طریقۂ
تقسیم اسناد قطعاً مسدود کردیا جائے۔
کارپوریشن کی رائے میں اسناد قدامت
پرستی کی وہ دلیل ہے جو جدید ماحول میں ہرگز
فروغ نہیں پاسکتی۔ دقیانوسی وضع کی سند
کے بجائے، کامیاب طلباء کو "جدول ترقی"
دیجایا کرے گی، جس سے معلوم ہوسکیگا کہ
جدول یافتہ شخص کس نوعیت کی تعلیمی
حیثیت رکھتا ہے اور اس کی عملی استعداد
کتنی ہے .... جدول ترقی"
میں وزن دماغ (اگر کچھ ہو) اور خونکہ داب
کے ساتھ ساتھ وسعت مکعب اور استعداد برقی

کی تفصیل بھی درج رہا کرے گی۔ اس نئی ایجاد
کا مدعا یہ ہے کہ جب طالب علم معیار مقررہ
سے گھٹ جانے یا بڑھ جانے کے بعد درسگاہ
سے خارج کیا جائے اور وہ تلاش روزگار میں
نکلے تو اُسے حکام مقتدر کے سامنے بیضرورت
گفت وشنید کی تکلیف گوارا کرنے کی حاجت
نہ ہو اور نہ صورت دکھانے کی "جذل ترقی"
اس طرح بہت سی دشواریوں کا سدِّ باب
کرے گی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

اب آپ ہی سونچیئے کہ یہ لوگ راہ ترقی پر گامزن ہیں
یا نہیں مثل مشہور ہے "ہمت کرے سو گھوڑا باندھے"
کوشش اپنی بساط کے موافق (بلکہ اس سے بھی بڑھکر)
یہ کرتے ہیں، مدد کرنے والا ہر وقت ہر جگہ موجود
ہے۔ بس بیڑا پار ہے۔ کامیابی ان کے قدموں
تلے نظر آتی ہے تو تعجب کیا ہے۔ جھلنگے میں پڑے
ماڑیوں کے خواب دیکھنے سے فائدہ؟ اربابِ حل و
عقد کو تیار کرنے کے لئے منانے پھسلانے کی کوئی
ضرورت نہیں بلکہ ان کے سامنے مسودات تجاویز
پیش کرنیکی ضرورت ہے تاکہ وہ رد و قدح کے بعد صحیح
معیار داخلہ جامعات تک پہنچ سکیں۔ کیا میری یہ اپیل
اہلِ دماغ اور اہلِ قلم اصحاب تک پہنچکر کچھ نئے پھول
کھلائے گی؟ دنیا بہ امید قائم، دیکھئے کیا ہوتا ہے
میں بھی اگر موقع ملا، تو انشاءاللہ پھر کبھی اس بارے
میں کچھ لکھوں گا، بشرطیکہ کوئی اور بھی میری طرح
موردِ ملامت (جو صحیح جدت کے ہمیشہ ساتھ ہے)
بننے کے لئے تیار ہو (مخفی مبادکہ اس کا یہ مطلب نہیں
کہ "ہمجولی" کو اب مضمون طلب کرنے کا حق پیدا
ہوگیا)۔

ہاں، اور لیجئے، ان انتخابات کا خاتمہ مناسب
معلوم ہوتا ہے کہ تکمیل حجت کے تحت ان جب یہ
قابلِ ستائش طریق آزمائش کی آخری اسٹیج پر ہی
کیا جانے۔ علمی کاوشیں، ریسرچ کے کاموں کے بعد
اکثر ختم ہو جاتی ہیں۔ پس جدید اصولی تعلیم کا عملی
رخ جو تحقیق وانکشاف سے متعلق ہے مندرجۂ ذیل
اقتباس کے ذریعہ پیش ہے ممکن ہے کہ یہ شمعِ
ہدایت کا کام دے جائے۔

"ایک گریجوئیٹ کا عزم بالجزم
"ٹوپکن یونیورسٹی ـــــ مسٹر اڈورڈ قتم شد
جو شعبۂ خوراکی کے گریجوئیٹ ہیں، اپنی ذات
پر ایک دلچسپ سلسلہ تجربات شروع کرنے
والے ہیں جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ جسم
انسانی کا کس حد تک غذا پر دار و مدار ہے

مسٹر قسم شد تین ماہ بلا ناشتہ گزار چکے اور اس دوران میں یہ اندازہ لگائیں گے کہ وہ خالی معدہ کا کس طرح رد عمل کر سکتے ہیں.......

.....دوسری سہ ماہی میں وہ دوپہر کا کھانا بھی ترک کر دیں گے اور اس زمانے میں ایک ایسی جدول تیار کریں گے جس سے ظاہر ہو سکے کہ ترک غذا کے زمانے میں انھیں بھوک نے کتنی کتنی تکلیف دی اور انھوں نے کس کس طرح ان تکالیف کو سہا.........

.....اس تجربہ کے مفاد کا ثبوت قاطع اس سلسلہ تحقیقات کی تیسری کڑی منزل گزرنے پر ظاہر ہوگا، جس کے دوران میں مسٹر قسم شد رات کے کھانے سے بے نیاز ہو کر اصل تعلق جسم وغذا کا پتہ چلائیں گے.........."

ان ہمت افزا اور قابل صد ہزار آفریں تجربات کے اختتام پر ٹوبکن یونیورسٹی، انھیں ضرور کوئی نہ کوئی ڈگری دیگی جو غالباً کاغذی نہ ہوگی بلکہ سنگ باسیں کی طرح پتھر پر کندہ کرائی جائے گی تاکہ ان کی یاد "نقش فی الحجر" رہے اور زمانہ اسے بہ آسانی نہ بھلا سکے نیز ان کے پاس ماندہ کے لئے ایک مدامی یادگار باقی رہ جائے۔ اہمیت تحقیقات اتنی صاف ہے کہ اسپر قلم فرسائی کرنا لا حاصل ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہندی افراد اس سبق آموز اطلاع سے کیا فائدہ اٹھاتے ہیں ؎

خیز و بپا زن کہ دریں کارگہ نکہت و رنگ
طائرے نیست کہ پرواز گران است او را

غازۂ حسن و دیسی کریم

سمدھن کا گڈا

تیسرا جواب

از محترمہ بیگم سیّد محمد علی
تحصیلدار سیرم

غرض ہم سے سمدھن نے منہ موڑ کے
برابر کے سمدھی کا دل توڑ کے
اور آپس کی کنیاں کو یوں چھوڑ کے
کہا بے بدل بس کنیا یہی ہے

چلو اس ذریعہ سے دولت سمیٹیں
امیروں کو پھانسیں مزے خوب لوٹیں
چُنی رکھی ہیں میز پر سب پلیٹیں
کہ اب تو ترقی کا زینہ یہی ہے

کئی اونچے سمدھی نے در کھٹ کھٹائے
کہیں رُقعے بھیجے کہیں سے منگائے
کئی جا پہ چڑھ دوڑیں خود بن بُلائے
کہ بیگمیں بڑھانے کا رستہ یہی ہے

شرافت کے ڈنکوں سے گردوں ہلائے
بہت جنگ دولہ سے رشتے لگائے
رئیسوں امیروں سے شجرے ملائے
شہنشاہ اعظم کا پوتہ یہی ہے

بڑی دور کی لائی سمدھن جو کوڑی
بشارت یہ دینے کو دولہ کو دوڑی
ہے زردار دولہن اگرچہ ہے کوڑھی
بڑے ڈھنگ کی بات بیٹا یہی ہے

کسر اتنی تھوڑی سی ہے آہیں جانی
کہ دولہن کی نانی تھی بس مہترانی
ہماری غرض تو ہے منصب اُڑانی
زمانہ کا اب تو رویّہ یہی ہے

خوشی مقطعہ کی تھی زباں اپنی ہاری
نہ دولاکھ کے مہر پر ہوں میں راضی
طلائی ہوں نتھ توڑے جوڑے ہوں بھاری
سرانجام کیسے ہو کھٹکا یہی ہے

سمجھ رکھا ہے اونچ نیچ ہم نے پیارے
کرایہ سے ملتے ہیں سامان سارے
دیا مہر کب ابا جاں نے تمھارے
تمامی زمانہ میں ہوتا یہی ہے

کہوں کیا کہ پھر واں سے کیا کیا ملیگا
کرن پھول نک لیس پازیب ٹیکا
مرصع جواہر سے سارا سراپا
لٹیں سمدھی مقصد ہمارا یہی ہے

تھی شادی کی دعوت بلا ناگہانی
بھتیجی کی شادی تھی جا کر چچانی
سلامی کی فکروں میں ڈوبیں چچانی
عزیزوں کی شادی میں جھگڑا یہی ہے

اڑی ہے برات آکے دولہن کے گھر پر
پریشاں براتی ہیں سارے سراسر
کھڑے سالے صاحب ہیں پہرہ پہ در پر
نہ دھنگانہ لاؤ تقاضہ یہی ہے

سروپا کی چوتھی میں کس کو خبر تھی
گڈھے کی ادھر صف گڑھی کی ادھر تھی
نہ اپنے پرائے پہ مطلق نظر تھی
نہ پٹنے پٹانے کا موقعہ یہی ہے

یہ سالے نے کی آکے باہر منادی
کہ سمدھن کی چٹیا کسی نے اڑا دی
تسلی یہ دیتیں ہیں دولہا کی دادی
نہ دستور چوتھی کا بیٹا یہی ہے

کیا خوب سمدھی نے گڑبڑ گھٹالہ
جہیز اور زیور تو وعدہ پہ ٹالا
وہ مقطعہ گیا لیکے ڈگری میں لالہ
ملا کچھ نہ آخر کو صدمہ یہی ہے

حماقت کی بس رہ گئی یہ نشانی
گھرانا جو بے عیب تھا علوی خانی
ہوی اوس میں آ شامل یک مہترانی
نہ لالچ کا اپنی نتیجہ یہی ہے

مصنوعی دودھ کے اقسام

اور اُن کے محلِ استعمال

ڈاکٹر سید عبدالرحمن ایم۔بی۔سی۔ایچ۔بی۔ڈی۔ٹی۔ایم۔اینڈ ایچ (اڈنبرا)

مصنوعی دودھ سے میری مراد وہ تمام پیٹنٹ غذائیں ہیں جو معمولی دودھ کے بجائے یا اس میں اضافہ کر کے بچے کو استعمال کرائی جاتی ہیں ان کی تعداد بیشمار ہے۔ ان میں سے بعض تو منجمد دودھ کی شکل میں ہوتی ہیں اور بعض مختلف اشیاء سے بنی ہوئی ہوتی ہیں۔ ایسی پیٹنٹ غذاؤں میں اول تو وٹیمن نہیں ہوتے۔ اور دوسرے یہ دودھ کے مماثل نہیں ہوتے اور ان کے ساتھ جو ہدایات ان کے استعمال کے واسطے لکھے ہوئے ملتے ہیں وہ عموماً غلط ہوتے ہیں ان پر عمل کرنے سے بجائے فائدے کے نقصان ہوتا ہے۔ پیٹنٹ غذائیں دو طریقوں پر تقسیم کیجاسکتی ہیں۔ (۱) ایسی غذائیں جو بجائے گائے کے دودھ کے استعمال کیجاتی ہیں۔ (۲) ایسی غذائیں جو گائے کے دودھ کیساتھ ملا کر استعمال کیجاتی ہیں۔

ان غذاؤں میں بعض میں آٹا ہوتا ہے اور بعض میں یہ آٹا شکر کی صورت میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ ان پیٹنٹ غذاؤں میں سے چند کے نام جو علی العموم استعمال کیئے جاتے ہیں درج ذیل ہیں:—

الف۔ ایسی غذائیں جو بجائے گائے کے دودھ کے استعمال کیجاتی ہیں۔

(۱) منجمد دودھ مثلاً نسل ملک (Nestle's Milk) یا ملک میڈ ملک (Milkmaid Milk) سوکھایا ہوا دودھ مثلاً گلاکسو (Glaxo)

(۲) سوکھایا ہوا دودھ جس میں آٹا مکمل طور سے شکر کی

صورت میں تبدیل کر دیا گیا ہو مثلاً النبری فوڈ ۱ اور ۲ (Allenbury Food No. 1 & 2.) ہارلکس مالٹڈ ملک (Horlick's Malted Milk)

(۳) سوکھایا ہوا دودھ جس میں آٹے کا صرف ایک حصہ شکر میں تبدیل کر دیا گیا ہو ۔ مثلاً کارنرکس سالوبل فوڈ (Carnriks Soluble Food) یا میلو فوڈ (Milo Food)

ب ۔ ایسی غذائیں جو گائے کے دودھ میں ملاکر پلائی جاتی ہیں ۔

(۱) جس میں آٹا مکمل طور سے تبدیل کر دیا گیا ہو مثلاً ملن فوڈ (Mellin's Food) ہاوس بےبی فوڈ ۱ (Hovis Baby Food No. 1.) ماسلے فوڈ (Moseley's Food)

(۲) جن میں کچھ حصہ آٹے کا شکر میں تبدیل کر دیا گیا ہو باقی بجنسہ ہو مثلاً النبری فوڈ ۳ (Allenbury Food No. 1 & 2.) بنجر فوڈ (Benger s Food) ساوری اور مورس فوڈ (Savory & Moore's Food)

(۳) جن میں آٹا بجنسہ ہو مثلاً رجن فوڈ (Ridge's Food) نیوز فوڈ (Neave's Food) فریم فوڈ (Frame Food) راببسکٹ (Robb's Biscuits)

عورت یا جانور کے دودھ میں آٹا بجنسہ موجود نہیں ہوتا ۔ بچے کا معدہ اس قابل نہیں ہوتا کہ آٹے کو ہضم کر سکے ۔ اس لئے تمام پیٹنٹ غذائیں جن میں کچھ بھی مقدار آٹے کی بجنسہ موجود ہو ابتدائی عمر میں مضر ہیں ۔ ہاں بچے کی عمر نو ۔ دس مہینے کی ہونے کے بعد ان کی قلیل مقدار دیجا سکتی ہے ۔ ایسی غذا بھی جن میں آٹا بجنسہ نہیں ہوتا بلکہ صرف شکر ہوتی ہے ہمیشہ مفید نہیں ہوتی ۔ اس کا مفید ہونا اس میں شکر کی مقدار پر منحصر ہے ۔ اکثر اوقات جب مصنوعی غذائیں ملاکر دودھ تیار کیا جاتا ہے تو اس میں شکر کی مقدار عورت کے دودھ کی بہ نسبت بہت زیادہ ہوتی ہے ملن فوڈ کی مثال ہی لے لیجئے ۔ یہ گائے کے دودھ کیساتھ ملاکر پلایا جاتا ہے ۔ اس میں آٹا بجنسہ مطلق نہیں ہوتا اور اس لحاظ سے بچوں کے لئے مفید ہے ۔ لیکن جو ہدایات اس کے طریق استعمال کے نسبت اس کے شیشہ کے ساتھ چھپے ہوئے ملتے ہیں ۔ اگر ان کے مطابق دودھ تیار کیا جائے تو اس میں شکر کی مقدار بہت زیادہ ہوجاتی ہے ۔ مثلاً چھ ماہ کے بچے کے واسطے یہ ہدایات ہوتے ہیں ۔

ملن فوڈ کی مقدار ۳½ چائے کے چمچے کے برابر ۔
دودھ کی مقدار ۷½ بڑی چمچہ کے برابر (۳¾ اونس)
پانی کی مقدار ۲½ " " (۱¼ ")

یہ مقدار بچے کو وقتیہ پلانے کے واسطے ہے۔ ڈاکٹر
اِسٹل صاحب نے تجربہ سے دریافت کیا کہ اسطرح تیار کردہ
دودھ میں شکر کی مقدار بارہ ۱۲ فیصد ہوتی ہے۔ جو بہت
زیادہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ملن فوڈ اگر بجا طور
سے استعمال کیا جائے تو بہت مفید چیز ہے۔ نہ صرف یہ
دودھ میں کاربوہیڈریٹ کی کمی کی تلافی کرتا ہے۔ بلکہ
ایک حد تک قبض کشا بھی ہے لیکن بجائے ۲½ چمچے کے ایک
چمچہ وقتیہ سے زیادہ نہیں استعمال کرانا چاہیے۔ اس سے
زیادہ مقدار میں استعمال کرانے سے سوء ہضمی کا اندیشہ
رہتا ہے۔

کاربوہیڈریٹ کی زیادتی سے خواہ وہ بشکل شکر
کے ہو یا آٹے کے ایک اور اندیشہ ہے جس کا خیال رکھنا
چاہیے۔ بعض اوقات بظاہر کاربوہیڈریٹ کی زیادتی
بچے کے موافق معلوم ہوتی ہے۔ بچے کا وزن بڑھتا جاتا
ہے۔ اور ہر لحاظ سے بچہ صحیح و تندرست معلوم ہوتا
ہے۔ لیکن چند ماہ کے بعد بچہ میں مرض رکٹس (Rickets)
کے علامات رونما ہونے لگتے ہیں۔ بعض وجوہات سے
جن کے متعلق ابھی تک کافی معلومات حاصل نہیں ہوئے
ہیں کاربوہیڈریٹ کی زیادتی سے رفتہ رفتہ مرض
رکٹس (Rickets) پیدا ہو جاتا ہے۔ دراصل یہ
مرض ایک وٹیمن کی غیر موجودگی سے پیدا ہوتا ہے جو
چربی میں پایا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر کاربو
ہیڈریٹ کی مقدار غذا میں بہت زیادہ ہو تو یہ
وٹیمن جسم میں کافی مقدار میں جذب نہیں ہو سکتا ہے۔
مرض رکٹس (Rickets) کی نسبت ایک اشاعت
میں ذکر ہو چکا ہے۔ آئندہ کسی موقع پر اس کا
تفصیل وار ذکر کیا جائے گا۔

منجمد دودھ

اس قسم کے پیٹنٹ غذاؤں میں چربی کی مقدار
کم ہوتی ہے۔ اس لئے ایسے بچوں کے واسطے جن کو
چربی اچھی طرح ہضم نہ ہو رہی ہو۔ چند روز تک ایسی
پیٹنٹ غذاؤں پر پرورش کرنا مفید ہوتا ہے۔
لیکن بہت زیادہ عرصے تک بچوں کی پرورش ایسی
غذاؤں پر نہیں کرنی چاہیے۔

آخر میں یہ ذکر کر دینا ضرور ہے کہ ہر پیٹنٹ غذا
کی ترکیب دوسرے سے مختلف ہوتی ہے انکے یہاں پر
بالتفصیل ذکر کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ مضمون کسیقدر
دقیق ہے اور بغیر فنی پیچیدگیوں میں جانے کے انکا تفصیل وار
ذکر کرنا ناممکن ہے۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ کسی پیٹنٹ غذا
کے استعمال سے پہلے کسی ڈاکٹر سے مشورہ لیا
جائے اور اس کے حسب ہدایات عمل
کیا جائے۔ فقط



(از مختر مسج ۔ نقوی صاحبہ)

بچہ کو بات کرنا آتے ہی اس کا پہلا فقرہ یہہ ہوتا ہے "دادی کہانی سناؤ"۔ دادی اس کہانی کی ابتدا یوں کرتی ہے ۔"کسی زمانے میں ایک شہزادہ تھا ۔ اس کا دوست وزیرزادہ ۔" مگر اس قصہ کی تمہید کو معلم کا درس "تین کو چار سے ضرب دینے سے بارہ ہوتے ہیں" ختم کر دیتا ہے ۔!!

لیکن حساب لڑکے کو متاثر و محظوظ کرنے میں ناکام و عبث ثابت ہوتا ہے' اس خشک و فرسودہ مضمون میں اس کا دل نہیں لگتا" اس لڑکے کو تو اس تخیل کی دھن ہے' اس شہزادہ کا خیال ہے' جس نے بھوت کو موت کے گھاٹ اتارا تھا ۔ اس کے خیرخواہ اس کو ناصحانہ طور پر گوشگذار کرتے جاتے ہیں" تین کو چار سے ضرب دینا ایک حقیقت ہے' ایک نظام عمل ہے' جس پر دنیا کا دارومدار ہے' لیکن اس شہزادہ کا قصہ صرف ایک خیال ہے' جس میں کوئی اصلیت نہیں!!

لیکن اس بچہ کا ذہن اس سرزمین کا گشت لگا رہا ہے' جس کا نام و نشان صفحۂ دنیا پر کہیں نہیں!! اور نہ حساب کے کسی ہندسہ کو پر پرواز تھے جو اس کے تخیل کو اس خیالی زمین کی سیر کرا تے !!

اس کے خیرخواہ تیوری چڑھا کر' سر ہلا کر کہتے "برباد ہو گیا! بالکل ستیاناس ہو گیا !! اب چھڑی ہی اس کا علاج ہے ۔" اس کی قصہ گو دادی معلم کے حساب کتاب کے آگے دم بخود ہو جاتی ہے لیکن اس کے ایک خاموش ہونے سے کیا ہوتا ہے ایک قصہ گو دوسرے کو اپنا قائم مقام کرتا جاتا ہے' چنانچہ قصوں کہانیوں کا ایک لاانتہا ہی سلسلہ قائم ہو جاتا

ہے، خیرخواہوں کا ناصحانہ طرز عمل بیکار و بے محل
ثابت ہوتا ہے ۔ ان کی نصیحت، ان کی فضیحت،
"یہ قصے کہانیاں تاریخ عالم میں کہیں نہیں، یہہ سراسر
جھوٹی و لغو ہیں ۔ ان کا سننا اور ان میں دلچسپی
لینا محض تضیع اوقات .... سب تحصیل لاحاصل ۔

بچہ کے ابتدائی مدارج تعلیم سے لیکر کالج کے
بام رفعت تک یہ کوششیں رہیں کہ اس کے دماغ کی
اصلاح ہو، لیکن اس کے قصہ کہانی کا ضبط بدستور
قائم رہا، اس تخیّل نے پتھر کی لکیر کی شکل اختیار کرلی
اس کا یہ فقرہ فروگذاشت ہوا ہے نہ ہوگا "مجھے
ایک کہانی سناؤ ۔"

نہ صرف ایام طفلی میں بلکہ زندگی کے ہر گام
پر انسان بے اصل چیزوں پر جان دیتا ہے، قصہ
کہانیاں اس کی حیات چند روزہ میں ایک دلچسپ
ہلچل ڈالتی ہیں، اس کی زندگی کا دارومدار صرف
تخیّل پر منحصر ہے !

تمام کائنات عالم میں، محلات شاہی سے
لیکر فقیروں کے کاشانوں تک قصہ کہانیوں کا
انبار رہتا ہے، نسل در نسل اس کا سلسلہ جاری رہتا
ہے انھیں سے قصہ کہانیوں کی کتابیں بن جاتی ہیں
واقعات عالم خود "آپ بیتی" کا اظہار ہوتے جاتے
ہیں ۔ جو جو واقعات ہم [illegible] پر ے دن
گزرتے ہیں یہ کبھی قصہ کہانیوں کے پیرایہ میں
ہمارے بزرگوں کے زبانی سنا کرتے تھے ۔ یا بعض
کتابوں کے مطالعہ سے جو واقعات ہم پڑھتے تھے
وہ آج ہم پر رونما ہو رہے ہیں ! ان ہی کی بعض
قصہ کہانیاں خود ایسی ہیں کہ آج کل ہم ان کے
ایک زندہ مثال موجود ہیں !!

ان خیرخواہوں نے جو اس کو قصہ سننے سے
باز رکھتے تھے، کبھی اس نکتہ پر غور نہیں کیا کہ قصہ
کہانیوں کا بنانا خود خالق کا دلچسپ مشغلہ ہے
اور تا ختم کائنات رہے گا ۔ جب تک تم اس کو
خداوند عالم کے دل سے نہ مٹاؤ گے، خود خالق
موجودات کو اس شغل سے باز رکھنے کی سعی نہ کرو گے
انسان کو بھی اس سے روک نہیں سکتے ۔ !!

مدتوں پہلے ۔ کارخانۂ قدرت میں عناصر کو
ترتیب دیا جاتا تھا ۔ اس وقت کائنات محض ایک
دھواں دار کرۂ ہوائی تھا ۔ پھر اس کے بعد
پتھروں اور دھاتوں کا دور آیا ۔ اگر تم اس وقت
خالق حقیقی کا مشاہدہ کرتے تو تم بخوبی اندازہ لگا سکتے
تھے کہ اس میں عہد طفلی کی خو بو موجود ہے، جو کچھ
اس نے اس وقت کیا وہ حقیقت پر مبنی تھا !!

ذی روح ۔۔ ب یہاں سے زندگانی کی تمہید
ہوتی ہے ۔ چیزیں عالم وجود میں آتی ہیں، نباتات
کی نشوونما کا آغاز ہوتا ہے، درختوں پر بہار آتی ہے،
حیوانات و پرندوں کا دور شروع ہوتا ہے ۔

کسی نے گھونسلہ بنایا، دوسرے تمام دنیا پر
چھا جاتے ہیں، ان کی نسل ترقی کرتی جاتی ہے تیسرے
ذی روح ہستیاں پانی کی سطح کے نیچے (زیر آب)
رقص کناں ہیں!

زندگی کے دور پر دور گذرتے جاتے ہیں ۔ پایان
کار صانع حقیقی نے تخلیق آدم کی بنا ڈالی ۔ اب تک
تو وہ ایک سائنٹسٹ تھا، ایک فلسفی تھا، ایک
معمار تھا، لیکن تخلیق آدم کے بعد وہ ایک "ادبی
مصور" ہوگیا! اس نے انسانی روح و انسانی
ہستی کا انکشاف قصہ کہانیوں پر منحصر کر دیا ۔ حیوان
و پرند سوائے اس کے کیا کرتے کہ کھائیں، پئیں، بسر
لیں، نسل بڑھائیں، اپنے بچوں کی نگہداشت
کریں ۔ اور مر جائیں! لیکن ۔ ان ل زندگی
کو تخیل کی وادیوں سے گذرنے کا انتظام کیا اس
کی حیات مستعار کا ہر لمحہ بے اصل و بے حقیقت قرار
دے کر ۔ حیات انسانی کو تہہ و بالا کرنے والے
جذبۂ "محبت" کو اجاگر کر دنیا میں ایک قیامت برپا
کر دیا، دو محبت کرنے والی ہستیوں کا تصادم کائنات
عالم میں قصہ کہانیوں کا انبار لگا دینا کافی و مستند
سمجھا گیا ۔ تنہائیوں میں انجمن آرائی، سوسائٹی میں
کبھی انتہائی دلچسپی کبھی سراسر بیگانگی، ذہنی کیفیات
کی معرکۃ الآرائی، خواہشات کی موجیں، نفرت کا
جذبہ ۔ غرض انسانی ہستی کو ان جذبات و محسوسات
کا ایک مرقع بنا دیا ۔

گردش نصیب تھی تو بنانا تھا جام مئی
انساں بنا کے کیوں میری مٹی خراب کی

تخلیق آدم سے قبل دنیا میں تخیل کا کہیں پتہ نہ تھا
جس طرح ندی صرف پانی کا ایک بہتا ہوا چشمہ
ہے، اسی طرح انسان قصہ کہانیوں کا ایک ابلتا
ہوا کنواں ہے!!

جب دو آدمی آپس میں دوچار ہوتے ہیں
پہلا سوال جو نوک زبان پر آتا ہے "کیا چیز ہے؟"
پھر اس کے بعد کیا ہوا؟ ۔ یہ سوال "اس کے بعد
کیا ہوا؟" ایک ایسا پیچیدار و عمیق جملہ ہے کہ سارے
عالم کو اپنی جال میں پھانس لیتا ہے ۔ اس کے
بعد کیا ہوا؟ اور پھر اس کے بعد کیا ہوا؟ ۔ یہ سلسلہ
لا متناہی قائم رہتا ہے، اور مخاطب کے منہ سے نکلے
ہوئے فقرے ایک کہانی کی شکل میں ڈھلتے جاتے ہیں